نگار

جلد ۱۹ فہرست مضامین ماہ جنوری سنہ ۱۹۳۱ء شمار (۱)

فراست التحریر

کے دو حصے ہیں۔ ایک وہ جو اُردو رسم الخط سے متعلق ہے اور دوسرا انگریزی طرز تحریر سے۔ اس ماہ میں صرف پہلا حصہ اُردو کے متعلق شائع کیا جاتا ہے۔ دوسرا حصہ جو انگریزی خط سے تعلق رکھتا ہے فروری کے نگار میں شائع ہوگا۔

یہ دونوں حصے یکجا کتابی صورت میں بھی مل سکیں گے۔ قیمت معہ محصول ایک روپیہ تجویز ہوئی ہے اور ۱۵ فروری کے بعد سے روانگی شروع ہوسکے گی۔

منیجر "نگار"

(جملہ حقوق بحق نگار بک ایجنسی محفوظ ہیں)

علم فراست التحریر

مرتبہ

سید یامین ہاشمی ایم اے، ایل ایل بی،

فہرست مضامین

علم فراست التحریر

(یعنی ایک شخص کی تحریر کو دیکھکر اُسکی سیرت اور اُسکے مستقبل پر حکم لگانیکا علم)

تمہید

ایک زمانہ وہ تھا جب انسان اور اُس کی زندگی کے تمام واقعات و حوادث اتفاقات پر محمول سمجھے جاتے تھے، لیکن صدہا سال کے تجربات و تحقیقات نے آخر یہ ثابت کر دیا کہ اس کے ظاہری و باطنی قویٰ سب مرتب و معین اصول پر قائم ہیں، اور جن میں تغیر و تبدل بھی انسانی قدرت سے باہر نہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس دریافت کے ساتھ ساتھ مصنوعی زندگی کا دور شروع ہوا جس نے انسان کے فطری قویٰ کو نئے رنگ میں پیش کرنے کی کوشش کی۔ اور ہماری یہ مصنوعی زندگی اگر کبھی فریب و کذب کو پوشیدہ رکھنے میں کامیاب ہوئی تو اس سے زیادہ اتفاقات ایسے بھی پیش آئے جب اوس نے باطن کو ظاہر سے مطابقت دینے کے لئے ہماری اخلاقی زندگی کو بہتر بنانیکی کامیاب کوشش کی۔ ہمیں اس سے بھی انکار نہیں کہ اس مصنوعی دور حیات نے قیاسی علوم کی تحقیق و دریافت میں صدہا حجابات پیدا کئے۔ لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ ان مشکلات کے ساتھ ساتھ ان علوم و فنون کی اہمیت روز افزوں ترقی پر نہیں۔

انسان پرتو "الٰہی" ہے۔ اوسکی کوشش بھی ہمیشہ یہی رہی کہ وہ خدا بن کر زندہ رہے۔ انسانی زندگی کی تاریخ شاہد ہے کہ وہ ہمیشہ اسی کوشش میں مصروف رہا، اوس کی یہ زندگی تین دوروں میں تقسیم کیجا سکتی ہے اور ہر دور اپنی خصوصیات کے لحاظ سے نمایاں اور ممتاز ہے۔

(۱) دور اول۔ یہ وہ دور تھا جب انسان نے اپنی جاہ و حشمت و دولت کے نشہ سے مدہوش ہو کر خدائی کا دعوےٰ کیا۔ اوس کی پشت پناہی کے لئے نہ مادی ترقیاں تھیں اور روحانی تول، چونکہ یہ زعم باطل جہالت پر مبنی تھا اس لئے اس کے تار و پود فوراً بکھر گئے۔ ہر فرعون کی سرکوبی کسی موسیٰ نے کر دی اور معاملہ وہیں کا وہیں ختم ہو گیا۔ مگر یہ جذبات بالکل فنا نہ ہو سکے۔ ادعائے الوہیت نے خدا سازی کی صورت اختیار کی اور ہر شخص نے اپنا خدا

علحدہ بنالیا۔ میں بت پرستی کی تاریخ پر جہاں تک غور کرسکا ہوں، اسی نتیجہ پر پہونچا کہ اس کی ابتدا انسان نے اس
وقت کی جب وہ خود کو خدا ثابت کرنے سے معذور و مجبور سمجھنے لگا۔ علمائے فن نے اس دور کو دور اوہام پرستی سے بھی موسوم
کیا ہے۔

دوسرا دور مذہبیت کا تھا اور اس میں انسان نے روحانی ترقیوں سے خدا بننے کی خواہش کی۔
گزشتہ تجربات نے اوسکو مجبوریوں سے واقف کردیا تھا، اس لئے گو اوس نے کبھی یہ دعوے نہیں کیا لیکن
اوسکی سعی تمام تر اسی طرف رہی، کبھی وہ کہتا کہ "ہمہ اوست" اور یہ کہکر وہ خود کو اوسکی ذات کا جزو قرار دینے کی
کوشش کرتا۔ اور کبھی "انا الحق"، "قم باذنی" سے اس خواہش کو بالاعلان بھی ظاہر کردیتا۔ مگر اوس کی خواہشات
کا یہ دور بھی دور اول کی طرح ناکامیاب رہا۔

تیسرا دور مادیت کا ہے، اور اس دور میں انسان اپنی مادی ترقیوں سے خدا بننے کی خواہش میں
مصروف ہے، وہ چاہتا ہے کہ اوسکی موت و حیات اوس کے اختیار میں ہو جائے، اوسکی خواہش ہے کہ وہ اپنے
سامان رزق پر حاوی ہو جائے۔ اوس کی تمنا ہے کہ وہ مصنوعی ابر سے پانی برسائے۔ الغرض اوسکی زندگی قانون
فطرت کے خلاف ایک جنگ ہو کر رہ گئی ہے۔ اوس کی ان کوششوں میں سب سے زیادہ اہم کوشش یہ ہے کہ وہ
غیب پر بھی حاوی ہونا چاہتا ہے، وہ ایسے آلے ایجاد کرچکا ہے جس سے وہ طوفان کی آمد کا پتہ چلا لیتا ہے، موسم کے
آئندہ تغیر و تبدل کا بھی اوس کو علم ہو جاتا ہے۔ اور وہ گرمی و زلزلہ کا حال بھی بہت پہلے سے جان لیتا ہے۔
یہ تو اوسکی واقفیت انسانی زندگی کے گرد و پیش سے تھی۔ اب انسان کی خود ذات کو لیجیے۔ نجوم
جفر و رمل سے وہ ہماری آئندہ زندگی کے تفصیلی واقعات بتاتا ہے، وہ ہماری زندگی کے آئندہ اہم واقعات کے
متعلق کامیاب پیشین گوئیاں کرتا ہے۔ علم قیافہ سے وہ ہمارے بشرہ کو دیکھکر ہمارے اخلاق کو بتاتا ہے، ہاتھوں
کی لکیریں اوسے ہماری گزشتہ و آئندہ زندگی کا پتہ دیتی ہیں۔ ہمارے سر کی ساخت سے وہ ہماری عقل و فہم
کا اندازہ کرتا ہے۔

اسی طرح اوسکی یہ کوشش بھی ہے کہ وہ ہماری تحریروں سے ہمارے خیالات و جذبات کا پتہ بتائے
اس خاص صنف میں انسان نے اب تک کوئی نمایاں ترقی نہیں کی ہے۔ اور یہ بھی دیگر قیاسی فنون کی طرح تحقیق کا
محتاج ہے، اسی طرح کے دیگر فنون کی طرح ایک فن یہ بھی ہے کہ انسانی تحریر دیکھکر اس کی سیرت پر حکم لگایا جائے
اور آج مغرب میں اس فن کے کاملین انسانی زندگی کی ترتیب و تدوین میں اچھا خاصہ حصہ لے رہے ہیں۔ میں نے
اس مضمون کی ترتیب میں متعدد مغربی مصنفین کی گرانقدر تصنیفات سے مدد لی ہے، لیکن چونکہ اردو اور مغربی
زبان کے خطوط میں نہ صرف صوری فرق ہے، بلکہ طرز تحریر بھی جدا ہے، اس لئے مجھے بیحد دقتوں کا سامنا

کرنا پڑا۔ اور کامل تین سال تک تجربہ کرنے کے بعد میں اسے رسالہ کی صورت میں پیش کر رہا ہوں۔

اس رسالہ میں جو تحریر یا دستخط ہیں، وہ اس معنی میں فرضی ہیں کہ ان سے کسی خاص شخص کو تعلق نہیں۔ یہ تحریر اور دستخط صرف علمی و تحقیقی اعتبار سے درج کئے گئے ہیں۔ کسی خاص شخص کی توہین و تذلیل کبھی اس کا مقصود نہیں۔ تحریروں میں تو اخفاء نام ممکن تھا، لیکن دستخطوں میں یہ صورت ناممکن تھی، اسلئے میں نے ان کو بالکل فرضی صورتوں میں پیش کیا، کسی شخص خاص سے نہ اس کو تعلق ہے اور نہ یہ دستخط جعل و فریب کے لئے بنائے گئے ہیں۔ اگر دستخط یا تحریر کسی شخص خاص سے ملتی ہوئی ہو تو مجھے امید ہے کہ وہ اسے میری بدنیتی پر محمول نہ فرمائیں گے۔

مقدمہ

"میں نہیں سمجھ سکتی کہ میں کیا کروں۔ گو مجھے آئے ہوئے ایک ماہ گزر گیا، لیکن تمہیں چھوڑ کر جانے کو دل نہیں چاہتا۔ اودھر بالڈو کے متعدد خطوط طلبی کے آچکے۔ اگر تم کہو تو علالت کا بہانہ لکھکر ہفتہ دو ہفتہ اور رہجاؤں پیارے روڈالف! تم نے مجھے اپنا کرلیا۔"

"مگر تمہاری علالت کی خبر سُن کر وہ فوراً چلا آئے گا۔ اور وہ تم کو بیمار نہ پاکر نہ صرف مشتبہ ہوگا بلکہ اوس وقت تم کو بجبر ساتھ لے جائے گا۔ اور بہت ممکن ہے کہ پھر وہ تم کو یہاں آنے کی کبھی اجازت نہ دے۔"

یہ گفتگو شہر وینس (ملک اطالیہ) کے ایک دورافتادہ قصبہ (میلان) کے معمولی پھوس کے مکان میں ہو رہی ہے شب کے بارہ بج چکے ہیں۔ سارا عالم سو رہا ہے۔ دنیا پر خاموشی طاری ہے۔ حسین **لوسیانا** کرسی پر بیٹھی ہوئی ہے اور اوسکے سامنے اوسکا چچازاد بھائی **روڈالف** آتش خانہ پر جھکا ہوا کوئلہ ڈال کر آگ کو مشتعل کر رہا ہے۔

لوسی۔ "تو اس کے یہ معنی ہیں کہ میں چلی جاؤں۔" یہ کہکر وہ رونے لگی۔ **روڈالف** نے اپنے ہاتھ کے کوئلے پھینکدیے اور فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔

روڈو۔ "نہیں میرا یہ مقصد نہیں کہ تم چلی جاؤ۔" یہ کہتے ہوئے اوس نے لوسی کو سینہ سے لگالیا اور پیشانی پر بوسہ دیا۔ "میں یہ چاہتا تھا کہ تم ضرور رہو لیکن اس طرح کہ بالڈو کو ہماری محبت کا شبہ نہ ہو۔"

لوسی۔ افسوس! روڈالف، افسوس!..................."

روڈو نے لوسی کو کرسی پر بٹھادیا اور خود سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔ کچھ سوچکر اوس نے اپنے سر کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا اور تھوڑی دیر تک خاموش بیٹھا رہا۔

لوسی۔ کیا تمھیں یقین ہے کہ بالڈو میری علالت کی خبر سُن کر مجھے لینے ضرور آئے گا۔

روڈو۔ میرا یہی خیال ہے...............

لوسی۔ اور وہ تنہا آئے گا۔

روڈو۔ ہاں........ کیا اوس وقت؟

یہ کہکر روڈالف کھڑا ہو گیا اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔ کبھی اوسکی نگاہ لوسی پر پڑتی اور کبھی وہ کمرے کی ہر سمت دیکھتا۔ تھوڑی دیر ٹہلنے کے بعد اوس نے شمعدان ہاتھ میں لے کر دروازہ کھولا اور باہر چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد واپس آیا۔

لوسی۔ تو پھر کیا رائے ہے..........." دونوں نے ایک دوسرے کو غور سے دیکھا۔

گفتگو خیالات کے اظہار کا عام طریقہ ہے۔ لیکن بقول شریڈین ایک بھدا طریقہ ہے۔ بعض حکماء کا خیال ہے کہ انسان کا موجودہ نطق کسبی ہے فطری نہیں۔ اگر ایک تعلیم یافتہ کوئی خیال بذریعہ گویائی ظاہر کرتا ہے تو وہ صاف ہوتا ہے اور جلد سمجھ میں آجاتا ہے لیکن وہی خیال اگر کوئی جاہل بذریعہ گویائی ظاہر کرنا چاہتا ہے تو وہ ناصاف ہوتا ہے اور اوسکے سمجھنے میں دقت ہوتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قوت کسبی ہے اور تربیت کی محتاج ہے۔ اب دوسرے طریقے اظہار کے ملاحظہ ہوں۔ آپ کو خوشی ہوتی ہے تو آپ ہنستے ہیں۔ آپ کو ملال ہوتا ہے تو آپ روتے ہیں۔ آپ خشمگیں ہوتے ہیں تو آپ کے ابرو پُرشکن ہوجاتے ہیں۔ آنکھیں سرخ ہوجاتی ہیں۔ آپکو شرم آتی ہے تو آنکھیں جھک جاتی ہیں۔ آپ ممنون ہوتے ہیں تو آپ کا چہرا تمتما اوٹھتا ہے اور آنکھوں میں خوشی کے آنسو بھرآتے ہیں۔ آپ کچھ مانگتے ہیں تو آپ کی آنکھیں ملتجی ہوتی ہیں۔ یہ ہے وہ خاموش ذریعہ اظہار خیال کا جسے فطرت نے ودیعت کیا ہے۔ اور یہ خاموش گفتگو ایک نگاہ میں اتنی باتیں کہہ جاتی ہے جو شاید آپ اپنی زبان سے گھنٹوں میں بھی بیان نہ کرسکیں۔ نہ لوسی نے کچھ کہا اور نہ روڈالف نے۔ دونوں خاموشی سے تھوڑی دیر تک ایک دوسرے کا منھ دیکھتے رہے۔ دونوں کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ خون آشام نگاہیں کسی زبردست سازش کا پتہ دیتی تھیں۔ دلی ممکن ہے کہ دلی کو نہ پہچانے لیکن میرا یہ خیال ہے کہ اخلاقی مجرم اپنے ہمخیال کو فوراً پہچان لیتا ہے۔ لوسی نے روڈالف کا اور روڈالف نے لوسی کا مطلب سمجھ لیا۔ لوسی دوڑ کر روڈو سے یہ کہتی ہوئی لپٹ گئی "بس روڈو۔ بس۔ میں تیرے لئے سب کچھ کرنیکو آمادہ ہوں"

تھوڑی دیر تک کمرہ میں خاموشی طاری تھی۔ دونوں ایک ہی خیال میں محو تھے۔ صرف اس فرق کے ساتھ کہ لوسی کے چہرہ سے اطمینان ظاہر تھا اور روڈو متفکر و پریشان۔ بالآخر اس سکوت کو روڈو نے توڑا۔

روڈو۔ تو پھر اسی وقت خط لکھدو تاکہ صبح کسی شخص کی معرفت بھیجدیا جائے۔

لوسی۔ خط تم لکھدو، دستخط میں کردوں گی۔ اس سے مری علالت بھی قابل یقین ہوجائے گا۔

روڈو اٹھا۔ میز پر بیٹھکر ایک خط لکھا اور دستخط کے لئے لوسی کے سامنے رکھ دیا۔

روڈو۔ خط پڑھ لو۔ صحیح ہے یا نہیں۔

لوسی۔ نہیں۔ میں خط نہیں پڑھوں گی۔ میں صرف دستخط کروں گی۔ یہ کہکر اوس نے روڈالف کے ہاتھ سے قلم لے لیا۔ اوسکا ہاتھ کانپنے لگا۔ دونوں نے ایکدوسرے کی طرف دیکھا۔

روڈو۔ ذرا دم لے لو۔ گھبراؤ نہیں۔

لوسی نے پھر لکھنا چاہا۔ اس مرتبہ بھی اوس کا ہاتھ کانپنے لگا۔ روڈو سے پانی منگا کر پینے کے بعد اوس نے سہ بارہ ہمت کی۔ اور گو اوس کا ہاتھ اب بھی مرتعش تھا لیکن اوس نے ہاتھ روک کر دستخط کر ہی دیئے۔

روڈور۔ (دستخط دیکھکر) مگر اس میں کسی قدر تموج ہے۔

لوسی۔ "یہ بھی میری علالت کی وجہ سے ہے" یہ کہکر لوسی مصنوعی ہنسی ہنسنے لگی۔

بالڈو خط پڑھ کر بیحد پریشان ہوا۔ اوسی لوسی سے بیحد محبت تھی۔ شادی کے بعد سے اس وقت تک اوس نے لوسی کو علیحدہ ہونے نہیں دیا تھا۔ میز پر خط رکھ کر بالڈو کمرہ میں ٹہلنے لگا۔ اوس نے دوبارہ پھر خط اوٹھا کر پڑھا۔ دستخط کو غور سے دیکھا اور دیر تک دیکھتا رہا۔

"ابھی دو روز ہوئے میرے پاس خط آیا تھا۔ دو روز میں اس درجہ ہاتھوں میں کمزوری نہیں آسکتی۔ مرض بھی معمولی۔ پھر یہ حروف میں تموج اور سانپ کی سی لہریں کیسی" بالڈو نے ہاتھ میں خط لے کر ٹہلنا شروع کیا۔ تھوڑی دیر کے بعد۔

کیا لوسی بیوفا نکل گئی؟ مگر پھر مجھے بلایا کیوں۔ کیا ...."

بالڈو پروفیسر تھا اور اس پیشہ کی ساری خصوصیات اوس میں موجود تھیں۔ وہ بہت کم چیزوں کو دلچسپی سے دیکھتا۔ لیکن جب کوئی شے اوسکی توجہ منعطف کرلیتی تو وہ پھر اوس پر عبور حاصل کرنے کی کوشش کرتا۔ لوسی کا دستخط اس وقت اوس کے پیش نظر تھا۔ خط کے متن میں اوس کو کوئی مشکوک صورت نظر نہ آتی۔ اس لئے کہ روڈالف کا خط دیکھنے کا وہ عادی نہ تھا۔ لیکن لوسی کے دستخط اوسے بیحد مشتبہ معلوم ہوئے۔ وہ پورے دو گھنٹہ تک کمرہ میں خط ہاتھ میں لئے ہوئے ٹہلتا رہا۔ وہ دستخط کو بار بار دیکھتا اور خاموش ہوجاتا۔

"نہیں۔ میں کبھی نہیں تسلیم کرسکتا کہ وہ بیمار ہے۔ لوسی بیوفا نکل گئی"

انسان جبتک کسی امر کی جانب بے توجہ رہتا ہے اوسوقت تک اہم امور بھی اوس کی توجہ منعطف کرنے سے معذور رہتے ہیں۔ لیکن جب وہ متوجہ ہوجاتا ہے تو اوس کے خیالات زنجیر کی باریک سی باریک کڑی سامنے لاکر پیش کردیتے ہیں اور اوس کو اپنی غفلت پر حیرت ہوتی ہے۔ اب بالڈو کی آنکھیں کھلیں۔ گذشتہ بار روڈو کے دوران قیام میں لوسی کے ساتھ اوسکی بے تکلفی۔ گھنٹوں دونوں کا خلوت میں باتیں کرنا۔ دونوں کا تنہا چراگاہ و باغ میں ٹہلنا۔ ایک بار دونوں کا ہم آغوش ہونا۔ روڈو کا لوسی کو ساتھ لیجانے کیلئے اصرار۔ لوسی کی جاتے وقت خوشی۔ جسوقت یہ واقعات پیش ہوتے رہے۔ اوس وقت بالڈو نے اُنھیں کوئی اہمیت نہ دی۔ لیکن آج یہ تسلسل ایک مستقل نتیجہ پیدا کرتا ہے۔

"نہیں میں نہیں جاؤں گا۔ دونوں مجھے مل کر مار ڈالیں گے۔" تھوڑی دیر ٹہلنے کے بعد۔" مگر آخر اون کے اس ارادہ کی تصدیق کیسے ہو؟"

بالڈو نے جانے کا ارادہ کرلیا مگر اوسوقت اوس نے لکھدیا کہ وہ نہیں آسکتا۔ تیسرے دن وہ مغالطہ دے کر پہونچا۔ دونوں کو شب میں مجرمانہ بے تکلفی میں مشغول پایا۔ روڈ نے خنجر سے حملہ کیا۔ بہ مشکل بالڈو اپنی جان بچا کر بھاگا۔

اس واقعہ کے بعد بالڈو نے یہ فن ایجاد کیا۔

اس فن کی تاریخ

انسان کا ہر فعل اوسکے اخلاق و ذہنیت کا روشن آئینہ ہے، اگر وہ تصنع یا مکر و فریب سے کام نہ لے تو اوسکی زندگی کا ہر پہلو اوس کے افعال و حرکات سے نمایاں ہوسکتا ہے اور اوس کے ہر عمل سے اوس کی تربیت ذہنی کا پتہ چل سکتا ہے۔ وہ اگر متین ہے تو اوس کے ہر فعل سے سنجیدگی نمایاں ہوگی۔ اگر وہ عجلت پسند ہے تو اوس کی ہر حرکت سے جلدی مترشح ہوگی۔ اگر وہ متکبر ہے تو اوس کا ہر انداز مغرورانہ ہوگا اور اگر وہ منکسر المزاج ہے تو اوسکے ہر طرز عمل سے فروتنی ظاہر ہوگی۔

جس طرح آپ ایک شخص سے گفتگو کرکے اوس کے اخلاق و اطوار کے متعلق رائے قائم کرلیتے ہیں۔ اسی طرح آپ تحریر سے بھی تحریر کنندہ کے خیالات و ذہنیت کا اندازہ کرسکتے ہیں۔ اس لئے کہ تحریر "لکھی ہوئی گفتگو" کا نام ہے۔ البتہ جس طرح گفتگو میں تصنع و ریا کو دخل ہے اوسی طرح تحریر بھی مصنوعی ہوسکتی ہے اور اس وقت بے شک آپ کے نتائج غلط ہوں گے۔ لیکن اگر تحریر کنندہ اپنی عادت و طرز کے مطابق لکھے تو یقیناً اوس کی تحریر اوس کی فطرت کا آئینہ ہوگی۔

کسی شخص کی تحریر سے اوسکے خیالات، اطوار، اخلاق اور ذہنیت کا پتہ چلانا ایک فن ہے۔ جسے سب سے پہلے سیوٹانیس (SUETONIUS) نے ایجاد کیا۔ شاہنشاہ آگسٹس کے متعلق وہ لکھتا ہے:-

"میں نے اوس کی تحریر میں یہ خاص بات دیکھی کہ وہ الفاظ کو جدا جدا نہیں لکھتا تھا۔ اور اگر آخر سطر میں جگہ نہیں بھی رہتی تب بھی وہ باقی الفاظ کو سطر کے نیچے لکھدیتا اور اونکے گرد ایک دائرہ کھینچدیتا"

گو سوٹانیس کے نتائج ہم تک نہیں پہونچے ہیں، لیکن خیال ہے کہ اوس نے ان علامات سے ضرور یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ شہنشاہ آگسٹس کے خیالات متحد و منظم تھے۔ اور اوسکی ذہنیت میں ایک قسم کا ربط تھا۔ اوسکی شجاع طبیعت مواقع کی منتظر نہ رہتی تھی بلکہ وہ خود اسکے مواقع پیدا کرلیتا تھا۔

آپ کو یہ سنکر تعجب ہوگا کہ سیوٹانیس کے بعد یہ فن مدتوں تک کس مپرسی کے عالم میں پڑا رہا۔ بالآخر ایک

اطالوی پروفیسر مسمی بالڈ و نے سنہ ۱۶۰۲ء میں اس فن پر ایک مبسوط کتاب لکھی۔ بالڈو کا خیال ہے کہ "چونکہ تحریر اک گونہ محرر کی فطرت کا آئینہ ہے۔ اس لئے اوس کے ذریعہ سے ہم اوس کے اخلاق کو دریافت کر سکتے ہیں"۔ اس کتاب نے ملک میں اک ہیجان سپیدا کر دیا، مختلف و متعدد لوگوں نے اس فن کا مطالعہ شروع کر دیا۔ یہانتک کہ سنہ ۱۶۴۲ء پٹرس ویلیس (PETRUS VELLIUS) نے بالڈو کی معرکۃ الآرا تصنیف کا لاطینی زبان میں ترجمہ کیا۔

گو ماہران فن کا خیال ہے کہ بالڈو ہی اس فن کا موجد ہے۔ لیکن اوسکی تصنیف سے قبل سرورینس (SERVERINUS) بھی اس فن پر ایک کتاب لکھنے میں مشغول تھا، مگر افسوس کہ اوسکی تصنیف اوسکی زندگی میں طبع نہ ہو سکی اور وہ سنہ ۱۶۵۶ میں انتقال کر گیا۔ ہمیں پٹرس کے ترجمہ کا ممنون ہونا چاہیئے کہ بالڈو کی تصنیف بھی ہم تک پہونچ گئی۔ کیونکہ اصلی کتاب جو اطالوی زبان میں تھی وہ ناپید ہے۔

اس کے بعد اس فن کا مطالعہ دو سو برس تک پھر معرض التوا میں رہا۔ یہانتک کہ سنہ ۱۸۷۵ء میں ایک فرانسیسی شخص ایبی میچن (ABHE MICHON) نامی نے بالڈو کے ترجمہ کا فرانسیسی زبان میں ترجمہ کیا۔ اس کے بعد تو تحقیق و مطالعہ کا دروازہ یورپ کے لئے کھل گیا۔

اہل جرمنی ایبی میچن کی کوششوں کے قائل تھے۔ اس لئے کہ اون کا خیال ہے کہ خود جرمنی میں گراہمین (GROHMAUN) نامی ایک عالم نے سنہ ۱۹ء میں انھیں نظریات کو پیش کیا تھا۔ اوس کا خیال ہے کہ:-

> "علم قیافہ اور فراست التحریر میں بے حد تعلق ہے۔ کیونکہ اس سے بھی انسان کی اندرونی کیفیات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ہم ایک شخص کی تحریر دیکھ کر یہ بھی بتا سکتے ہیں کہ اوس کے بالوں کا رنگ کیسا ہے، اوسکی آنکھیں کیسی ہیں۔ اوس کا رنگ سیاہ ہے، سانولا ہے یا گورا، اور اوس کا قد کیسا ہے، اور اوسکی جسمانی صحت کس حالت میں ہے؟"

گراہمین غالباً اپنے حدود سے متجاوز تھا۔ سنہ ۱۸۶۳ء میں ہنزی (HENZE) نامی ایک جرمن نے ایک نہایت مبسوط کتاب اس فن پر لکھی، لیکن اوسکی ضخامت اوس کی عدم مقبولیت کا سبب ہوئی۔

گیٹے اور لوئٹر کے خطوط اس فن پر کافی روشنی ڈالتے ہیں۔ موخرالذکر کا خیال ہے کہ ایک شخص کی تحریر اوسکے دماغی کیفیات کا آئینہ ہوتی ہے۔ لوئٹر کا یہ بھی خیال ہے کہ ہر قوم و ملک کا طرز تحریر مختلف ہوتا ہے۔

ہماری خوش قسمتی سے اڈگر الن پو (EDGAR ALLEN POE) نے اس فن پر متعدد مضامین شائع کئے۔ جن سے ہمیں بے حد مدد ملتی ہے۔ سنہ ۱۸۲۵ء میں ایک مستقل مدرسہ فرانس میں اس فن کی تعلیم

کے لئے قائم کیا گیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس وقت دنیا میں جتنی کتابیں اس فن پر فرانسیسی زبان میں ملتی ہیں اوتنی کسی زبان میں نہیں ملتیں۔

متعلم کو چند مفید ہدایات

اس فن کے جاننے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اس کتاب کے مطالعہ کے بعد جب اس کے عام اصول ذہن نشین ہو جائیں۔ تو آپ اپنی تحریر کو سامنے رکھئے اور دیکھیئے کہ آپ کے جذبات و خیالات وغیرہ کیونکر اوس میں منعکس ہیں۔ اس زینہ کو طے کرنے کے بعد آپ اب کسی ایسے شخص کی تحریر لیں۔ جسے آپ بخوبی جانتے ہیں۔ اوس کے خیالات و حالات کی روشنی میں آپ اوس کی تحریر ملاحظہ فرمائیں۔ اپنی تحریر کے مطالعہ کے بعد جو نتائج آپ اخذ کر چکے ہیں۔ اونکو اس تحریر سے مطابقت دیجئے۔ اس طرح جب آپ متعدد اشخاص کی تحریر دیکھ چکیں تب کسی اجنبی کی تحریر اوٹھایئے اور اپنے گذشتہ تجربات کی روشنی میں اوس کو دیکھیئے۔

یہ اون علوم میں نہیں ہے جو ہندسہ یا حساب کی طرح معین ہوں اور جن کے عام اصول سے خاص نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ علم فراست التحریر ایک قیاسی علم ہے اور اس کے اصول متعدد تحریروں کی مشترک خصوصیات کی روشنی میں مرتب ہوئے ہیں۔ ایسے علوم شخصی تجربات کو بہت زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ آپکا تجربہ خود آپ کی رہبری کرے گا۔ اور بعد چندے آپ اس میں مہارت تامہ حاصل کر سکتے ہیں۔

اگر آپ کی تحریر میں بزدلی کے علامات ہیں اور آپ میں یہ نقص نہیں ہے تو فوراً آپ اس کو فن کے نقص کی دلیل نہ سمجھیں۔ اگر آپ جسمانی جرات رکھتے ہیں، تو پھر بھی یہ سوال رہجاتا ہے کہ آیا آپ اخلاقی جرات کے بھی حامل ہیں یا نہیں۔ اگر آپ میں یہ بھی موجود ہے تو پھر آپ دیکھیں کہ آیا آپ میں اعتقادی جرات کی کمی تو نہیں۔ آپ کا تجربہ آپ کو بتا دے گا کہ نقائص و محاسن کے مختلف مدارج و اقسام ہوا کرتے ہیں۔

ابتدا میں آپ کے دوست اپنی تحریر دکھا کر ایسے سوالات پوچھیں گے۔ اگر اون میں نقائص ہیں تو آپ کہتے ہوئے رکیں گے۔ لیکن اگر آپ ایسا کریں تو یہ آپ کی اخلاقی کمزوری ہوگی۔ اگر آپ اپنے نتائج میں قطعی نہیں ہیں تب تو جواب بھی ایسا ہی ہونا چاہیئے۔ بلا ضرورت کسی کو خیالی تکلیف دینی معیوب ہے۔ اگر آپ ایک شخص کے نقائص اوس سے بیان کر رہے ہیں، تو آپ کا فرض ہے کہ ہر ممکن متانت اور نرمی سے آپ اوس کو تنبہ کریں۔ آپ کی حیثیت ایک حکیم کی ہے۔ آپ کی تلخ دوائیں مریض کو ضدی بنا کر ترک دوا پر نہ مجبور کر دیں۔

لوگ پوچھتے ہیں کہ کیا ہر شخص اس فن کو سیکھ سکتا ہے؟ قبل اس کے کہ میں اس کا جواب دوں۔ مجھے ایک لطیفہ یاد آ گیا۔ ایک طبیب اپنے شاگرد کے ساتھ کسی مریض کو دیکھنے گئے۔ سرہانے چنے پڑے ہوئے تھے۔ نبض پر ہاتھ رکھتے ہی حکیم صاحب نے فرمادیا کہ مریض نے کوئی ثقیل غذا مثل چنے کے کھائی ہے مریض

نے اسے شرمندگی سے تسلیم کیا۔ گھر پر آکر شاگرد نے اس غیب دانی کے اسباب دریافت کئے۔ بعد اصرار کے بعد معلوم ہوا کہ سرہانے جو چنے پڑے ہوئے تھے۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا تھا۔ یہ سبق شاگرد کو یاد رہا۔ فارغ التحصیل ہوکر جب کسی مریض کو دیکھنے گئے تو ادھر ادھر بہت دیکھا۔ کوئی شئے نظر نہ آئی۔ سرہانے چارپائی کے نیچے ایک نمدہ کا ٹکڑا رکھا تھا۔ دیکھنا تھا کہ چلا اوٹھے۔ "تمنے نمدہ کھایا ہے"

بالکل یہی حال قیاسی فنون کا ہے۔ "یک من علم را دہ من عقل باید" جس قدر ان علوم سے متعلق ہے اوس قدر معین علوم سے متعلق نہیں۔ یوں تو اس فن کی اصولی باتیں ایک بچہ بھی سیکھ سکتا ہے لیکن صرف اس فن میں صرف اونھیں کو کامیابی حاصل ہوسکتی ہے جن کی مرتب ذہنیت انسانی زندگی کے گرد و پیش پر عبور کامل رکھتی ہے۔ مثلاً اگر ایسی تحریر آپ کے سامنے موجود ہے جس میں تموج ہے اور یہ بھی آپ کو معلوم ہے کہ کاتب کی عمر ۲۵ سال کی ہے تو آپ کبھی بھی اس تموج کو رعشہ یا خامی کتابت پر محمول نہیں کرسکتے۔ ماہران اخلاقیات کا جدید نظریہ یہ ہے کہ ۲۰ سے ۳۰ سال کی عمر تک مجرمانہ ذہنیت جعل و قتل میں زیادہ دلچسپی لیتی ہے۔ اس اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے آپ لازماً اس نتیجہ پر پہونچیں گے کہ کاتب ان عیوب میں مبتلا ہے یا اون کی جانب راغب ہے۔

اس فن پر عبور کامل حاصل کرنے کیلئے علم النفس و علم قیافہ کی واقفیت بھی ضروری ہے۔ گراہین (جرمن مصنف) علم قیافہ کے مطالعہ کو زیادہ مفید قرار دیتا ہے۔ لیکن میرے نزدیک علم النفس اس فن سے زیادہ متعلق ہے۔ لوئیر (مشہور عالم فرانسیسی فلسفی) کی رائے میری تائید کرتی ہے۔ علم قیافہ کا جہاں تک تعلق ہے یہ مسئلہ اب تک ماہران فن کے درمیان مابہ النزاع ہے کہ ذہنیت کا اثر جسم کی ساخت کا ذمہ دار ہے یا جسم کی ساخت اپنے مطابق ذہنیت پیدا کردیتی ہے۔ لیکن علم النفس کا تعلق تو اس علم سے ظاہر ہے۔ بلکہ میں تو یہاں تک کہنے کے لئے آمادہ ہوں کہ بغیر واقفیت علم النفس، علم فراست التحریر پر عبور ناممکن ہے۔ چونکہ انسانی تحریر اوس کے "دماغی عمل" کا پرتو ہے، اس لئے جبتک ہم موخرالذکر کو نہ معلوم کریں، اول الذکر پر عبور محال ہے۔

اس علم کی اہمیت یورپ میں روز بروز بڑھتی جارہی ہے۔ بعض ممالک میں تو خفیہ پولیس نے جرائم کی تحقیقات کا اس کو مفید و معین ذریعہ بنالیا ہے۔ جیسے اطباء کا ایک گروہ "تحلیل تخیلات" کو علاج کا بہترین ذریعہ سمجھنے لگا ہے، اوس وقت سے مریضوں کی تحریر، عدالت کے بیان سے زیادہ "گویا" ثابت ہوئی ہے۔ کاروباری اشخاص امیدواروں سے ملازمت کے لئے اون کے ہاتھوں کی لکھی ہوئی درخواست لیتے ہیں۔ اس لئے کہ اس طرح وہ اون کے صحیح خیالات اور چال چلن سے واقف ہوسکتے ہیں۔ جعل کے دریافت

ہیں یہ علم سب سے زیادہ مفید ثابت ہو سکتا ہے، بشرطیکہ ماہران تحریر صرف ظاہری صورتوں پر بھروسہ نہ کریں بلکہ ہر دو تحریروں کے کاتبوں کے اخلاقی حالات پر بھی غور کریں۔ ممکن ہے کہ میں اس نظریہ میں یکہ و تنہا ہوں۔ لیکن اس کی مزید توضیح اس مسئلہ کو حل کر دیگی۔ میرے نزدیک یہ صنف علم اس درجہ اہم ہے کہ میں نے ایک علیحدہ باب میں اس کی تفصیل ضروری سمجھی۔

عام اجتماعی زندگی میں بھی یہ علم مفید ثابت ہوا ہے۔ اب وہ زمانہ نہیں رہا جب انسان خلوت نشیں ہو کر انفرادی زندگی بسر کر دے۔ تہذیب و تمدن نے ہر ایک کو دوسرے کا محتاج بنا دیا ہے۔ آج سب سے زیادہ مشکل انتخاب احباب ہے۔ اس فریب و خود غرضی کے زمانہ میں ہر شخص آپ کو دوست نظر آئے گا۔ لیکن معیار دوستی "دوست آن باشد کہ گیرد دست دوست" جو آج سے ہزار برس پہلے تھا وہ اب بھی اوسی طرح صحیح و درست ہے۔ آپ اپنے ملاقاتیوں کی تحریر کا بغور امتحان کرلیں۔ اور اگر وہ معیار اخلاق پر صحیح اُترتے ہیں۔ یا اونکے طبائع آپ کی طبیعت سے مناسبت رکھتے ہیں تو آپ اون سے راہ و رسم بڑھائیں۔ مجھے متعدد ایسے اصحاب کی تحریریں دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے جو آج سوسائٹی کے بام رفعت پر ہیں۔ مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ میں نے عموماً یہ پایا کہ اون کی موجودہ زندگی کا باطن پہلو تنگ و تاریک ہے یا اگر یہ نہیں ہے تو اون میں وہ خامیاں مخفی طور پر ضرور موجود ہیں۔ جو اگر آج نہیں تو کل ظاہر ہو کر رہیں گی۔ اگر آپ کو ذاتی طور پر اس کا امتحان مقصود ہے تو آپ اون "رہنمایان قوم" کی تحریریں بلاحظہ کریں۔ جو کل بام رفعت پر تھے۔ لیکن آج زمانہ نے انھیں بے نقاب کر کے قعر مذلت میں گرا دیا ہے۔ جہاں وہ گمنامی میں پڑے ایڑیاں رگڑ رہے ہیں۔

عمر کے ساتھ ساتھ انسان میں متانت و دور اندیشی بھی آتی ہے۔ مگر آپ کو یہ سُن کر تعجب ہوگا کہ بسا اوقات ابتدائی زندگی کی مستحکم فطری کمزوریاں آخر زندگی تک کم و بیش نمایاں رہتی ہیں۔ میرے سامنے میری وہ تحریر موجود ہے جو میں نے آج سے پندرہ برس پہلے لکھی تھی، جب میری عمر قریب تیرہ سال کے تھی۔ گو زمانہ کے تجربات نے مجھ میں نمایاں تبدیلی پیدا کر دی ہے، لیکن پھر بھی میں تو وہی ہوں۔ جذبات کا غلبہ جو مجھ پر پہلے تھا وہ اب بھی ہے۔ گو کسی قدر کمی کے ساتھ۔ میرا تجربہ ہے کہ ابتدائی زندگی کی وہ خامیاں جو مقتضائے عمر ہوتی ہیں۔ وہ تو تحریر سے آخر زندگی میں نکل جاتی ہیں لیکن دستخط میں اوس کے اثرات کم و بیش ضرور نمایاں رہجاتے ہیں، اسی لئے ماہران فن نے دستخط کو بہت اہمیت دی ہے۔

اس علم کی تحقیقات کے دوران میں مشکل ترین اوقات میرے لئے وہ تھے جب مصنوعی تحریریں میرے سامنے پیش کی گئیں۔ بعض نے دوسروں کی تحریر اپنے نام سے پیش کی۔ چند لوگوں نے حروف بدل کر تحریر لکھدی لیکن سب سے زیادہ دلچسپ اون لوگوں کی تحریریں تھیں۔ جو اس علم کے ابتدائی اصول سے تھوڑی بہت واقفیت

حاصل کرکے اپنی تحریر میں اون علامات کو مخفی رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ جن سے اون کے عیوب ظاہر ہو جاتے۔

اول الذکر کے متعلق رائے زنی مشکل نہ تھی، اس لئے کہ اس علم کو شخصیت سے کوئی تعلق نہیں۔ جس کی تحریر ہو اوسی کے حالات ظاہر ہوں گے۔ جن لوگوں نے اصول علم سے ناواقف رہ کر اپنے خطوط تبدیل کئے وہ اون نقالوں کے مانند ہیں، جو اپنی صورت بدل کر اکبر و اورنگ زیب کی نقل کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن انھیں یہ معلوم نہیں کہ اونکی شبیہیں ناقص تھیں۔ ایسی صورت میں مصنوعی و غیر مصنوعی کا امتیاز نسبتاً آسان تھا۔ اس میں شبہہ نہیں کہ مجھے موخرالذکر صورتوں میں دقتیں پیدا ہوئیں۔ ابتداءً مشق میں تو بالکل ناکامیاب رہا۔ لیکن بعد چندے مجھے قدرے کامیابی ہوئی۔ ایسے لوگوں سے میں صرف اس قدر عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ ماہر فراست التحریر پیغمبری کا مدعی نہیں ہوتا۔ وہ تو ایک طبیب کی مانند ہے جو مریض کے حالات کے لحاظ سے نسخہ تجویز کرتا ہے۔ بچپن میں ایک میرے ہم مکتب کو پنجشنبہ کے دن درد شکم کا دورہ شروع ہوتا تھا۔ اصل سبب یہ تھا کہ مولوی صاحب اوس دن امتحان لیتے اور بصورت ناکامیابی خوب زدوکوب کرتے۔ دنیا جانتی تھی کہ یہ صرف بہانہ ہے، لیکن کوئی بھی اس کا ثبوت نہ دے سکا۔

ایسی تحریر کے کاتب کا صرف ایک علاج ہے۔ آپ اوس سے متعدد تحریریں حاصل کریں۔ اگر وہ ابتدائی تحریر مصنوعی ہے تو وہ شخص اس "فریب" کو اپنی تمام تحریروں میں یکساں نہ ظاہر کر سکے گا۔ مختلف تحریروں کا تقابل آپ کو صحیح نتیجہ پر پہونچا دے گا۔ اس کے علاوہ میرا ایک خاص تجربہ ہے، ایسی تحریر کی ہر سطر سے چار الفاظ داہنے اور بائیں سے قلمزد کر دیجئے۔ سطر کا وسط حصہ آپ کو صحیح راستہ پر پہونچا دے گا۔ عموماً انسان مصنوعی تحریر ابتداء و انتہاء سطر میں لکھنے کی کوشش کرتا ہے، سطر کا درمیانی حصہ تقریباً اوس کے فریب سے محفوظ رہتا ہے۔

تحریر کے اقسام

ایک اور امر قابل لحاظ ہے، جس شخص کی تحریر آپ کے سامنے موجود ہو اوس کی تین حیثیتیں ہو سکتی ہیں۔ (۱) محتاج مشورہ (۲) مستفسر (۳) اور ممتحن۔ یہ امور آپ زبانی گفتگو سے یا تحریر سے دریافت کر سکتے ہیں۔ عموماً ممتحن طبائع فریب دینے کی کوشش کرتی ہیں۔

عام علامات کو بہ غور دیکھنے کے بعد ایک ایک متعلم کا فرض ہے کہ وہ کاتب کے اخلاقی و علمی و ذہنی حالات کے اعتبار سے صحیح و مناسب جگہ تجویز کرلے۔ میرے خیال میں گو یہ ابتدائی منزل ہے، اس لئے کہ اس یقین کے بعد ساری باتیں۔ بہ طور نتیجہ لازماً نکلتی آئیں گی۔

اصولاً دنیا میں دو ہی قسم کے انسان ہیں، اعلیٰ اور ادنیٰ۔ متوسط طبقہ کوئی مخصوص جدا حیثیت

نہیں رکھتا۔ اوس کی خصوصیات مشترکہ حیثیت رکھتی ہیں۔ اب اعلےٰ و ادنےٰ دونوں کے مزید تین تدریجی اقسام ہیں۔

علویت

(۱) قسم اول۔ اس صنف میں دنیا کی مخصوص ذاتیں شامل ہوسکتی ہیں۔ جن کی اخلاقی قوتیں۔ دنیا کی تاریخ بدل دیتی ہیں۔ یہ وہ شخصیتیں ہیں جو زمانہ کو بناتی ہیں، تیر و تفنگ سے نہیں، تلوار و خنجر سے نہیں، بلکہ صرف اپنی اخلاقی مثال سے وہ انسان کو کھینچکر اپنی سطح پہ لا کھڑا کرتی ہیں، جس طرح ہم بجلی کی تحلیل سے قاصر ہیں، اوسی طرح اونکی تحلیل بھی مشکل ہے" ان کے کان دیکھتے ہیں۔ اون کی آنکھیں سنتی ہیں" اونکی دماغی و روحانی قوتیں عام انسانی سطح خیال سے بالاتر ہیں۔ وہ بام رفعت پہ اوس جگہ پہونچے ہوئے ہیں۔ جہاں سے آگے" فروغ تجلی بسوزد پرم" رسول و انبیا اس کی مثال ہیں۔

(۲) قسم دوم۔ اس صنف میں جو اشخاص شامل ہیں۔ جو تاریخ بدلتے نہیں، لیکن تاریخ بناتے ہیں۔ انہیں وہ الہامی قوت تو موجود نہیں ہوتی جو قسم اول کی خصوصیت ہے۔ لیکن ان کا ضمیر ان کے مستقبل کا ایک آئینہ ہوتا ہے۔ گو یہ ساری خوبیاں اکتسابی ہوتی ہیں وہبی نہیں، اونکی آنکھیں روشن ہوتی ہیں، لیکن اونکا آئینہ دل" علم مستقبل کے لئے پرتو کا محتاج ہوتا ہے۔ وہ کامل ہوتے ہیں اور اون کے اعمال و افعال کمال کا درجہ رکھتے ہیں، لیکن کمال بھی وہ جو اضافی ہے۔ قسم اول کی طرح اون کی شیرینی بیانی ایسی نہیں ہوتی کہ آپ یہ کہہ سکیں

میں نے یہ سمجھا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

اور نہ اونکی آواز کا "نغمۂ خفی" ایسا ہوتا ہے کہ آپ اپنے کانوں کی روئیاں نکال کر پھینک دیں اور پکار اٹھیں کہ

ہذا اسم عظیم

مگر ہاں اونکی منطق دل کو نہیں، تو کانوں کو ضرور بھلی معلوم ہوتی ہے اور دماغ ان کی "لذت تقریر" سے متاثر ہوتا ہے ٹالسٹائی اس کا صحیح مصداق ہے۔

قسم سوم۔ اس صنف میں وہ دنیا کی ذہین شخصیتیں شامل ہیں جو عقل سلیم رکھتی ہیں۔ یہ نکات پیدا نہیں کرتے۔ لیکن اون کی پرورش ضرور کرتے ہیں۔ وہ معاملات کی حقیقت سمجھتے ہیں۔ قسم دوم کی طرح اون کی عقل خود رہبری تو نہیں کرتی۔ لیکن اون کے تجربات ضرور اون کی رہنمائی کرتے ہیں۔ وہ ایک ادنےٰ شخص کی کی طرح سانپ کے سوراخ میں دوبارہ ہاتھ نہیں (ڈالتے)"

اعلیٰ تحریر کے علامات

نمبر شمار	وصف	علامات
(۱)	صفائی دماغ	صاف ونمایاں حروف۔ حروف وسطر کے درمیان مناسب فاصلہ
(۲)	طاقت وقوت دماغی	پیوستہ تحریر۔ سطر ہموار۔ حروف کے معین دائرے وکشش
(۳)	قوت مطابقت	کاغذ اور جگہ کی مناسبت سے حروف وتحریر
(۴)	عقل وفراست	داہنی جانب جھکی ہوئی تحریر
(۵)	حوصلہ مندی	بلند حروف وتحریر
(۶)	خوش اخلاقی	بیضاوی تحریر
(۷)	اعلےٰ تربیت	تحریر جیسی پیشہ ور کاتب لکھتے ہیں، اگر پیشہ ور کی نہ ہو،
(۸)	مذاق سلیم	خولصورت رواں تحریر
(۹)	خلوص ودیانت	تحریر جس کے الفاظ کے آخری حروف واضح اور نمایاں ہوں۔
(۱۰)	اعلےٰ تخیل	دستخط جس میں پورا نام واضح ہو۔

دنائت انسان کی قوتیں تقریباً نامحدود ہیں۔ وہ "عیسیٰ بھی ہو سکتا ہے اور خر عیسیٰ بھی" میرا تو یہ خیال ہے کہ علویت کی جانب تو حدود پھر بھی قدرے معین ہیں۔ لیکن اسفل کی جانب انسان کی قوتیں صرف اوس کی مرضی پر منحصر ہیں، وہ چوری کرتا ہے، وہ زنا کرتا ہے، وہ قتل کرتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اوس سے وہ بداخلاقیاں بھی سرزد ہوتی ہیں۔ جو جانور اور چوپایوں سے بھی ناممکن ہیں اور جنھیں بیان کرتے شرم آتی ہے۔

علوئت کی طرح دنائت کے بھی کئی مدارج ہیں۔

قسم اول۔ عوام الناس۔ ان میں وہ لوگ شامل ہیں۔ جو اپنی روزمرہ زندگی میں ہوشیار وچالاک ہیں۔ یہ زمانہ کے ساتھ چلتے ہیں۔ ذمہ دارانہ فرائض کی انجام دہی بھی ان سے ممکن ہے۔ ان کے نزدیک علویت ودنائت میں کوئی امتیاز نہیں۔ انکا معیار زندگی بھی معمولی ہوتا ہے۔

قسم دوم۔ انسانی زندگی کا ہر پہلو ایک معمہ ہے۔ جس کا حل خود اُس کے ہاتھوں میں ہے اور اسی حل

میں اُس کی زندگی کا راز مضمر ہے۔ ایک دہقانی جاہل کے کانوں پر جوں تک نہ رینگے گی اگر آسمان ٹوٹ کر زمین پر آجائے۔ سیارے متصادم ہوں۔ زمین زلزلوں سے تباہ و برباد ہو جائے جب تک اوس کا ذریعۂ معاش درست و مناسب ہے اوس وقت تک اوس کو دنیا و مافیہا کی خبر نہیں۔ بلکہ یوں کہئے کہ وہ اوس جانب متوجہ ہونے سے انکار کرتا ہے۔ اوس کے معمولات (محنت و مزدوری۔ کھانا۔ اور سونا۔) میں اگر فرق نہیں آتا تو اوسے مطلب نہیں۔ اگر ملک میں برطانیہ کی حکومت رہے یا سوراج قائم ہو۔ آپ کو تعجب ہوگا کہ وہ خوش بھی ہے۔ اوسنے کچھ رقم پس انداز بھی کرلی ہے۔ جو کبھی بھی بصورت قحط کافی نہیں ہوسکتی، لیکن اوس کی "حساب داں ذہنیت" اوس کو کافی سے زیادہ سمجھتی ہے۔ وہ نہیں جانتا کہ ترقی کسے کہتے ہیں۔ اوس نے کبھی اس پر غور بھی نہیں کیا کہ وہ اپنی حالت کو بہتر بنا سکتا ہے۔ جارج ایلیٹ (مشہور انگریزی ناول نویس) کا بیان ہے کہ اوس نے ایک بار ایک غریب جاں بلب ہمسایہ سے پوچھا کہ "کیا تم کوئی ایسی میٹھی دوا پینا چاہتے ہو جس سے تمہاری تکلیف میں سکون ہو" اوس کا جواب تھا "دوا۔ اور میٹھی۔ میری زبان کیا مرے کان بھی اس سے آشنا نہیں۔ نہیں۔ تم مجھے دوا نہ دوگے۔ تم غلط کہتے ہو۔ آخری وقت میں تم ایک موہوم شئے کی حرص پیدا کرکے میری تکلیف کو بڑھا رہے ہو"

آپ کو حیرت ہوگی کہ ایسے لوگ خوشی سے زندہ ہیں اور خوشی سے مرتے ہیں۔ اونکی زندگی معین معمولات پر مشتمل ہے۔ ہمسایہ سے جنگ، اعزہ اقارب سے جدل۔ بی بی کو تنبیہ یہ واقعات دوسروں کے لئے خلاف معمول ہوں لیکن اون کے لئے یہ بھی معلومات میں داخل ہے اس فن کے اعتبار سے ایسوں کی زندگی صفر سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔ نفسیات کا متعلم ممکن ہے کہ اون کی ظاہری صورتوں سے فریب میں آجائے لیکن ہم کبھی ان سے دھوکا نہیں کھا سکتے۔ دنیا کے نزدیک اونکی خاموشی فراست کی دلیل ہے، ایک عالم ہے کہ اون کی کم ہمتی کو احتیاط سے تعبیر کرتا ہے۔ چونکہ اون سے کوئی کام خلاف امید سرزد نہیں ہوتا، اس لئے زمانہ اون کو صاحب عقل بتاتا ہے۔ وہ اپنے افعال کے لئے پارینہ امثلہ کو سند میں بھی پیش کرسکتے ہیں۔ گو ہم آپ اون کو جانور سے بھی بدتر سمجھکر نظرانداز کردیں۔ لیکن دنیا اون کو فراست و دانائی کا مجسمہ سمجھتی ہے۔
یہ ہے دنائت کی دوسری صنف۔

قسم سوم۔ یہ دنیا کی بدترین مخلوق ہے۔ "یقولون مالا تفعلون" ان کا اصول عمل ہے، سوسائٹی ممکن ہے کہ سفید پوش و غیر سفید پوش میں تفریق کرکے اول الذکر کی وجاہت سے مرعوب ہو جائے۔ لیکن عالم اخلاق دونوں کو برابر سمجھتا ہے بلکہ اول الذکر کو اجتماعی زندگی کے لئے زہر قاتل جانتا ہے، ایک چور سے آپ اپنا مال و اسباب محفوظ رکھ سکتے ہیں۔ لیکن ایک ریاکار سے حفاظت مشکل ہے۔ یہ شیطان صفت گروہ

دنیا کی بدترین معصیت کا مرتکب ہو سکتا ہے، اوس کی زندگی بدکاریوں کا نا متناہی سلسلہ ہے اور اوسکی حیات ظاہری ایک زبردست فریب۔

ادنےٰ تحریر کی علامات

نمبر شمار	عیوب	علامات
(۱)	بدمذاقی	بھدی تحریر۔ مصنوعی کشش و دائرے
(۲)	نفسانیت	بلند تحریر۔ (ادنی اقسام) جس میں مصنوعی ارتعاش ہو۔
(۳)	حمق و ابلہی	جامد و ساکن۔ تحریر کثرت سے زاویہ دار حروف۔
(۴)	پریشانی خیال	منتشر تحریر
(۵)	خود غرضی	طویل تحریر
(۶)	خباثت	تنگ تحریر
(۷)	جہل	ناہموار تحریر
(۸)	کاہلی	پست تحریر
(۹)	بچپرانہ ذہنیت	تحریر جس کے حروف پتلے ہوں۔
(۱۰)	ضد۔ فضول گوئی۔	موٹی تحریر

آپ سے یہ پوشیدہ نہیں کہ دنیا میں عیوب و محاسن کے اقسام ہیں۔ کبھی ایک ہی صفت یا عیب اخلاق پر موثر ہوتا ہے۔ اور کبھی متعدد عیوب اور متعدد محاسن یا متعدد محاسن و عیوب کا اجتماع ایک نیا اثر پیدا کر دیتا ہے۔ یہ علم النفس کے حدود میں ہے مگر چونکہ اس علم سے بھی ہم کو اس وقت تعلق ہے۔ اس لئے فراست التحریر کے متعلم کا فرض ہے کہ وہ ان اجتماع کے اثرات کی صحیح تحلیل پیش کرے۔ یہی وہ تحلیل ہے جس کے نتائج کاتب کے مستقبل کا پتہ بتا سکیں گے۔ بہ طور مثال میں چند ایسی اجتماعی کیفیات کا اثر بیان کروں گا، مثلاً

(۱) عقل۔ ہمت۔ محنت کا اجتماع "کامیابی" ہوتا ہے۔

(۲) عقل۔ ہمت کا اجتماع جوش۔ اگر اس جوش کا مصرف خراب رہا تو ناکامی۔
(۳) فراست۔ تخئیل " شاعری۔
(۴) غرور۔ جہل " ناکامیابی۔
(۵) خودغرضی۔ ہوشیاری " خباثت۔
(۶) تخئیل۔ خوش اعتقادی " توہم پرستی۔
(۷) تخئیل۔ اخلاقی جرات۔ استقلال " بدیر کامیاب کرتا ہے۔
(۸) کمزوری اخلاق۔ دماغی مطابقت " فریب
(۹) فضول گوئی۔ جہل " کاہلی
(۱۰) عقل۔ تخئیل " مآل اندیشی
(۱۱) ضد۔ جہالت۔ بیکاری " بداطواری
(۱۲) حرص۔ جھوٹ۔ خودغرضی " چوری و خیانت کی طرف رغبت پیدا کرتا ہے۔
(۱۳) لاپرواہی۔ کاہلی " گندگی
(۱۴) حرص۔ ہمت " ظلم
(۱۵) خودداری۔ جہالت " غرور
(۱۶) علم۔ احساس فرائض " عمل

اسی طرح آپ تمامی اوصاف و عیوب کے اجتماعی اثرات کا اندازہ کرسکتے ہیں۔ اخذ نتیجہ کے وقت یہ امر ملحوظ رہے کہ جو صفت یا عیب قوی الاثر ہوگا۔ اوس کا اثر غالب رہے گا۔ عقل و تخئیل میں اگر عقل غالب رہی تو مآل اندیشی ہے اور اگر تخئیل غالب رہی تو ناقابل عمل نظریات کی تخلیق کے سوا دماغ کا اور کوئی کام نہوگا۔

" لکھنے والے! کیا یہ تجھے معلوم نہیں کہ تیری تحریر کی زندگی تیری زندگی سے زیادہ ہے"
" تو مر جائے گا، لیکن تیری تحریر کی روشنی میں اہل نظر تیرے محاسن و معائب دیکھینگے "

(جان ٹرنر)

مولانا قطب الدین عبد الوالی صاحب لکھنؤ
مولانا ناصر حسین صاحب قبلہ لکھنؤ
مولانا سید سلیمان ندوی اعظم گڈھ
مفتی صاحب ریاست رام پور
مولانا عبد الحلیم صاحب صدیقی ندوۃ العلماء لکھنؤ
مولانا سجاد صاحب نائب امیر شریعت پھلواری
مولانا عبد الماجد صاحب بدایونی
مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی
مولانا حسین احمد صاحب دیوبند
مولانا محی الدین صاحب امیر شریعت پھلواروی
صدر مدرس صاحب مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ
مولانا لطف اللہ صاحب رحمانی مونگیر
مولانا عبد العزیز صاحب صاحب گنج
مولانا احمد - احمدیہ - بلڈنگ لاہور

مولانا عنایت اللہ صاحب لکھنؤ
مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شیروانی
مولوی قاضی محمد یحییٰ صاحب بھوپال
مفتی صاحب حیدرآباد دکن
مفتی مولانا شبلی صاحب ندوۃ العلماء لکھنؤ
مولانا صبیح الحق صاحب پٹنہ
مولانا عبد القدیر صاحب بدایونی
مولانا نثار احمد صاحب کانپور
مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسر
مولانا شاہ سید سلیمان صاحب پھلواری
صدر مدرس صاحب مدرسہ امدادیہ دربھنگا
مولانا محمد اسحاق صاحب بھاگلپور
مولانا ابوالکلام آزاد کلکتہ
مولانا عبد الستار صاحب لاہور

ان ۳۲ حضرات میں سے صرف ۱۶ نے جواب دینے کی زحمت گوارا فرمائی جنکے نام یہ ہیں:-

مولانا اشرف علی صاحب تھانوی
مولانا احمد احمدی - قادیان
مولانا حسین احمد صاحب مدنی
مولانا عبد القادر صاحب مفتی رام پور
مولانا محمد سجاد صاحب بہار
مولانا احمد سعید صاحب دہلی
مولانا سید سلیمان ندوی اعظم گڈھ
مفتی صاحب بلدہ و صدارت عالیہ حیدرآباد دکن

قاضی محمد یحییٰ صاحب بھوپال
مولانا عبد الستار صاحب لاہور
مولانا عبد العزیز صاحب ڈھاکا
مولانا نثار احمد صاحب آگرہ
مولانا محمد کفایت اللہ صاحب دہلی
مولانا عنایت اللہ صاحب لکھنؤ
مولانا غلام حسنین از طرف شاہ سید سلیمان پھلواری
مولانا عبد الحلیم صاحب صدیقی لکھنؤ

اب میں اسی ترتیب سے ان حضرات کے جوابات پیش کرتا ہوں:۔

مولوی اشرف علی۔ تھانہ بھون۔ ۱۴/۱۲ ۲۹

"سوال تنقیح طلب ہے۔ جو تحریر سے خالی از تکلف نہیں۔ ایسے سوال کا جواب زبانی ہو سکتا ہے۔"

مولانا محمد یحییٰ صاحب قاضی بھوپال۔ ۱۳ر دسمبر ۲۹ء

الجواب

"یہ مسلمان ناجی ہے۔ مکر، فریب، کذب، افترا، ایذا رسانی، قطع رحم کی سزا کا مستوجب یہ مشرک ناری ہے۔ خدمت ابنائے جنس۔ پرورش یتامے۔ ہمدردی بیوگان۔ پاک سرامن ہونا اور سکون اُسی کی ذات کا بیکار۔ جواب ہذا کے نتائج قابل انتظار ہیں۔ جبتک سوال میں استناد کی ضرورت نہیں تو جواب میں بھی نہیں۔ جب ضرورت ہو تو بہت کچھ موجود ہے۔"

مولانا احمد لاہور۔ نمبر ۲۱۷۳۔ ۱۴ دسمبر ۲۹ء

"اخویم مکرم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

بجواب استفتاء گذارش ہے کہ مذہب اسلام کے نقطۂ نظر سے جو کوئی شخص نیک عمل کرتا ہے اسکا ثمرہ اسکو ملتا ہے اور جو کوئی برا کام کرتا ہے اسکی سزا بھگتتا ہے۔

من یعمل مثقال ذرۃ خیراً یرہ ط ومن یعمل مثقال ذرۃ شراً یرہ ط ایک جگہ قرآن کریم میں فرمایا ہے۔ لیس بامانیکم ولا امانی اہل الکتاب من یعمل سوءً یجز بہ ط نہ تمہاری جھوٹی خواہشیں کچھ کام آتی ہیں نہ اہل کتاب کی جو بھی برا کام کرے گا اسکی سزا اس کو دیجائیگی۔ اور ایک جگہ فرمایا ہے ان اللہ لا یضیع اجر المحسنین۔ اللہ نیکی کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔

پس کوئی مسلمان ہو یا اہل کتاب یا مشرک بت پرست ہر ایک کے اچھے اور برے عمل کا بدلہ اچھا یا برا اسکو ملتا ہے۔ ناری یا ناجی ہونا توازن اعمال پر منحصر ہے جس کے نیک اعمال کا پلہ بھاری ہو وہ آرام اور خوشی کی زندگی پائیگا جس کے نیک اعمال کا پلہ ہلکا ہو وہ تکلیف کی زندگی پائیگا۔

قارعہ

فاما من ثقلت موازینہ فھو فی عیشۃ الراضیۃ۔ واما من خفت موازینہ فامہ ہاویہ ط پارہ ۳۰ سورۃ

اور اس کا علم اللہ تعالےٰ ہی کو ہے کہ کس کا پلہ اعمال نیک کا بھاری ہے اور کس کا ہلکا۔ کسی عالم کا یہ کام نہیں کہ وہ یہ فیصلہ کرسکے کہ کون ناری ہے اور کون ناجی۔ اس کا علم اللہ تعالےٰ نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔"

مولانا عبدالستار صاحب لاہور۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

الحمد للہ حمد الکون ومنہ استمد التوفیق والعون

انک لعلیٰ خلق عظیم

فقالت خدیجہ

کلا واللہ ما یخزیک ابدا انک لتصل الرحم، وتحمل الکل، وتکسب المعدوم وتقری الضیف وتعین علیٰ نوائب الحق ط (بخاری)

نماز، روزہ، جو کہ مذہب اسلام کے شعائر ہیں، وہ تب ہی منتج نتائج حسنہ ہوتے ہیں، جبکہ ان کی ادائگی ضابطۂ اخلاق فاضلہ کے ماتحت ہو، ورنہ نہیں، ان الصلوٰۃ تنہیٰ عن الفحشاء والمنکر ۲۹/۴۵

پس جس نماز کا یہ اثر نہیں، وہ فی الحقیقت نماز ہی نہیں، بلکہ وہ ایک رسمی فعل ہے، اللہ تعالےٰ اس قسم کی رسمی عبادت کو قبولیت کی عزت نہیں بخشتا۔ انما یتقبل اللہ من المتقین ۵/۲۷

اسی طرح ہندو مذہب کے شعائر تب ہی مستوجب نتائج سیئہ بنکر اخلاق فاضلہ پر اثر انداز ہوسکتے ہیں، جبکہ انکا ظہور ضابطۂ اخلاق ذمیمہ کے ماتحت ہو، ورنہ وہ صرف ایک لغو رسمی فعل ہے، وبس۔

اخلاق خواہ حمیدہ ہوں، خواہ ذمیمہ، چونکہ یہ نفس انسانی کے وہ افعال ہیں، جن میں فطرت کے نیک پہلو یا بد پہلو کا اظہار مقصود ہوتا ہے، اس لئے وہ ہر حالت میں موثر ہیں، لیس للانسان الا ما سعیٰ ۵۳/۳۹ کل نفس بما کسبت رھینۃ ۷۴/۳۸ کل امرء بما کسب رھین ۵۲/۲۱ فمن یعمل مثقال ذرۃ خیرا یرہ ط ومن یعمل مثقال ذرۃ شرا یرہ ۹۹/۷،۸ لیکن اخلاق حمیدہ منتج نتائج حسنہ ہیں، لھا ما کسبت ۲/۲۸۶ اور اخلاق ذمیمہ مستوجب نتائج سیئہ وعلیھا ما اکتسبت ۲/۲۸۶

اللہ تعالےٰ مکر، فریب، کذب وافتراء، ایذارسانی، قطع رحم، سے جو اخلاق ذمیمہ ہیں، انسان کو روکتا ہے، اور ابنائے جنس کی خدمت، یتامےٰ کی پرورش، بیواؤں کی ہمدردی، امن وسکون، جو اخلاق حمیدہ ہیں، ان کے کرنیکا ارشاد فرماتا ہے، اور اسکے متعلق ذیل کے قرآنی ارشادات

بغور ملاحظہ فرمائیں۔

یخادعون اللہ والذین اٰمنو، لعنۃ اللہ علی الکاذبین، وقد خاب من افتریٰ، و من الذین اشرکوا اذی کثیرا، ویقطعون ما امر اللہ بہ ان یوصل ویفسدون فی الارض اولٰئک ھم الخٰسرون، ولا تعثوا فی الارض مفسدین، وابتغ فیما اٰتٰک اللہ الدار الاٰخرۃ ولا تنس نصیبک من الدنیا واحسن کما احسن اللہ الیک ولا تبغ الفساد فی الارض ان اللہ لا یحب المفسدین، ان یدعون من دونہ الا شیطانا مریدا، ومن یشرک باللہ فقد افتریٰ اثما عظیما، ان اللہ یأمر بالعدل والاحسان وایتاء ذی القربیٰ وینھی عن الفحشاء والمنکر والبغی، واتی المال علی حبہ ذوی القربیٰ والیتمیٰ والمساکین وابن السبیل والسائلین وفی الرقاب، واحسنوا ان اللہ یحب المحسنین ط

والصلح خیر

اب رہا یہ امر کہ میں فیصلہ کر لوں، کہ ان دو شخصوں میں سے کون ناری ہے، اور کون ناجی، یا دونوں ناری ہیں، یا دونوں ناجی، سو اس پر میں لب کشائی نہیں کر سکتا، کیونکہ میں جنت اور دوزخ کی کنجی کا مالک نہیں ہوں، اس کا مالک مالک الملک لا شریک لہٗ ہے و بس،

ہاں اس قدر ضرور کہوں گا کہ اسلام ہر قسم کے توحید، اعتقادی، عبادتی، عملی، کا خواہاں ہے، اگر ایک طرف عملی توحید مسلوب نظر آرہی ہے. تو دوسری طرف عبادتی و اعتقادی توحید کا فقدان ہے، نعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیّات اعمالنا۔

مولانا حسین احمد صاحب۔

الجواب

اول الذکر کا خاتمہ اگر ایمان پر ہوا اور اُسکی بد اعمالیوں نے حسن ختام میں کھنڈت نڈالی تو ضرور ناجی ہے پھر اگر گناہوں سے قبول ہونیوالی توبہ کرنیکے بعد مرا ہے، یا اُسکی تکالیف و مصائب گناہوں کے لئے کفارہ ہونے میں ہم پلہ ہیں تو ابتدا ہی سے نجات پا جائے گا۔ ورنہ سزا پانے یا شفاعت یا لحوق رحمت خاصہ کے بعد۔ ثانی الذکر کا خاتمہ اگر شرک و کفر پر ہوا اور اوسکے اچھے اعمال نے حسن خاتمہ اور ایمان تک نہ پہونچایا تو وہ ناری اور مخلد فی النار ہے۔　واللہ اعلم۔　۱۶ رجب ۱۳۴۸ھ

مولانا عبد العزیز صاحب گیلانی۔	۱۶ر دسمبر ۱۹۲۹ء

الجواب بعون اللہ العزیز الوہاب ط

کسی محکم قانونی نظام کی تحت میں عمل پیرا ہونے پر اعمال کے نتائج مترتب ہوا کرتے ہیں۔ جیسے عمل ہوں گے ویسے ہی ثمرات۔ خیر ہوئے تو خیر۔ شر ہوئے تو شر ہوں گے۔ لیکن جہاں کسی قانونی نظام کی تحت میں عمل نہیں ہوتے بلکہ صرف کورانہ تقلید۔ یا آباؤ اجداد کے نقش قدم کی اتباع تو وہاں من حیث عمل اچھے برے ہونیکی رائے انسانی عقل چاہے کچھ بھی دیا کرے ہر نظام قانونی کے نقطۂ نظر سے وہ ایک غیر منتج عمل ہی تصور کیا جائے گا۔

یا بالفاظ دیگر یوں کہا جاسکتا ہے کہ بار آوری کے لئے زمین اور تخم کی صلاحیت لازم و ملزوم ہیں۔ اگر زمین صالح تھی۔ پیر خراب تخم ڈالے گئے تو خراب ہی ثمر برآئیں گے۔ اور اگر تخم اچھے ہیں پر زمین میں صلاحیت نہیں۔ تو کچھ بھی ثمر نہیں دیگی۔ سعدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

زمین شور سنبل بر نیارد	در و تخم عمل ضائع مگرداں

رحمت عالم سید العرب صلی اللہ تعالے علیہ وعلی آلہ و اصحابہ وسلم نے التوحید راس الطاعات کے مبارک ارشاد میں بصیرت افروز اشارہ ارباب بصیرت کے لئے اسی کی طرف فرمادیا ہے فتدبر۔

اس تمہید کے بعد جواباً گذارش ہے

کہ ایک طرف تو مسلم موحد ہے جسکے بھلے برے اعمال عباداتاً و اخلاقاً نظام قانونی کی تحت میں ہو رہے ہیں اسلامی نقطہ نگاہ سے اُسکے اچھے برے اعمال کے ثمرات کا ترتب عالم آخرۃ میں یقینی ہوگا۔ خیر۔ خیر شر۔ شر ہوں گے۔ اگر خیر محض ہیں تو ناجی اور شر محض ہوئے تو پس از عقوبت ناجی ہوگا۔ اور مختلط فی العمل بالعفو والکرم یا بعد از سزا دفعتہ نجات پانے کا مستحق سمجھا جائے گا۔

دوسری طرف مشرک و کافر ہے۔ اس کے اعمال گو ملک و قوم۔ ابنائے جنس کی خدمت اہل وطن کے حق میں تو بہت ہی مستحسن نظر آتے ہیں۔ اور اُس کی ذات سراپا امن و سکون بنی ہوئی ہے پر قرآنی نقطۂ نظر و من یتبغ غیر الاسلام دینا فلن یقبل منہ وھو فی الاخرۃ من الخاسرین سے اجمالاً اور مثل الذین کفروا بربھم اعمالھم کرماد اشتدت بہ الریح فی یوم عاصف لا یقدرون مما کسبوا علی شئے سے صراحتاً ناجی ہونے کے خلاف میں شہادت ملتی ہے۔ ھذا ما علمنی ربی من الکتاب واللہ اعلم بالصواب ط

مولانا عبدالقادر صاحب مفتی رام پور۔

الجواب باللہ تعالیٰ التوفیق

بصورت مسئولہ اسلامی نقطۂ نظر سے کافر و مشرک بوجہ شرک ناری ہے جس پر قرآن مجید شاہد ہے،
ان اللہ لا یغفر ان یشرک بہ و یغفر مادون ذالک لمن یشاء الآیۃ اعمال خیر مصرحہ سوال
باعث نجات نار نہیں۔ بلکہ ان کا ثمرہ دنیا میں حاصل ہونا ممکن۔ آخرت میں کفار کا کوئی حصہ خیر نہیں
جس پر نصوص قرآنی شاہد ہیں۔ مسلمان اگرچہ کیسا ہی گنہگار ہو۔ اُسکی مغفرت کی یقینی امید ہے لقولہ تعالیٰ
یغفر لمن یشاء و یعذب من یشاء الایۃ، خواہ مغفرت فرما کر اللہ تعالےٰ بلا عذاب نجات فرمائے
یا بقدر گناہ عذاب دیکر نجات بخشے یہ مشیت الٰہی پر موقوف ہے۔ بہرحال مسلمان ناجی ہے، واللہ اعلم
یہ نہایت مشہور مسئلہ ہے۔ جسکے سوال کی حاجت نہ تھی، اللہ ایسے شبہات آپکے دل سے نکالدے۔

مولانا نثار احمد صاحب آگرہ۔

الجواب وہو الموفق للصواب

سائل نے وہ سوال فرمایا جس سے ہم جیسے کم فہم اپنے آپ کو مفتی ہوتے ہوئے خدا کے ٹھیکہ دار اور
ناری ناجی ہونے کا فیصلہ کرنیوالا سمجھنے لگیں۔ قرآن فرماتا ہے۔ یعذب من یشاء و یغفر لمن یشاء
یوں پوچھا جانا چاہیئے کہ ازروئے شرع شریف کون اچھا ہے اور کون مستحق مدح ہے، بہرحال اہلسنت
والجماعت کا مذہب ہے کہ مرتکب کبائر گناہ کا فاسق ہوتا ہے کافر نہیں ہوتا ہے، یہ تو پہلے شخص کی نسبت
حکم شرعی ہے کہ وہ فاسق ہے مگر کافر نہیں اب اللہ کے اختیار میں ہے جو چاہے کرے۔ حدیث صحیح میں ہے
کہ جو مسلمان شرک اور کفر خالص سے محفوظ رہے اور اللہ کے حوالہ چاہے تو بخشدے یا بقدر گناہ سزا
بھگت کر جنت میں داخل ہووے۔

دوسرے صاحب کی نسبت قرآنی فیصلہ ہے کہ بغیر ایمان و اسلام کے بڑی سی بڑی نیکی بیکار ہے، عمر بھر نیکی
کرے تمام عمر شب بیداری کرکے اللہ کو یاد کرے لاکھوں روپے خیرات کرے۔ بے ایمان و اسلام کے تو معتبر
نہیں۔ قرآن میں ہے۔ من عمل صالحا من ذکر او انثیٰ و ہو مومن انما والذین کفروا اعمالھم
کسراب بقیعۃ یحسبہ الظمآن ماء حتی اذا جاءہ لم یجدہ شیئا۔ واللہ اعلم بالصواب ط

مولانا محمد سجاد صاحب۔ پھلواری۔

الجواب ہو الموفق للصواب

پہلا شخص اپنی بداعمالی اور محرمات قطعیہ کے ارتکاب کی وجہ سے مستحق عذاب ہے۔ لیکن ایمان و اسلام کی وجہ سے غفران کی امید ہے اور بعد تعذیب آخری نجات کا تحقق بشرطیکہ ایمان اسلام پر اوسکا خاتمہ ہو۔
دوسرا شخص اپنے عقائد و اعمال شرکیہ کی وجہ سے مستحق عذاب ہے اور یہ کہ ہمیشہ عذاب الہی میں مبتلا رہے بشرطیکہ اوسکا خاتمہ بھی اسی کفر و شرک پر ہو۔ (العیاذ باللہ)
ظاہری اعمال بر اور تبرعات، ایمان باللہ و بما جاء الرسل علیہم الصلوٰۃ والسلام کے بعد آخرت میں مفید ہو سکتے ہیں۔"

مولانا محمد کفایت اللہ صاحب و مولانا احمد سعید صاحب دہلی

الجواب

اسلامی اصول کے موافق نجات کے لئے ایمان لازم ہے۔ مشرک کے لئے نجات نہیں ہے۔ قرآن مجید میں ہے ان اللہ لا یغفر ان یشرک بہ و یغفر مادون ذالک لمن یشاء (نساء) اللہ تعالیٰ اس کو نہیں بخشے گا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے اور اس کے علاوہ جسے چاہے گا بخش دیگا۔ یعنی مشرک کی مغفرت کے ساتھ مشیت ایزدی متعلق ہی نہ ہوگی۔
خازن میں ہے۔ ومعنی الآیۃ ان اللہ لا یغفر لمشرک مات علی شرکہ و یغفر ما دون ذالک لمن یشآء یعنی و یغفر ما دون الشرک لمن یشآء من اصحاب الذنوب والآثام (خازن ص ۴۵۳ مطبوعہ مصر جلد اول)
یعنی آیت کریمہ کے معنے یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ مشرک کو جو مشرک ہونے کی حالت میں مرجائے نہیں بخشے گا اور شرک کے علاوہ دوسرے گناہ اور جرائم والوں میں سے جسے چاہے گا بخش دیگا۔ اور حدیث میں ہے۔ ثم امر بلالا فنادی فی الناس انہ لا یدخل الجنۃ الا نفس مسلمۃ (بخاری جلد اول ص ۴۳۱) یعنی پھر حضور انور صلے اللہ علیہ وسلم نے بلال کو حکم دیا تو انھوں نے لوگوں میں پکار کر کہدیا کہ جنت میں صرف نفوس مسلمہ داخل ہونگے۔

ہاں جو مسلمان کہ ایمان و اسلام کے ساتھ گناہوں کا مرتکب بھی ہوگا۔ اگر تو بہ کرکے نہ مرے تو اس کو گناہوں کے بدلے جہنم کا عذاب دیا جائے گا یعنی وہ عذاب نہ دئے جانے کا مستحق ہے اگر حق تعالیٰ چاہے تو اُس کو بغیر عذاب دئے بخش دے اور چاہے عذاب دیکر بالآخر نجات دے۔
کافر اور مشرک کے پاس نجات کی اساسی شرط اور رضاء حق تعالیٰ کی کلید یعنی ایمان نہیں اسلئے وہ نجات جسکو رضاء مولیٰ کے حصول یا وصول الی اللہ سے تعبیر کیا جاسکتا ہے نہیں پاسکتا۔ نہ نجات کا مستحق قرار دیا جاسکتا ہے۔

انسانی روح کی منزل مقصود رضاء مولیٰ یا بلفظ دیگر وصول الی اللہ ہے۔ اس منزل مقصود تک سفر کے لئے جس قوت کی ضرورت ہے وہ ایمان کی قوت (سٹیم) ہے۔ اعمال حسنہ اس قوت کی معین ہو سکتے ہیں لیکن اصل قوت کا کام نہیں دے سکتے۔
مثلاً ایک مقام پر دو ٹرینیں کھڑی ہیں۔ ایک ٹرین کے ڈبے نہایت نفیس صاف و شفاف اعلیٰ درجہ کے ہیں۔ ڈبوں میں ہر قسم کے راحت کے سامان فواکہ الوان طعام سب موجود ہیں۔ اس میں بیٹھنے والے نہایت راحت و آرام پاتے ہیں۔ کھانا کھاتے۔ مٹھائیوں اور میووں سے لذت حاصل کر رہے ہیں۔
دوسری ٹرین کے ڈبے نہایت میلے کچیلے خراب خستہ ٹوٹے پھوٹے۔ نہ کسی قسم کی راحت کا سامان نہ کھانے پینے کا آرام۔ اس کے پُرزے بھی پرانے گھسے ہوئے مگر دونوں میں فرق یہ ہے کہ پہلی ٹرین میں سٹیم کا انجن نہیں ہے اور دوسری میں سٹیم والا انجن لگا ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ دوسری خراب خستہ ٹرین باوجود اپنی تمام قباحتوں اور خرابیوں کے واصل الی المقصود (ناجی) ہوگی۔ اور پہلی نفیس اور صاف و شفاف ٹرین باوجود اپنی تمام خوبیوں بلکہ راحت پاشیوں اور فائدہ رسانیوں کے غیر واصل الی المقصود (غیر ناجی) ہوگی۔ اس میں شک نہیں کہ اگر اس ٹرین میں سٹیم کا انجن لگا دیا جائے۔ تو اس کی سیر الی المقصود اعلیٰ و اکمل ہوگی۔ لیکن جب تک اصل قوت یعنی سٹیم کا انجن نہ ہو اس کی تمام خوبیاں فائدہ رسانیاں زر پاشیاں۔ ڈبوں کی صفائی پرزوں کی خوبی اور مضبوطی سب بیکار ہے۔
یہی مطلب ہے اس آیہ کریمہ کا۔ ان الذین کفروا وماتوا وھم کفار فلن یقبل من احدھم ملء الارض ذھبا ولو افتدیٰ بہ (آل عمران) یعنی جو لوگ کافر ہوئے اور کفر کی حالت میں مرگئے تو ان میں سے کسی کی طرف سے زمین بھر سونا بھی قبول نہ کیا جائے گا۔ اگرچہ یہ سونا اُسنے فدیہ خسران یعنی عدم نجات کے طور پر پیش کیا ہو مراد یہ ہے کہ چونکہ اس نے وصول الی اللہ کے لئے اصل قوت محرکہ و موصلہ حاصل نہیں کی (یعنی ایمان) تو اگر چہ دنیا میں اُسنے زمین بھر سونا بھی خرچ کیا ہو مگر یہ اُسکے لئے ایمان (یعنی اصلی قوت موصلہ) کے قائم مقام نہ ہوگا۔

جس طرح کہ مثال مذکور میں پہلی ٹرین کی خوبصورتی صفائی مضبوطی فائدہ و راحت رسانی وصول الی المقصو کے لئے کام نہ آئی۔ کیونکہ ان میں سے کوئی چیز بھی قوت موصلہ کا کام نہیں دے سکتی اور جب تک قوت موصلہ نہ ہو ہر ایک کا وجود بیکار ہے۔

جو لوگ کہ اللہ تعالے کے وجود اور اسکی صفات مالکیت ربوبیت رزاقیت وغیرہا پر ایمان رکھتے ہیں۔ ان کے لئے تو اس امر کا سمجھ لینا کچھ مشکل ہی نہیں کہ اسلام نے نجات کے لئے ایمان باللہ کو کیوں لازم قرار دیا ہے۔

بادشاہ سے بغاوت ایسا جرم ہے کہ اسکے ہوتے ہوئے مجرم کی تمام صفات حسنہ اُسکے بچانے کے لئے کافی نہیں ہوتیں۔ بالخصوص جبکہ بادشاہ نے یہ اعلان بھی کر دیا ہو کہ باغی کا جرم معاف نہیں کرونگا۔ باقی جرائم کو چاہوں گا تو معاف کردوں گا۔

یہ شبہ کہ جس شخص کی زندگی ابنائے جنس کی خدمت۔ یتامیٰ کی پرورش۔ بیواؤں کی ہمدردی میں بسر ہوئی ہے اس کا ناجی نہ ہونا اس امر کو مقتضی ہے کہ یہ اعمال حسنہ بے کار اور ضائع ہو جائیں اور یہ بات غیر معقول ہے۔ اس امر پر مبنی ہے کہ اعمال حسنہ کو نجات کے لئے موجب بالذات مانا جائے اور یہ غلط ہے کیونکہ نجات بہ معنے وصول الی اللہ کا تصور بغیر اللہ تعالےٰ کے اعتراف اور ایمان باللہ کے نہیں ہوسکتا۔ اور کافر جبکہ بت پرست عابد صنم ہے۔ مومن باللہ اور مصدق بالصفات موحد قرار نہیں دیا جاسکتا۔ تو اس کے افعال حسنہ بہ نیت تقرب الی اللہ (یعنی سیر الی اللہ) ہو ہی نہیں سکتے۔ اور اُن کو حقیقۃً افعال حسنہ ہی کہنا صحیح نہیں ہے۔ اس لئے یہ لازم ہی نہیں آیا کہ افعال حسنہ بیکار ہو جائیں۔

دوم یہ کہ ایسا شخص جو نیک کام کرتا ہے اُس کی منزل مقصود حصول نیک نامی ہوتی ہے اور یہ مقصد اُسے حاصل ہو جاتا ہے۔ من سمع سمع اللہ بہ۔ پس اس کے اعمال کا بطلان اور ضیاع لازم نہیں آیا۔

تیسرے یہ کہ اگر باوجود کفر اور شرک کے اس کے اعمال صالحہ میں اگر ادنےٰ سے ادنےٰ شائبہ بھی اعتراف و ایمان باللہ کا ہوگا اور کسی درجہ میں بھی وہ حصول رضاء مولےٰ تعالےٰ کا قصد رکھتا ہوگا تو حضرت حق تعالےٰ اس کے انھیں اعمال صالحہ کو اُس کے لئے وسیلۂ ایمان باللہ بنادیگا اور اس کیلئے سیر الی اللہ کی اصل قوت (سٹیم) مہیا و میسر فرما دے گا۔ جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد اسلمت علی ما سلف لک من خیر سے مفہوم ہوتا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا تھا کہ اسلام لانے سے پہلے میں نے جو اعمال صالحہ (مثلاً صدقہ غلام آزاد کرنا صلہ رحمی وغیرہ) کئے ہیں۔ کیا مجھے اُن کا بھی کچھ ثواب ملے گا۔ تو

حضور نے ارشاد فرمایا تھا کہ انھیں اعمال کے صلے اور نتیجے میں تو تمکو ایمان و اسلام کی توفیق نصیب ہوئی۔
اس مختصر تشریح کے بعد آپ کے سوال کا مختصر جواب یہ ہے کہ مومن عاصی آخرکار ضرور ناجی یعنی واصل الی اللہ ہے۔ اُس کے ایمان کا مقتضا یہ ہے کہ مولی تعالے اس کو اطاعت و انقیاد کے صلے میں آخرکار ضرور رضامندی کا تمغہ عطا فرمائے۔ اگرچہ وصول الی اللہ کے سفر میں اس کو اپنی خستگی خرابی کمزوری اجرائم و معاصی کی وجہ سے کتنی ہی دیر لگے اور کتنی ہی تکلیف اور مصائب برداشت کرنی پڑیں۔ مگر چونکہ قوت موصلہ (ایمان کی سٹیم) موجود ہے اسلئے ایک نہ ایک دن ضرور منزل تک پہنچ کر رہیگا۔
اور کافر نیکوکار ناجی نہیں یعنی واصل الی اللہ و فائز برضاء اللہ نہیں ہو سکتا۔ ہاں دُنیا میں اس کے اعمال صالحہ کا بدلہ یعنی نیک نامی منقبت۔ مقبولیت۔ شہرت یا دولت و ثروت مل جائے لیکن ما لھم فی الآخرۃ من خلاق۔ آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہیں۔

مولانا محمد عنایت اللہ صاحب فرنگی محل لکھنؤ۔

ہو المصوب

ولعبد مومن خیر من مشرک۔ مسلمان مشرک سے بحیثیت اسلام ہر حالت بہتر ہے اور ہر مسلمان ناجی ہے گو بعد عذاب ہو اور ہر مشرک مخلد فی النار ہے والعبرۃ بالخواتیم واللہ اعلم

مولانا سید سلیمان ندوی۔

الجواب

۱۔ دونوں ناری ہیں۔ کیونکہ نجات کامل موقوف ایمان اور عمل صالح دونوں پر ہے۔ الذین اٰمنوا وعملوا الصلحٰت سندخلھم جنٰت تجری من تحتھا الانھار (النساء) قد افلح المومنون الذین ھم فی صلاتھم خاشعون، والذین ھم عن اللغو معرضون والذین ھم للزکوٰۃ فاعلون والذین ہم لاماناتھم و ھم ماعون والذین ہم علی صلواتھم یحافظون ط (المومنون)
لیس البر ان تولوا وجوھکم قبل المشرق والمغرب ولکن البر من اٰمن باللہ والیوم الاخر والملئکۃ والکتب والنبیین واتی المال علی حبہ ذوی القربی والیتمی والمساکین وابن السبیل والسائلین وفی الرقاب واقام الصلوٰۃ واتی الزکوٰۃ والموفون ھم اذا عاھدوا والصابرین فی البأساء والضراء وحین البأس

اولئک الذین صدقوا و اولئک هم المتقون (بقرہ - ۲۲)

۲- لیکن ممکن ہے کہ پہلا بخشا جائے، اور دوسرا نہیں،

ان اللہ لا یغفر ان یشرک بہ و یغفر ما دون ذالک لمن یشاء و من یشرک باللہ فقد افتری اثماً عظیماً (النساء ۷)

ان اللہ لا یغفر ان یشرک بہ و یغفر ما دون ذالک لمن یشاء و من یشرک باللہ فقد ضل ضلالاً بعیداً (النساء ۱۸)

مولانا غلام حسنین پھلواروی۔

اس امر میں اختلاف رہا ہے کہ ایمان بغیر عمل اور عمل بغیر ایمان آیا برابر ہیں۔ یا دونوں کے مدارج میں فرق ہے۔ لیکن جمہور امت اس بات کی قائل ہے کہ ایمان کا مرتبہ عمل سے افضل ہے۔ لہذا عمل بغیر ایمان۔ ایمان بغیر عمل کے برابر نہیں ہو سکتا۔ عمل کا فقدان موجب عذاب ہے لیکن ایمان کا فقدان زیادہ عذاب کا موجب ہے۔ اس امر پر جمہور کا اتفاق ہے کہ عمل کا فقدان ابدی عذاب کا موجب نہیں ہے مگر فقدان ایمان کی صورت میں اکثریت ابدی عذاب کی قائل ہے اور ایک گروہ ابد سے مراد طول مکث لیتا ہے اور قائل ہے کہ آخری انجام سبھوں کا نجات ہے۔

ہماری ذاتی رائے جمہور کی موافقت میں ہے کہ مومن عاصی کا آخری انجام نجات ہے اور غیر مومن کا عذاب ابدی ہے۔ مگر اس امر میں علماء کا اختلاف ہے کہ غیر مومن کا حسنِ عمل تخفیف عذاب کا باعث ہوگا یا نہیں۔

مفتی صاحب حیدر آباد دکن۔

الجواب حامداً و مصلیاً

مسلمان کیسا ہی عاصی کیوں نہ ہو اپنے اعمال کے سبب مستوجب سزا ہوگا لیکن ناری نہیں اس لئے کہ محض اسلام خلود فی الجہنم کو مانع ہے۔ "واہل الکبائر من المومنین لا یخلدون فی النار وان ماتوا من غیر توبۃ ملخصاً" شرح عقائد نسفی۔

اگر توبہ کر کے مریں تو مغفرت کی امید ہے۔ کافر و مشرک خواہ اسکی تمام زندگی نیکیوں ہی میں کیوں نہ گذر

جائے۔ ناجی نہیں اس لئے کہ شرک ناقابل بخشش و مانع حصول بہشت ہے۔ واللہ تعالیٰ لا یغفر
ان یشرک بہ و یغفر مادون ذالک لمن یشاء من الصغائر والکبائر ص ۲ے شرح عقائد
نسفی۔ واللہ اعلم بالصواب۔ ۵ر شعبان المعظم ۱۳۴۸ھ

مولانا عبدالحلیم صاحب صدیقی لکھنؤ۔

جواب استفتاء

السلام علیٰ من اتبع الہدیٰ

تمہید۔ دفتر رسالۂ نگار سے مطبوعہ استفتاء کی ایک کاپی میرے پاس بھی پہونچی۔ مجھکو تعجب ہوا کیونکہ افتاء منصب دینیہ میں ایک جلیل الشان منصب ہے۔ اس کے مخصوص آداب و شرائط ہیں۔ جن پر عالم دین کی ذات میں جمع ہونا ضروری نہیں۔ اور نہ ہر جامع شرائط بزرگ پر یہ لازمی ہے کہ بغیر کسی خاص داعیہ دینی کے اس جانب اقدام کرے۔ میں نے اپنی گذشتہ زندگی کے کسی لمحہ میں بھی خود کو نہ منصب افتاء کا اہل سمجھا اور نہ مفتی فی الفروع کی حیثیت سے ملک و ملت کے سامنے پیش کیا۔ یہی وجہ ہے کہ شریعت مطہرہ کے شعبۂ سیاسیات یا التعلقات بین الملل کے علاوہ کسی استفتاء کا نہ جواب لکھتا ہوں۔ اور نہ حتی الوسع تہیہ کرتا۔ مخصوص شعبۂ سیاست میں دوسرے مقدس پیشوایان مذہب کے مقابلہ میں مجھکو بعض حضرات سے نسبتاً زیادہ غور و فکر کا موقع ملا ہے۔ اس لئے بحول اللہ و قوتہ اپنی بصیرت کے موافق سیاسی استفتاءات کا جواب تحریر کرنے میں تامل و تردد نہیں ہوتا۔ میری حیثیت اس سے زائد نہیں کہ مسلمانوں کا قومی خدمت گذار ہوں اور ان میں اپنی بساط کے مطابق اسلاف صالحین کے اسلام کا داعی۔ مذکورہ بالا استفتاء میرے حدود عمل سے بظاہر خارج تھا۔ اس لئے مجھکو تعجب بھی ہوا اور تحریر جواب میں کسی قدر متامل رہا۔ بالآخر اس خیال سے کہ شاید عنوان استفتاء اپنے مشہور و متعارف اصطلاح میں مستعمل نہ ہوا ہو۔ مختصراً جواب لکھنے کا تہیہ کیا اگر ضرورت پیش آئی تو مناسب شرح و بسط کے ساتھ دوبارہ عرض کر دیا جائے گا۔
غالباً یہ توقع بیجا نہ ہوگی کہ جوابات پر اظہار خیال کے سلسلے میں جب میری تحریر کا نمبر آئے تو نقد و تبصرہ کی ایک کاپی مجھکو بھی بھیجدی جائے۔

ہوالہادی

جواب۔ کسی کے ناجی یا ناری ہونے کا علم حقیقی نہ کسی عالم دین کو ہو سکتا ہے نہ عالم دنیا کو۔ حقیقت

انسانی عقل و ادراک کی سطح سے بالاتر ہے۔ اس میں انجام کا اعتبار ہے۔ جو بندوں سے مخفی ہے۔ علیم و خبیر کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ ان ربک ہو اعلم بمن ضل عن سبیلہ وہو اعلم بمن اہتدیٰ جس شے کا ہمکو علم نہیں۔ اس پر ہم حکم نہیں لگا سکتے۔ کسی شخص کی نجات اُخروی یا ہلاکت کا فیصلہ صرف احکم الحاکمین کا کام ہے۔ ان ربک لیفصل بینہم یوم القیامۃ فیما کانوا فیہ یختلفون۔ لہذا اس اہم مسئلہ میں قطعی رائے کا اظہار اور کسی مخصوص شخص کے ناجی یا ناری ہونے کا حکم لگانا اعمال الوہیت میں دخل در اندازی کے مترادف ہوگا۔ ہاں البتہ بے شک حق تعالےٰ کے نازل فرمائے ہوئے قانون قرآن کریم کی روشنی میں ظاہری علائم و آثار کی بناء پر جو کچھ کہا جاسکتا ہے وہ حسب ذیل ہے۔ استفتاء کے تنقیح طلب فقرات پر اظہار خیال کے بعد آخر میں خلاصہ لکھدیا جائے گا۔

نمبر ۱۔ خاندانی اسلام کی قید بے اثر اور غیر ضروری ہے۔ کیونکہ کسی شخص کا محض خاندانی مسلمان ہونا اُس کی نجات کے لئے ہرگز کافی نہیں۔ جب تک کہ وہ خود عقائد صحیحہ و اعمال صالحہ کا پابند نہ ہو۔ من قعد بہ عملہ لم یرفعہ نسبہ۔ جس کے ذاتی اعمال اُس کو پستی میں گرادیں اس کو عالی نسبی بلند نہیں کر سکتی۔ اور مشرف باسلام ہونے کے وقت کسی نو مسلم کا درجہ ایک باعمل خاندانی مسلمان سے اعلےٰ و ارفع ہوتا ہے۔ کیونکہ اسلام قبول کرتے ہی اس کے سارے پچھلے گناہ یہاں تک کہ کفر و شرک سب معاف ہوگئے۔ الاسلام یہدم ما قبلہ توحید و رسالت کا اقرار کرتے ہی ماں کے پیٹ سے پیدا ہونیوالے معصوم بچہ کی طرح تمام آلودگیوں سے پاک و صاف ہو جاتا ہے۔

نمبر ۲۔ پابند صوم و صلوٰۃ ہونا خاندانی مسلمان کے لئے بھی اسی طرح ضروری ہے جس طرح اسلام میں کسی نئے داخل ہونیوالے کے لئے۔ تہجد و ذکر و شغل قلب کی سختی اور سیاہی کو دور کرکے ایمان و معرفت کے نور سے منور کرتا ہے۔ اعمال بڑھتے، تقویٰ بتدریج ایسے شخص کی زندگی کا جزو لاینفک ہو جاتے ہیں۔ اور معاصی سے سخت نفرت و وحشت پیدا ہو جاتی ہے۔ ایسے نفوس قدسیہ سے تقاضائے بشریت احیاناً گناہ سرزد تو ہوتا ہے۔ لیکن معصیت آلود زندگی گذارنا اُسکے حق میں محال ہو جاتا ہے۔ غلطی کے بعد فوراً اس کا احساس ہوتا ہے۔ اور جب تک توبہ و استغفار کرکے اس کا اثر زائل نہ کردے اس وقت تک اس کے قلب مضطرب کو چین نہیں آتا۔ ان الذین اتقوا اذا مسہم طائف من الشیطان تذکروا فاذا ہم مبصرون والذین اذا فعلوا فاحشۃ او ظلموا انفسہم ذکروا اللہ فاستغفروا لذنوبہم ومن یغفر الذنوب الا اللہ ولم یصروا علی ما فعلوا وہم یعلمون۔

نمبر ۳ یعنی سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم نے جو کچھ لایا جس وضع کو مسلمانوں کے

لئے بالخصوص مردوں یا عورتوں کے لئے ناجائز قرار دیا ہے۔ اس سے محترز رہتا ہے لباس میں غیر مسلموں
کی وہ مخصوص وضع اختیار نہیں کرتا جو اسلامی امتیاز کو اٹھا دے کہ اگر کسی اجنبی مقام پر اس وضع میں
مر جائے تو مسلمان اس کو اپنے طریقہ پر تجہیز و تکفین کر کے اپنے قبرستان میں دفن کرنے سے قاصر رہیں۔
حق تعالے کے برگزیدہ بندوں کی وضع و قطع اختیار کرنا بھی پاک درونی کی علامت ہے۔
جو اعمال و احوال استفتاء کی ابتدائی دو سطروں میں از فقرہ نمبر ا تا نمبر ۱۲ تحریر ہوئے ہیں جس کسی شخص کے ایسے اعمال
و احوال ہوں محال عادی ہے کہ اس کی زندگی ان کمزوریوں سے آلودہ رہ سکے۔ جن کا شمار "لیکن" کے بعد سے
شروع ہوتا ہے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ اس غریب کی پابندی صوم و صلوٰۃ کسی شخص یا جماعت کو مکر و فریب نظر
آئے۔ اس کی نصیحت آمیز تلقین مذہب کذب وافتراء کا لقب پائے۔ اس کی اسلامی وضع و قطع کسی کو
پسند نہ آئے۔ یہ فرض محال ہی نہیں واقعات ہیں۔ مخالفین حق و اہل حق کی نسل منقطع نہیں ہوتی ہے۔
برخلاف اس کے استفتاء کی صورت مفروضہ فرض محال کے درجہ میں ہے۔ بہر حال اگر کسی نیک عمل مسلمان
کی زندگی بھی مکر و فریب کذب وافترا ایذا رسانی و قطع رحم جیسے سنگین جرائم سے محفوظ نہیں رہی اور اخیر دم
تک تلافی مافات اور سچی توبہ و انابہ کی توفیق بھی نہیں ہوئی اور ایمان و توحید پر قائم دنیا سے رخصت ہو گیا
تو ایسے شخص کی نجات یقینی ہے۔ لیکن گناہوں کی پاداش میں معذب ہونا یا نہ ہونا حق تعالےٰ کی مشیئت پر
محول ہے۔ حقوق العباد کے سوا بقیہ معاصی کو خواہ ابتداء ہی سے معاف فرما کر جنت میں داخل فرما دے خواہ
ان گناہوں کی سزا میں جہنم میں ڈالے اور سزا بھگتنے کے بعد اس کو جہنم سے نکال کر جنت نصیب فرمائے۔
نمبر ۵۔ جواب کا دار و مدار عقیدہ و شرک و کفر پر ہے۔ اسلام نے نہ اپنے ماننے والوں کے لئے ذات کی اونچ
نیچ اور نسلی امتیاز کا کوئی حق تسلیم کیا ہے اور نہ کفار و مشرکین اور تمام غیر مسلموں کے لئے، اس کا صاف
اور غیر مشتبہ فیصلہ ہے۔ ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم۔ اس نے مشرک و کافر برہمن ہو یا چمار دونوں
کی حالت یکساں ہے۔ بشرطیکہ اپنی جماعت کا سرغنہ اور کفر کا علمبردار نہ ہو اسی طرح پشتینی کی قید بھی
بالکل بیکار ہے۔ نفس مسئلہ پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ باپ دادا کے کفر کا یہ حصہ دار نہیں۔ لا تزر
وازرۃ وزر اخریٰ۔
نمبر ۶۔ علیٰ ہٰذا بتوں کے ہیکل ڈالنے یا نہ ڈالنے کا بھی کوئی خاص اثر نہیں۔ اور نہ پوجا پاٹ کرنے یا نہ کرنے کا۔
نمبر ۷۔ کوئی مشرک و کافر ابنائے جنس کی خدمت یتیموں کی پرورش بیواؤں کی ہمدردی۔ غرض اس
قسم کی بے شمار نیکیاں کرتا ہوا شرک و کفر کی حالت میں مر جائے تو ناری ہوگا۔ انہ من یشرک باللہ
فقد حرم اللہ علیہ الجنۃ و ماواہ النار۔ رہا اس کی نیکیوں کا معاملہ تو اس کا صلہ اس کو دنیا ہی

میں مل جائے گا۔ کشائش رزق۔ کثرت مال و اولاد۔ نیک شہرت۔ ہر دلعزیزی۔ روحانی کلفتوں اور جسمانی آفتوں سے تحفظ۔ اس طرح دنیاوی صلہ کی ہزارہا شکلیں ہو سکتی ہیں۔ علاوہ ازیں آخرت میں ایسے رحمدل مشرک کا عذاب کسی سفاک بے رحم کافر کے مقابلہ میں یقیناً ہلکا ہوگا۔

یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے۔ کہ عالم آخرت میں کوئی نیکی اس وقت تک معتبر نہ ہوگی۔ جب تک توحید و رسالت کے اعتقاد و اقرار کے ساتھ پیش نہ ہو۔ ومن یکفر بالایمان فقد حبط عملہ جہاں تک نجات اخروی کا تعلق ہے۔ کسی مشرک و کافر کی نیکیاں رائیگاں اور ضائع ہیں۔ اور اس کا کوئی وزن نہیں لا نقیم لھم یوم القیامۃ وزنا۔ ان کو ہمیشہ جہنم میں رہنا ہوگا۔ وما ھم بخارجین من النار البتہ دوسرے سنگ دل کفار کے مقابلہ میں نیک خصلت مشرکوں کو عذاب ہلکا ہوگا۔ ان فی الجنۃ درجات وفی النار درجات ولکل درجات مما عملوا

دین الٰہی میں کفر و شرک کا وہی درجہ ہے جو دنیاوی حکومتوں کے خود ساختہ قوانین میں بغاوت کا ہے۔ اگر بغاوت کا محض شبہ اور کسی ظالم حکومت کے خلاف سازش کا صرف الزام کسی نیک دل پاک طینت نوجوان کی جانب سے خدا وندان امن و آزادی کے تمام اعلیٰ جذبات انسانیت و ہمدردی منقطع کرکے ان مدعیان تہذیب و شائستگی کو سنگ دلی و بے رحمی کے جامہ میں پیش کر سکتا ہے۔ اور یہ سنگدلی اور بے رحمی نام نہاد انصاف و قانون کی نظر میں جائز قرار پاتی ہے۔ اور مذہب اور روحانیت کے خلاف کسی مجاہد اعظم کی زبان یا قلم کو حرکت نہیں ہوتی۔ تو پھر عقل و دانش کی رب العالمین جسکی شان الذی یعلم خائنۃ الاعین وما تخفی الصدور ہے۔ اس کے اس عادلانہ فیصلہ پر کہ وہ کسی اقراری باغی کو ہمیشہ کے لئے جہنمی قرار دیتا ہے کس کی مجال ہے جو زبان اعتراض کھولے اور جبکہ جزا و سزا اور قانون مجازات عام ہے۔ فمن یعمل مثقال ذرۃ خیرا یرہ ومن یعمل مثقال ذرۃ شرا یرہ۔ اور اس قانون کی رو سے ہر نیکی یا بدی کی جزا یا سزا ملتی ہے۔ تو ایمان و کفر جو اساس عمل ہیں۔ کیونکر مستثنےٰ قرار پا سکتے ہیں۔ اور اعتقاد کفر و ایمان کو کس بنیاد پر نظر انداز کیا جا سکتا ہے جن تعالےٰ کا ارشاد ہے۔ وما خلقنا السماء والارض وما بینھما باطلا۔ ذالک ظن الذین کفروا فویل للذین کفروا من النار ام نجعل الذین امنو وعملوا الصالحات کالمفسدین فی الارض ام نجعل المتقین کالفجار۔

خلاصہ یہ ہے کہ تمام وہ مسلمان جن کا خاتمہ زندگی عقیدۂ توحید پر ہوا ہے ان کا مآل نجات ہے۔ خواہ ابتدائً ہو یا اپنے گناہوں کی سزا کاٹنے کے بعد۔ اور سارے کافر ناری ہیں۔ اگرچہ ایک پرہیزگار مسلمان کا درجہ

کسی گناہگار مسلمان سے اعلیٰ وارفع ہوگا اور اسی طرح ایک رحمدل نیک طبیعت مشرک کا عذاب بے رحم ظالم کافر کے مقابلہ میں ہلکا ہوگا۔ ھذا

نسأل اللہ سبحانہ وتعالیٰ ان یجعلنا وایاکم ممن اتبع ھداہ ویرفقنا لما یحبہ ویرضاہ واٰخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی خیر خلقہ سیدنا محمد واٰلہ وصحبہ اجمعین۔

(نگار) ان جوابات کو اگر ان کی مختلف ذہنیتوں کے لحاظ سے تقسیم کیا جائے، تو ان کو چار علیحدہ علیحدہ تقسیموں میں جدا کیا جا سکتا ہے۔ ایک وہ ضعیف و کمزور یا مصلحت اندیش ذہنیت جو کسی قسم کا جواب دینا پسند نہیں کرتی، دوسری وہ جسے ہم "مذبذبین" کے نام سے موسوم کر سکتے ہیں۔ تیسری وہ جس کا تعلق "راسخون" سے ہے اور چوتھی وہ جو بالکل غیر جانبدار رہنا چاہتی ہے اور عدم علم کا اعتراف کرتی ہے۔

اول الذکر ذہنیت کی مثال آپ کو صرف ایک مولانا اشرف علی صاحب کے جواب میں نظر آئیگی کہ انھوں نے نہ صرف جواب دینے سے احتراز کیا بلکہ اس کی بھی کوشش کی کہ ان کی شخصیت کا پتہ نہ چلے، کیونکہ نہ اُنھوں نے جواب میں اپنے دستخط ثبت فرمائے اور نہ مقام درج کیا جس سے کچھ سراغ چل سکتا۔ لیکن شاید ان کو یہ معلوم نہیں کہ لفافہ کے اوپر ڈاک خانہ ایک مہر بھی ثبت کر دیتا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اگر یہ صورت نہ ہوتی تو پتہ چلنا مشکل تھا کہ یہ کس بزرگ کی تحریر ہے، کب لکھی گئی اور کہاں سے آئی؟

اس کے بعد جو جواب دیا گیا ہے اس کے الفاظ ملاحظہ فرمایئے کہ:۔

"سوال تنقیح طلب ہے جو تحریر سے خالی از تکلف نہیں۔ ایسے سوال کا جواب زبانی ہو سکتا ہے"

مولانا نے گویا غالب کے انداز میں کوئی اوق شعر تصنیف فرمایا ہے۔ جس کے بعض درمیانی حصے متروک و محذوف ہیں۔ اور اپنے نزدیک ایسا مُسکت جواب دیا ہے کہ شاید ہی اس سے زیادہ کوئی بلیغ جواب فریق ثانی کو اس درجہ تکمیل کے ساتھ ساکت کر سکتا ہو۔

مولانا کا مدعا اس جواب سے غالباً یہ ہے کہ:۔ "اس استفسار یا استفتا پر بعض تنقیحیں (عدالتی نہیں بلکہ دینی و مذہبی) قائم ہونا چاہیئے اور ان تنقیحوں کے قائم کرنے میں انھیں تکلف ہے، تکلیف کا اندیشہ ہے، اس لئے ایسے سوال کا جواب زبانی ہو سکتا ہے"۔ کیونکہ نہ کوئی شخص لکھنؤ سے تھانہ بھون جانیکی زحمت اختیار کرے گا۔ اور نہ مولانا کو جواب دینے کی مصیبت میں مبتلا ہونا پڑے "یہی" وہ ناوک فرمائی ہے، جو سودا کے زمانہ میں صرف "مرغ قبلہ نما" کو تڑپا دیتی تھی، لیکن اب حطیم کعبہ کو متزلزل کر رہی ہے۔

شکر ہے کہ اس ذہنیت کی مثال مجھ کو تمام جوابوں میں صرف ایک ہی ملی اور وہ بھی ایک ایسی ہستی کی طرف سے جو شاید مسائل روزہ و نماز سے زیادہ کسی ایسے استفسار کا جواب دینے کی اہل نہیں ہے۔ جو فلسفۂ مذہب سے متعلق ہو یا جو کسی اصولی گفتگو کی طرح ڈالنے والا ہو۔

باقی تین ذہنیتوں میں سے وہ ذہنیت جس کو میں نے "راسخون" میں داخل کیا ہے یا جدید سیاسی اصطلاح میں قدامت پسند یا کنسرویٹو کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، حسب ذیل حضرات کی طرف سے ظاہر ہوئی ہے:۔

"قاضی صاحب بھوپال۔ مفتی صاحب رام پور۔ مفتی صاحب حیدرآباد۔ مولانا حسین احمد صاحب مفتی دیوبند۔ مولانا نثار احمد صاحب مفتی آگرہ۔ مولانا محمد کفایت اللہ صاحب مولانا احمد سعید صاحب دہلی۔ مولانا محمد عنایت اللہ صاحب فرنگی محلی۔ مولانا سید سلیمان شاہ پھلواروی۔ مولانا عبدالحلیم صاحب صدیقی لکھنؤ۔ مولانا محمد عبدالعزیز صاحب۔ مولانا محمد سجاد صاحب"

ان حضرات نے نہایت صفائی اور پورے رسوخ و یقین کے ساتھ حکم لگایا ہے کہ مسلمان چاہے کچھ کرے بہرحال اُسے ناجی ہونا ہے۔ بشرطیکہ ایمان پر اس کا خاتمہ ہو اور بُت پرست کا فر کتنا ہی اچھے اخلاق کا کیوں نہ ہو اس کا ناری ہونا یقینی ہے۔

غیر جانبدار یا اپنی لاعلمی کا اعتراف کرنیوالی ذہنیت مولانا عبدالستار لاہوری اور مولانا احمد احمدی کے جوابات سے ظاہر ہوتی ہے، اول الذکر نے صاف طور پر لکھا ہے کہ ناری اور ناجی ہونے کے متعلق وہ لب کشائی نہیں کر سکتے اس کا علم مالک الملک کو ہے۔ اسی طرح ثانی الذکر صاحب نے صفائی کے ساتھ لکھدیا ہے کہ اس کو خدا بہتر جانتا ہے کہ کون ناری ہے اور کون ناجی۔

اب صرف ایک جواب مولانا سید سلیمان ندوی کا رہ گیا جس کو میں نے مذبذب ذہنیت کے نام سے موسوم کیا ہے، کیونکہ وہ جواب شروع کرتے ہیں ان الفاظ سے کہ:۔

"دونوں ناری ہیں" اور ختم کرتے ہیں اُس "لیکن" پر جس میں مسلمان کے بخشے جانے اور کافر کے نہ بخشے جانے کا امکان ظاہر کیا ہے۔ ایک شخص کے لئے دشوار ہے کہ ان دونوں رایوں میں سے کس کا اعتبار کرے اور کس کو صحیح جواب خیال کرے۔

یہ تھا ایک سرسری اور مختصر سا جائزہ یا عمومی تبصرہ جو "علماء کرام" کے جوابات پر کیا گیا ہے، لیکن میں کسی قدر تفصیل کے ساتھ اصولی گفتگو اس مسئلہ پر کرنا چاہتا ہوں اور دیکھنا چاہتا ہوں کہ عقل انسانی یا فطرت انسانی جس پر اسلام کی بنیاد کا قائم ہونا بیان کیا جاتا ہے۔ ان جوابات میں سے کس جواب پر مطمئن ہو سکتی ہے یا کسی پر نہیں۔

مولانا ثناء اللہ صاحب لاہوری اور مولانا احمد صاحب احمدی کے جوابات تو قطعاً لائق اعتنا نہیں کیونکہ جب وہ اسلام کی صداقت کے مدعی ہونے کے بعد اس کی پیروی کر رہے ہیں تو ان کا یہ کہنا کہ انھیں علم نہیں کون ناری ہے اور کون ناجی، اس امر کو ظاہر کرتا ہے کہ ان کے نزدیک اسلام سے بہتر کسی اور مذہب کے ہونے کا امکان باقی ہے اور وہ ایک ایسے مسلک کے ماننے والے ہیں جو خود ان کے اندر کوئی کیفیت یقین و رسوخ کی پیدا نہیں کرتا۔ اگر ان سے یہ سوال کیا جائے کہ وہ کیوں مذہب اسلام کو صحیح مذہب مانتے ہیں تو اصولاً وہ یہی جواب دینگے کہ اسلام ان کے نزدیک سب سے بہتر مسلک ہے۔ لیکن اس کے بعد اگر ان سے یہ دریافت کیا جائے کہ کیا اسلام کا بہترین مسلک ہونا ان کے نزدیک اس لئے نہیں ہے کہ اسی پر انسان کی نجات منحصر ہے تو ان کو یہی جواب دینا چاہئے کہ اس کا علم ان کو نہیں ہے۔ حیرت ہے کہ وہ اس عالم ریب و شک میں کس طرح اپنے آپ کو حقیقی معنے میں اسلام کا متبع کہہ سکتے ہیں اور دوسرے کو دعوت اسلام کیونکر دے سکتے ہیں جبکہ خود انھیں اس امر کا یقین نہیں کہ اسلام نجات کا ضامن ہے۔ مجھے مولانا احمد احمدی کے اس جواب پر بہت زیادہ حیرت ہے۔ کیونکہ احمدی جماعت بالکل تبلیغی جماعت ہے اور ظاہر ہے کہ اس صورت میں وہ کسی کو بھی اپنے مسلک کی طرف دعوت دینے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔

مولانا سید سلیمان ندوی کا جواب بھی زیادہ توجہ طلب نہیں، کیونکہ اُنھوں نے کوئی یقینی صورت پیدا نہیں کی۔ اگر وہ صرف دونوں کے ناری ہونے پر حکم لگاتے، تو علیحدہ گفتگو ہو سکتی تھی، لیکن چونکہ اخیر میں انھوں نے یہ ظاہر کیا ہے کہ "ممکن ہے پہلا بخشا جائے اور دوسرا نہیں" اس لئے جو گفتگو راسخون کے جوابات کے سلسلہ میں ہوگی، وہی مولانا ندوی کے فتوٰے کے خلاف پیش کی جا سکتی ہے۔

جیسا کہ پہلے ظاہر کیا گیا ہے۔ منجملہ سولہ حضرات کے بارہ نے پورے وثوق کے ساتھ مسلمان کے ناجی ہونے پر حکم لگایا ہے خواہ وہ کتنی ہی معصیت کرے اور برہمن کے ناری ہونے کا فتوٰے دیا ہے۔ خواہ اسکے اعمال کتنے ہی اچھے کیوں نہ ہوں۔ اس لئے کسی صحیح نتیجہ تک پہونچنے کے لئے بقول مولانا اشرف علی صاحب پہلے چند تنقیحوں کا قائم کر لینا ضروری ہے۔

۱۔ مذہب کا مقصد صحیح کیا ہے؟
۲۔ اخلاق حسنہ کی غایت کیا ہو سکتی ہے؟
۳۔ ناری و ناجی ہونا کسے کہتے ہیں؟
۴۔ خدا اور مذہب کا باہمی تعلق کس قسم کا ہے؟

اگر ہم ان چاروں باتوں کا فیصلہ کر سکے تو ان علمائے کرام کے جوابات پر بھی تنقید کر سکیں گے۔ اور خود

بھی اپنے استفسار کا جواب دے سکیں گے۔ جو ہندوستان کے اتنے حاملین شریعت کے پاس بغرض حصول فتوے بھیجا گیا تھا۔

چونکہ مختلف اوقات میں مختلف مذہبی مباحث کے ماتحت نگار میں ان تمام اُمور پر اس سے قبل کافی گفتگو ہو چکی ہے۔ اس لئے میں زیادہ تفصیل و طوالت سے کام نہ لوں گا۔ بلکہ مختصراً صرف اُنھیں اُمور کو پیش کرونگا جو مسئلہ زیر بحث پر روشنی ڈالنے کے لئے ضروری ہیں۔

تنقیح اول کے متعلق غالباً ساری دنیا کی متفقہ رائے یہی ہے کہ مذہب کا مقصد اصلاح اعمال، تزکیۂ اخلاق اور تصفیۂ نفس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔

اسی طرح تنقیح دوم کے متعلق بھی یہی ایک رائے پائی جاتی ہے کہ اخلاق حسنہ کی غایت صرف یہ ہے کہ انسان، دنیا کے نظام تمدن میں عضو مفید کی حیثیت اختیار کرے، دوسروں کے ساتھ ہمدردی سے پیش آئے، ابنا جنس کے نظام عمرانی میں ایک فرد معاون ہو کر زندگی بسر کرے اور نفسانی و ذاتی اغراض سے شیرازۂ اخوت عامہ کو درہم برہم نہ ہونے دے۔ چنانچہ یہی وہ اصل اصول تھا جس کی بنا پر شریعتیں مرتب ہوئیں، قوانین وضع کئے گئے اور اچھے بُرے افعال کی فہرست ترتیب دے کر عوام کے سامنے گناہ و صواب اور سزا و جزا کی تعیین کی گئی تاکہ جو لوگ حقیقت کو نہیں سمجھتے ہیں، وہ بھی اصل راہ سے منحرف نہ ہوں اور قانونی پابندی سے اُن کی بے راہ روی کو متعذر بنا دیا جائے۔

تیسری تنقیح سب سے زیادہ اہم تنقیح ہے کیونکہ استفتاء میں یہی دریافت کیا گیا تھا اور اسی میں مجھے اکثر علمائے کرام سے اختلاف ہے۔ عام طور پر ناری و ناجی ہونے کا تعلق "حیات بعد الممات" سے سمجھا جاتا ہے۔ یعنی جب انسان مر جائے گا تو جو اعمال دنیا میں اس نے کئے ہیں۔ ان کے لحاظ سے اس کو انعام یا سزا ملے گی اور اس انعام و سزا کو بہشت و دوزخ کی صورت میں پیش کیا جائے گا۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ عذاب و ثواب جسم کے ساتھ ہوگا اور دوزخ میں واقعی سانپ، بچھو، اور آگ کے شعلے ہوں گے اور جنت میں حقیقتاً حوریں، غلمان، باغ اور میوے وغیرہ ہوں گے۔ لیکن بعض کہتے ہیں کہ عذاب و ثواب روحانی ہوگا اور دوزخ و جنت کا بیان صرف تشبیہی و تمثیلی ہے۔

بہر حال وہ انعام و سزا جسمانی ہو یا روحانی، نتیجہ ہے اعمال حسنہ یا افعال سیئہ کا جو اس دنیا میں انسان سے سرزد ہوئے۔ میں اس وقت اس بحث میں نہیں پڑوں گا کہ مرنے کے بعد سزا یا جزا کا مفہوم نتیجہ خیز و قابل یقین امر ہے یا نہیں بلکہ میں اس کو حرف بحرف صحیح ماننے کے بعد ناجی و ناری کے مفہوم پر ایمان لاتا ہوں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ناری و ناجی ہونے کا تعلق علاوہ اعمال حسنہ کے کسی اور چیز سے ہے اور اگر ہے تو کیوں؟

جو کچھ اوپر بیان ہو چکا ہے اس سے لازماً ہر شخص اسی نتیجہ پر پہونچے گا کہ چونکہ مذہب کا مقصودِ اصلی اخلاق حسنہ کی تعلیم ہے، اسلئے ناری و ناجی ہونے کا انحصار صرف اخلاق انسان پر ہونا چاہیئے۔ اگر وہ بُرے ہیں تو ہم کہیں گے کہ وہ ناری ہے اور اچھے ہیں تو حکم لگائیں گے کہ وہ ناجی ہے۔

اس لئے ہمارے علماء کرام کا اُس فاسق و فاجر مسلمان کے متعلق یہ حکم لگانا کہ بہرحال وہ ناجی ہے اور اُس خوش اخلاق برہمن کی نسبت یہ فتویٰ صادر کرنا کہ وہ کچھ کرے نجات اُس کی ممکن نہیں، یقیناً متذکرہ بالا اُصول سے علیحدہ کسی اور اصول پر مبنی ہوگا اور وہ اصول کیا ہو سکتا ہے؟

میں نے جہاں تک غور کیا معلوم ایسا ہوتا ہے کہ علماء کرام نے مذہب اسلام اور اخلاق حسنہ کو علیحدہ علیحدہ دو چیز قرار دیا ہے۔ اور ان کے درمیان جو نسبت پائی جاتی ہے وہ اس طرح ہے کہ ان دونوں کا اجتماع بھی ممکن ہے اور افتراق بھی یعنی ہو سکتا ہے کہ ایک شخص مسلمان ہو۔ لیکن اخلاق حسنہ نہ رکھتا ہو، اور یہ بھی ممکن ہے کہ کسی میں اخلاق حسنہ موجود ہوں، اور وہ مسلمان نہ ہو، یعنی اصل چیز ان کے نزدیک اخلاق انسانی نہیں بلکہ محض مسلمان ہونا ہے، خواہ اُس کے اعمال کیسے ہی خراب کیوں نہ ہوں؟

اب یہاں سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر محض مسلمان ہونا ہی نجات کا ضامن ہے اور انسان کے اچھے اعمال کوئی چیز نہیں ہیں تو پھر اسلام کا مقصد کیا ہے؟ اور اسلام کس چیز کا نام ہے؟

جن علماء کرام نے بدکار مسلمان کے ناجی ہونے اور نکوکار برہمن کے ناری ہونے پر حکم لگایا ہے وہ گویا بہ الفاظ دیگر اس بات کے معتقد ہیں کہ محض خدا کی وحدانیت اور رسول کی رسالت کا اقرار کرلینا یا یوں کہئیے کہ اُن کی مقرر کی ہوئی دایان مجمل و مفصل کی عبارت کو ایک اشلوک کی طرح پڑھکر اعتقاد کرلینا کافی ہے اور کائنات میں انسان کا وجود صرف اس لئے ہے کہ وہ ان چند الفاظ کو یاد کرلے، کیونکہ خدا اور اُس کی خدائی کائنات اور اُسکا جملہ نظام عبارت ہے، انھیں دو سطروں کے حفظ کرلینے سے۔

اگر حقیقتاً اسلام یہی ہے اور اس کی تمام تعلیمات کا خلاصہ صرف اسی قدر ہے تو ہم کو تنقیح چہارم کا پہلے فیصلہ کرلینا چاہئیے کہ خدا اور مذہب کا باہمی تعلق کیا ہے، یعنی خدا کو مذہب کی ضرورت ہے یا نہیں اور اگر ہے تو کیا وہ ضرورت صرف ایک شخص کے اپنے آپ کو مسلمان کہنے سے پوری ہوجاتی ہے۔

یہ مسئلہ میرے نزدیک زیادہ پیچیدہ نہیں ہے، کیونکہ خود انھیں علماء کرام کے اعتقاد کے موافق خدا کی ذات بے نیاز ہے اور وہ ہماری عبادت، ہماری نیائش بلکہ خود ہماری اور ساری کائنات ہستی کی طرف سے بالکل ایسا ہی بے پروا ہے جیسا کہ وہ حالت انعدام کی طرف سے ہو سکتا ہے۔ نہ آفرینش سے اسے کوئی غرض البتہ ہے نہ ہلاکت و فنا سے۔ اس لئے اگر عالم کو پیدا کیا تو اس طمع و غرض سے نہیں کہ کوئی اُس کا نام لے گا اور اگر وہ سب کو

تباہ و برباد کردے تو اس کو کوئی نقصان نہیں پہونچ سکتا۔ اگر وہ ہمارے انسانی بادشاہوں اور رئیسوں کی طرح نہیں ہے تو نہ اُس میں جذبۂ انتقام کی پرورش ہوتی ہے نہ جذبۂ استحسان کی، کوئی عمر بھر اگر اُس کی عبادت کرے تو وہ اپنے اُصول کو بدلنے والا نہیں۔ اور اگر کوئی ہر وقت اُسے گالیاں دے تو اس سے متاثر نہیں ہوتا۔ اس لئے اب سوال نہ اصطلاحی عبادت کا رہا، نہ اصطلاحی کفر کا، اور اسی کے ساتھ یہ بھی واضح ہوگیا کہ ہماری عبادتیں اگر حقیقتاً کسی غرض سے والبستہ ہوسکتی ہیں، تو وہ خدا سے متعلق نہیں ہے بلکہ خود ہماری فلاح و بہبود سے تعلق رکھتی ہے اور اس کا اثر ہماری ہی دنیاوی زندگی پر پڑنا چاہیئے، دنیاوی زندگی کی تخصیص میں نے اس لئے کی کہ اُخروی زندگی کے ماننے کے لئے کوئی معقول وجہ موجود نہیں ہے، اور سمجھ میں نہیں آتا کہ خدا کیوں اس سلسلہ کو قائم رکھے اور اس سے حیات انسانی، و تمدن انسانی کو کیا فائدہ پہونچ سکتا ہے، جبکہ بقول مقتدایان مذہب دوبارہ عالم آب و گل میں لوٹ کر آنا نہیں ہے اور جزا سزا نتیجہ کے لحاظ سے بالکل بیکار چیز ہو جاتی ہے۔ سزا و جزا کا مدعا یہ ہے کہ ایک شخص آئندہ ایک فعل سے احتراز کرے اور دوسرے کو اختیار۔ لیکن جب اس کی کوئی صورت باقی نہیں رہتی ہے اور دار العمل ختم ہو جاتا ہے تو سزا و جزا محض ایک لایعنی شے ہو کر رہ جاتی ہے۔ بہرحال جو صورت بھی ہو یہ بالکل یقینی ہے کہ خدا سے ہماری عبادت و نافرمانی کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ یعنی خدا اس سے متاثر نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کا اثر خود ہمارے اوپر ہوتا ہے۔ اور وہ اثر فلاح و بہبود یا ہلاکت و زوال کے سوا کچھ نہیں۔

اب غور طلب امر یہ ہے کہ ہمارے علماء کرام کے اس فتوے دینے کا سبب کیا ہے اور اُنھوں نے کیوں اعمال حسنہ کو تنہا ذریعۂ نجات قرار نہیں دیا۔ اس کے لئے آئیے سب سے پہلے قرآن میں جستجو کریں کہ اس میں امر کا کیا فیصلہ کیا گیا ہے، کیونکہ اس کے فیصلہ سے علماء کرام کو بھی انکار نہیں ہوسکتا۔

قرآن میں جہاں کہیں ایمان و اسلام کا ذکر آیا ہے وہیں اعمال صالحہ کو بھی اس کے ساتھ لازم کر دیا ہے اور بغیر افعال حسنہ کے ایمان کا کوئی مفہوم قرار نہیں دیا گیا۔ کثرت سے اس مفہوم کی آیات قرآن میں موجود ہیں مثلاً چند یہاں پیش کیجاتی ہیں:۔

" انما المومنین اخوۃ فاصلحوا بین اخویکم۔ یعنی مومنین کی پہچان یہی ہے کہ وہ آپس میں ایک دوسرے کو بھائی سمجھیں اور باہمدگر امن و صلح صلاح و فلاح کی زندگی بسر کریں۔

فمن یعمل مثقال ذرۃ خیرا یرہ۔ ومن یعمل مثقال ذرۃ شرا یرہ۔ یعنی جو کوئی (خواہ وُہ کسی ملک و قوم کا ہو) ذرہ برابر نیکی کرے گا اُس کا نتیجہ دیکھ لیگا اور جو کوئی ذرہ برابر بدی کریگا اس کا نتیجہ پائے گا۔

ان اللّٰہ لا یغیر ما بقوم حتیٰ یغیروا ما بانفسھم۔ یعنی اللہ کسی قوم کی حالت میں کوئی تبدیلی

نہیں کرتا۔ جبتک وہ خود اپنے اندر بُری یا بھلی کوئی تبدیلی نہ پیدا کرے۔

ان اللہ لا یظلم الناس شیئاً ولکن الناس انفسھم یظلمون۔ بلکہ اللہ کسی پر ظلم نہیں کرتا بلکہ خود انسان ہی اپنے اوپر ظلم کرتا ہے۔"

الغرض یہ اور اسی قسم کی آیات سینکڑوں کی تعداد میں ایسی پائی جاتی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ ایمان کا مفہوم ہی عمل صالح ہے چنانچہ ایک جگہ صاف صاف ارشاد ہوتا ہے کہ:۔

"ومن الناس من یقول امنا باللہ و بالیوم الاخر وما ھم بمومنین۔ یعنی بعض ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں ہم اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لائے درآنحالیکہ وہ مومن نہیں ہیں۔

کیوں؟ اسلئے کہ ان کے اعمال اچھے نہیں ہیں، اور اُن کے اخلاق بُرے ہیں۔ پھر کیا اس آیت کے ماتحت وہ مسلمان جس کا ذکر میں نے اپنے استفتا میں کیا ہے۔ ایمان سے خارج نہیں ہوجاتا اور اسکو ناری نہیں کہہ سکتے۔

اسی طرح کثرت سے کلام مجید میں اعمال و نتیجۂ اعمال کے فلسفہ کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ:۔

"لیس للانسان الا ما سعی۔ یعنی انسان کو اتنا ہی ملیگا، جتنی اُس نے کوشش کی ہے اور وہی ملیگا جو اس کے عمل کا اقتضاء ہے۔"

پھر کیا اس اصول کے ماتحت وہ برہمن اپنے اعمال حسنہ کا اجر نہ پائے گا اور وہ مسلمان اپنے افعال سیٔہ کی سزا کا مستوجب نہ ہوگا اور کیا اس اجر و سزا کو ناجی و ناری کے الفاظ سے تعبیر نہیں کر سکتے۔

اس مسئلہ میں سب سے بڑی اُلجھن جس چیز نے پیدا کر دی ہے وہ شرک و توحید یا کفر و اسلام کی تفریق ہے۔ چونکہ مشرک و کافر کے لئے قرآن میں جابجا ناری ہونے کی وعید آئی ہے، اور مشرک و کافر کا مفہوم بُت پرست یا غیر مُسلم قرار دیدیا گیا ہے، اس لئے ایک مولوی نہایت آسانی کے ساتھ ایک غیر مذہب والے کے ناری ہونے پر فتوےٰ صادر کر دیتا ہے خواہ اُس کے اعمال کتنے ہی پاکیزہ کیوں نہ ہوں۔

میرے نزدیک کفر و اسلام یا شرک و توحید کا مفہوم ہی ان لوگوں نے بالکل غلط سمجھا ہے۔ جسطرح توحید کے معنے زبان سے خدا کو ایک کہدینے کے نہیں ہیں اسیطرح شرک کے معنے بت پرستی کے بھی نہیں ہیں۔ میں اس سے قبل اس مسئلہ پر نگار میں کافی بحث کر چکا ہوں لیکن مختصراً یہاں بھی اسکا اظہار کئے دیتا ہوں کہ توحید سے مقصود خدا کو ایک کہلانا نہیں، کیونکہ ایک کی نسبت بھی اسکی شان کے منافی ہے۔ بلکہ ایک سے مراد اس کو کل سمجھنا ہے اور اپنے آپ کو بھی اسی کل کا جزو قرار دے کر تمام قوائے عمل سے کام لیکر تمام ان مدارج ارتقاء کو طے کرنا ہے جو اُس کل یا قدرت نے سعی و عمل کے لئے مخصوص کر دیئے ہیں۔ چونکہ بُت پرست اقوام، یعنی وہ قومیں جو تمام کاموں کا انحصار بتوں کی خوشنودی پر رکھتی ہیں، رفتہ رفتہ اپنے تمام عزائم و قوائے کاسبہ کو مضمحل بنالیتی ہیں اس لئے رفتہ رفتہ انسانی عمران و تمدن کو تباہ

جلد ۱۹ فہرست مضامین ماہ فروری ۱۹۳۱ء شمارہ ۲

نگار

اڈیٹر: نیاز فتحپوری

جلد ۱۹ فروری سنہ ۱۹۳۱ء شمار (۲)

ملاحظات

گزشتہ ماہ کی مصروفیت اور نگار کے صفحات کی تنگی نے اس کی بھی اجازت نہ دی کہ میں شائع شدہ مضامین کے متعلق کوئی تحریر بطور تعارف یا تقریب پیش کرسکتا۔ اس ماہ کی اشاعت میں ملاحظات کو وہیں سے شروع کرتا ہوں۔

گزشتہ ماہ کے رسالہ میں پہلا مضمون فراست التحریر پر جناب یامین ہاشمی ایم۔اے کا ہے جنھوں نے عرصہ تک اس فن کا مطالعہ کیا ہے۔ ہرچند یہ مضمون اس قدر مکمل و مفصل نہیں ہے کہ ایک متعلم کے تمام مشکلات اس سے حل ہوجائیں، لیکن جو کچھ اصولاً بیان کردیا گیا ہے وہ ضرور اس حد تک کافی ہے کہ ایک شخص ان پر کاربند ہوکر خود نتائج تک پہونچنے کا اہل ہوسکتا ہے۔ جب جنوری کا پرچہ مکمل ہوچکا تو میں نے محسوس کیا کہ اگر انگریزی رسم خط کے متعلق بھی اس فن کے اصول کی مثالیں دیکر واضح کردیا جاتا تو بہتر ہوتا کیونکہ انگریزی زبان کی مقبولیت کا اقتضا یہی تھا اور اسی بنا پر میں نے اعلان کردیا تھا کہ فروری کے نگار (یعنی اس اشاعت میں) اس کو بھی شائع کردیا جائے گا۔ لیکن چونکہ وہ بھی کم و بیش اتنی ہی ضخامت کا ہوگیا ہے جتنا اردو فراست التحریر کا مضمون ہے، اس لئے مناسب یہی معلوم ہوا کہ اس کو علیحدہ چھپوا کر ان دونوں کو باہم ملا دیا جائے اور کتابی

صورت میں پیش کردیا جائے تاکہ لوگوں کو مطالعہ و اخذ نتائج میں سہولت ہو۔ امید کیجاتی ہے کہ اپریل کے اخیر تک یہ کتاب طبع ہو کر شائع ہو جائے گی۔

جو فسانہ "داستان حسن و عشق" کے عنوان سے شائع ہوا ہے وہ میرا طبع زاد نہیں ہے بلکہ تھیوفائل گائٹر (THEOPHILE GAUITER) کے فسانہ "قلوبطرہ کی ایک رات (ONE OF CLEOPATRA'S NIGHT) بہت کچھ حذف و اضافہ کے بعد لیا گیا ہے۔

"علمائے کرام کا نظریۂ دینی" عرصہ سے ملتوی ہوتا چلا آ رہا تھا اس لئے جنوری میں اس کو شائع کر دیا گیا۔ اور آخرکار وہ خلش دور ہو گئی جو اس مجموعۂ فتاوے کی عدم اشاعت سے میرے دل کو بے چین بنائے ہوئے تھی۔

اخیر میں خواب و خیال کے عنوان سے جو فسانہ جناب مجنوں گورکھپوری کا شائع ہوا ہے۔ وہ اُن کے گزشتہ افسانوں کے لحاظ سے لقیناً فروتر ہے، اور سوائے اس کے کہ اس میں فسانہ نویسی سے متعلق حقیقت نگاری کی طرف زیادہ توجہ کی گئی ہے اور کوئی خاص بات نہیں ہے، البتہ اُن کا وہ تشائم رنگ جس میں جوش محبت کے ساتھ الجھن، مایوسی، سردولی، صبر و ضبط وغیرہ سب کچھ ملا ہوتا ہے۔ ضرور اس میں بھی نمایاں ہے۔

بعض احباب نے اسکے پلاٹ کو مخرب اخلاق اور شرمناک ظاہر کیا ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں میں جن کے یہاں بہت سے اصول اخلاق کی بنیاد، ہندوؤں کے اصول معاشرت اور اُن کے رسم و رواج پر قائم ہوئی ہے، اس خیال کا پیدا ہونا مستبعد نہیں ہے، لیکن اگر محض حقیقت کی نگاہ سے اس پلاٹ کے امکان پر غور کیا جائے تو اس میں بھی صرف وہی باتیں مخرب اخلاق رہجاتی ہیں جو تمام عشقیہ فسانوں میں پائی جاتی ہیں۔ محض اس فسانہ کو خصوصیت کے ساتھ ایسا کہنا میری سمجھ میں نہیں آتا۔ علاوہ اس کے اگر تنقید کے اس اصول پر غور کیا جائے کہ "ایک مضمون اچھا لکھا ہوتا ہے یا بُرا اخلاقی یا غیر اخلاقی کچھ نہیں" تو پھر اس نقطۂ نظر سے دنیا کی کسی کتاب کو مخرب اخلاق نہیں کہہ سکتے۔ اگر اس سے مقصود واقعی اخلاق کی تعلیم دینا نہیں ہے۔

جنوری کا نگار شائع ہو چکا تھا کہ مولانا محمد علی کے واقعۂ ارتحال کی خبر ہندوستان آئی صبح کا وقت تھا، میں بیٹھا ہوا بعض ضروری خطوط کا جواب لکھ رہا تھا کہ میرے کانوں میں یہ صدا آئی اور میں وہیں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ مولانا محمد علی کیا چیز تھے۔ کن خصوصیات کے حامل تھے۔ انھوں نے ملک، قوم کی کس قدر گرانمایہ خدمات انجام دیں۔ ان سب کا علم اخبارات کے ذریعہ سے ان لوگوں کو بھی ہو چکا ہے جو ان سے واقف

نہ تھے۔ اس لئے میں ان کا اعادہ و تکرار مناسب نہیں سمجھتا، اور یہ سطریں محض اس صدمہ کے اظہار میں لکھ رہا ہوں جو اس فقدان عظیم کی وجہ سے نہ صرف اسلامی ہند بلکہ سارے ہندوستان کو پہونچا ہے۔ مولانا محمد علی کی صحافی و رہنمایانہ زندگی کا کوئی لمحہ ایسا نہیں گذرا جسے ہندوستانی سیاسیات کے تار و پود سے علیحدہ کیا جا سکے۔ وہ ایثار و قربانی، حریت رائے، آزادی فکر، قوت عمل، اور حب قوم کا مجسمہ تھے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اس سے زیادہ ثبوت ان کی وطن پرستی کا اور کیا ہو سکتا ہے کہ اسی جذبہ کے ماتحت آخر کار اُنھوں نے جان ہی دیدی۔

اس میں شک نہیں کہ ہمیں ان کے بعض اصول کار سے اختلاف تھا اور ہمکو یقین ہے کہ اگر وہ اپنی بعض کمزوریوں کی وجہ سے (جن سے کوئی انسان خالی نہیں) اپنے جادۂ اولین سے انحراف نہ کرتے تو وہ ملک و قوم کے لئے بہت زیادہ مفید ثابت ہوتے، لیکن اُنکے خلوص و صداقت کو ایک لمحہ کیلئے بھی مشتبہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اور اس لئے اگر اُن سے کوئی غلطی بھی ہوئی ہو تو ایک مجتہد کی غلطی کی طرح ثواب سے خالی نہیں ہو سکتی۔

مولانا مرحوم کی صحت و تندرستی ایک زمانہ سے خراب تھی اور اُن کو اچھی طرح معلوم تھا کہ وہ موت سے قریب تر ہوتے جا رہے ہیں، لیکن اُنکے مردانہ عزائم اور دلیرانہ جوش عمل میں کبھی کوئی لغزش پیدا نہیں ہوئی، اور اپنی صحت و توانائی یا راحت و آسائش کی طرف فرض کی حد تک بھی کبھی توجہ نہیں ہوئی۔ اس لئے اگر یہ دعوی کیا جائے کہ وہ مسلمانوں کی جماعت میں گل سرسبد کی حیثیت رکھتے تھے تو غالباً بیجا نہ ہوگا اور اس لئے ہندوستان اس فقدان کے ساتھ اس صدمہ کو بھی کبھی برداشت نہیں کر سکتا کہ وطن پہ فدا ہو جانیوالی ہستی کی خاک سے بھی وطن کو محروم رکھا گیا۔ یہ درست ہے کہ اعتقادی نقطۂ نظر سے بیت المقدس ان کے لئے بہترین آرامگاہ ہو لیکن ہمیں اس کے ماننے میں تامل ہے کہ اُنھوں نے خود وصیت یہی کی تھی، یا تو ان کو وہیں یورپ میں دفن ہونا چاہیئے تھا تاکہ وہاں آزادی ہند کی ایک یادگار قائم ہوتی یا پھر آغوش ہند میں ان کی مٹی کو سپرد کرنا چاہیئے تھا، جس کے لئے اُنھوں نے جان دی۔

خیر وہ تو جو کچھ ہونا تھا ہو چکا۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ کون سی یادگار ہو سکتی ہے، جسکو صحیح معنے میں مرحوم سے منسوب کیا جا سکے۔ اور اس کے قیام کے لئے ملک کس حد تک طیار ہے۔ ابھی تک اجتماعی حیثیت سے کوئی فیصلہ اس امر کا نہیں کیا گیا اور اس لئے ابھی رائے زنی کا وقت نہیں ہے، لیکن جہاں تک ہماری خواہش کا تعلق ہے، ہم اس یادگار کا قیام مادی و روحانی دونوں طریق پہ دیکھنا چاہتے ہیں، روحانی سے مراد کسی ایسی تحریک کی تاسیس ہے جو تربیت عقول و اذہان کے لحاظ سے مرحوم کے مقصد زندگی کو پورا کرنے والی ہو۔

اور مادی سے مقصود کوئی ایسی تعمیر ہے جو بصیرت کے علاوہ بصارت انسانی کو بھی ان کی یاد دلاتی رہے۔ امر اول کے لئے بہترین طریقہ یہ ہے کہ جامعہ ملیہ دہلی سے متعلق ایک کلیہ محمد علی کے نام سے قائم کیا جائے اور امر دوم کی نسبت میری رائے یہ ہے کہ اسی کلیہ میں مرحوم کا ایک مجسمہ قائم کیا جائے۔ جامعہ ملیہ والے تو غالباً اس کو بخوشی قبول کر لیں گے، لیکن مولویوں کی طرف سے ضرور اندیشہ ہے کہ شاید وہ مجسمہ کے قیام کو جائز نہ سمجھیں بہرحال قیام یادگار کی جو صورت بھی تجویز کیجائے اس میں ان دونوں پہلوؤں کا لحاظ ہمارے نزدیک ضروری ہے۔ اس طرح نہ سہی کسی اور طرح سہی۔

ہندوستانی اکاڈیمی اور اُسکے رسالۂ تماہی کے متعلق نگار میں جو اظہار خیال کیا گیا تھا، وہ آخرکار بیکار ثابت نہ ہوا اور دسمبر ۳۰ء کے رسالۂ زمانہ میں انتہائی پیچ و تاب کے ساتھ (مہر دو منشی) یا نرائن نگم و پریم چند صاحبان نے دل کی بھڑاس نکال ہی لی۔

فریاد از تطاول مشکیں کمند تو!

ان دونوں حضرات نے جواب کا جو پہلو اختیار کیا ہے وہ خلاف توقع نہیں، میں یہ جانتا تھا کہ وہ اس بحث میں زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتے ہیں کہ صرف میری ذات کو اپنی "اردو دانی" کا ہدف قرار دیں اور خدا کا شکر ہے کہ اس طرح میرے وہ تمام اعتراضات اپنی جگہ ابتک قائم ہیں جنکا تعلق "اصول کار" سے ہے اور جس سے میرے ان دونوں دوستوں نے مطلقاً بحث نہیں کی۔

مینے ترقی اردو کے متعلق زبان کو سہل و دشوار بنانے پر اپنی رائے کا اظہار کیا لیکن اس کا کوئی جواب نہ دیا گیا مینے یہ دریافت کیا کہ گالسورردی کے ڈراموں کو اردو میں منتقل کرنیکے لئے کیوں کسی مسلمان کو تجویز نہ کیا گیا، اسکا جو جواب دیا گیا ہے اسمیں غلط بیانی سے بھی کام لیا گیا اور مغالطہ سے بھی۔ غلط بیانی تو یہ ہے کہ اس مسئلہ کا طے ہونا میری موجودگی میں ظاہر کیا ہے، جو بالکل خلاف حقیقت ہے اور مغالطہ یہ کہ اس تجویز کو بغیر نام ظاہر کئے ہوئے ایک سربرآوردہ مسلم کیطرف منسوب کیا۔ درآنحالیکہ میرا کہنا یہ تھا کہ خود جناب نگم اور جناب رواں نے کیوں اس بار کو اپنے سر لیا، علیٰحدہ اور میرے بہت سے اعتراضات تھے جنکی طرف توجہ نہیں کی گئی۔

معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں حضرات نے میرے مضمون کے صرف اس حصہ کو سامنے رکھکر جواب دیا ہے جس میں انکی ادبیت یا اردو دانی کا ذکر ہے اور ظاہر ہے کہ وہ اسکے جواب میں یہی کہہ سکتے تھے کہ "معترض خود نامعقول و نالائق ہے۔" لیکن میں نہایت ادب سے دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ کیا میری نااہلی ثابت کرنیکے بعد وہ اپنے آپ کو اہل ثابت کر سکتے ہیں۔ میں نے کبھی نہ اپنی ادبیت کا دعویٰ کیا اور نہ کسی علم و فضل سے منسوب کیا، ہاں میں نگار میں

ظاہر کرچکا ہوں کہ میری حیثیت صرف ایک طالب علم کی سی ہے اور مجھ میں کوئی خصوصیت قابل ذکر نہیں اسلئے میں حیران ہوں کہ ان دونوں حضرات نے میرے جہل کا ذکر کرکے مجھ پر کس جدید انکشاف کا اظہار کیا اور وہ کونسی نئی بات اُنھوں نے بتائی جو مجھے یا دنیا کو معلوم نہ تھی۔

لفظ تباہی کے متعلق پروفیسر صدیقی کی تحریک کو سبب جواز قرار دیتے ہوئے جناب صدیقی کے علم و فضل اور ولایت جاکر اُنکے عربی ڈگری حاصل کرنیکا بیان ناحق کیا کیونکہ لندن کیا ایک شخص مکہ سے واپس آنے کے بعد بھی کسی خاص امتیاز کا مالک نہیں ہوسکتا اگر اس میں اہلیت نہیں ہے۔

میں اسکے ماننے کیلئے تیار ہوں کہ جناب صدیقی بہت فاضل شخص ہیں لیکن نہ اسوجہ سے کہ وہ لندن کی زیارت کرآئے ہیں، بلکہ صرف اسلئے کہ انکو زمانہ کی نبض شناسی کا کافی سلیقہ حاصل ہے اور وہ تجویز تباہی سے بھی زیادہ قوی ثبوت اپنی اس رفر شناسی کا دے سکتے ہیں۔

جناب نگم نے ایک جگہ یہ بھی فرمایا ہے کہ ترجمہ کا کام اگر کسی کو دیا جاتا تو ظاہر ہے کہ نظر انتخاب انٹرنس سے زیادہ انگریزی لیاقت رکھنے والوں ہی کیطرف اُٹھتی۔ اور یہ ظاہر ہے کہ انٹرنس سے زیادہ قابلیت رکھنے والوں میں سوائے جناب نگم اور جناب رواں کے دوسرا کوئی ہو ہی نہ سکتا تھا۔ دراںحالیکہ حقیقت یہ ہے کہ محض قابلیت کا سوال ڈگری سے کوئی واسطہ نہیں رکھتا اور اکثر ایسا دیکھا گیا ہے کہ محض وسعت مطالعہ سے ایک شخص بڑی سی بڑی ڈگری رکھنے والے پر فوقیت رکھتا ہے۔

چونکہ جناب نگم اور پریم چند نے میرے ایک اعتراض کا بھی جواب نہیں دیا اس لئے مجھے بھی زیادہ تفصیل سے کام لینے کی ضرورت نہیں، لیکن مختصراً جناب پریم چند کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ باوجود اس دعائے کہ اُردو کو عربی فارسی الفاظ سے معرا کیا جاسکتا ہے اپنے تین صفحات کے مضمون کی ہر سطر میں تقریباً ۲-۳ الفاظ عربی فارسی کے انھوں نے استعمال کئے ہیں اور باوصف اس پندار کے کہ وہ اپنے آپکو اردو کا زبردست ادیب سمجھتے ہیں انھوں نے اپنے اس مختصر سے مقالہ میں ایک درجن سے زیادہ غلطیاں ایسی کی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ باایںہمہ کہنہ مشقی اب تک بہت سے عربی فارسی الفاظ کے صحیح مفہوم سے بھی آگاہ نہیں ہیں۔ اور یہیں سے میرے اُس اعتراض کی حقیقت واضح ہوجاتی ہے جو اس سے قبل کی اشاعتوں میں کیا گیا تھا۔

زمانہ کے اسی رسالہ میں جناب اثر لکھنوی کے ایک مضمون سے معلوم ہوا کہ منشی پریم چند نے آتش کی شاعری پر بھی علی الرغم جناب اثر کچھ اعتراضات وارد فرمائے ہیں۔ جناب اثر نے دو تین اعتراضوں کی عبارت بھی درج کی ہے جسکو دیکھنے کے بعد "اندکے طبیب ہم ہستم" کا لطیفہ یاد آگیا اور دیر تک اس سے میں لطف اندوز ہوتا رہا۔

اے وقت تو خوش کہ وقت ما خوش کردی

رسالۂ زمانہ میں جناب نگم نے مسٹر پریم چند کی اور پریم چند صاحب نے مسٹر نگم کی باہمدگر تعریف و ثنا کر کے جس خوبی کے ساتھ خدمت زبان اور زباندانی کو اپنے مخصوص دائرہ کے اندر محدود کر دیا ہے، اُس کی داد دینا یقیناً میرے اختیار سے باہر ہے۔ اسکا پورا لطف اگر کوئی اٹھا سکتا ہے تو وہ ڈاکٹر صدیقی ہیں جنھوں نے لفظ تباہی کی اختراع سے بہترین ماہر لسانیات ہونیکا ثبوت دیا ہے یا پھر وہ کوئی "مشہور مسلمان ادیب" ہوسکتا ہے جس کی شرکت میں پریم چند صاحب کا نولکشور کی اردو ریڈریں تیار کرنا ظاہر کیا جاتا ہے۔

جناب نگم نے میرے انداز تحریر پر اظہار غم و غصہ کرتے ہوئے یادش بخیر ہمعصر سرفراز لکھنو کی بھی شہادت اپنی تائید میں پیش کی ہے۔ ظاہر ہے کہ زمانہ کو سرفراز سے زیادہ معتبر شہادت میری مخالفت میں اور کس کی مل سکتی تھی۔ اور پھر کون ہے جو اس الہامی گواہی کے بعد مجھے قابل دار نہ قرار دیگا، لیکن میں پھر وہی عرض کرونگا جو ابھی کہہ چکا ہوں کہ سوال نہ میری نامعقولیت کا ہے اور نہ میری قابل نفرت طرز تحریر کا۔ بلکہ گفتگو تو اسمیں ہے کہ ہندوؤں کی طرف سے جو نمونے اس زمانہ میں اردو کے پیش ہو رہے ہیں وہ کس حد تک قابل قبول ہیں۔ اگر نگاری اسکول (بقول سرفراز) کی روش کو پسند نہیں کیا جا سکتا تو سرفرازی اسکول کیا بُرا ہے۔ اسی کو اختیار کیا جائے مدعا تو صرف یہ ہے کہ بجائے عام فہم عربی فارسی الفاظ کے سنسکرت کے ثقیل الفاظ کیوں استعمال کئے جاتے ہیں، اور علمی و تنقیدی مضامین میں اگر عربی کے ثقیل الفاظ کہیں کہیں آجائیں تو انکو برداشت کرنا چاہیئے جسطرح ہندی کے علمی مضامین میں سنسکرت کی اصطلاحات کا استعمال آزادی سے کیا جا رہا ہے۔ میرے اس سوال کے جواب میں اصل مسئلہ پر گفتگو کرنیکے بجائے صرف مجھے اور میری طرز تحریر کو بُرا کہدینا میں نہیں سمجھ سکتا کہ کس حد تک قرین سنجیدگی و انصاف ہے، اس گفتگو کا موقعہ تو اسوقت تھا جب میں کسی خاص طرز تحریر پر زور دیتا۔ میں نے تو ایک عام اُصولی گفتگو کی تھی اور اس کا جواب بھی اسی طرح اصولی ہونا چاہیئے تھا۔ مجھے آپ لاکھ بار بُرا کہیئے، میں بُرا نہیں مانتا کیونکہ حقیقتاً میں بُرا ہوں۔ لیکن خدا کیلئے وہ ترکیب مجھے بھی بتا دیجئے کہ دوسروں پر نکتہ چینی کرنے سے خود اپنا فضل و کمال کیونکر ثابت ہو سکتا ہے۔

اسی اُردو ہندی کے سلسلہ میں جناب افسر میرٹھی نے جو تجویز ہمعصر لیڈر میں شائع کی ہے وہ یقیناً بہت مناسب ہے۔ اب سے کئی ماہ قبل میں خود اس خیال کو ظاہر کر چکا ہوں کہ مسلمانوں کو ہندی زبان سیکھنا ضروری ہے اگر وہ چاہتے ہیں کہ ہندو اردو زبان کی اہمیت سے واقف ہوں۔ اگر سررشتۂ تعلیم نے جناب افسر کی اس تجویز کو قابل عمل قرار دیکر ابتدائی و ثانوی مدارس میں اُردو ہندی دونوں کو ضروری قرار دیا تو بہت سی الجھنیں بڑی حد تک دور ہو سکتی ہیں۔ اور زبان کی سہولت و اشکال کا مسئلہ بھی بڑی حد تک صاف ہو جاتا ہے۔ لیکن ہمکو معلوم ہے کہ جناب افسر کی یہ مبارک تحریک کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اور اسکی مخالفت کرنیوالے خویش و بیگانہ بہت سے پیدا ہو جائیں گے۔

میں نے اسی اشاعت میں کسی دوسری جگہ ایک مختصر مضمون کی صورت میں زیادہ وضاحت کے ساتھ ظاہر

کیا ہے کہ ہندو مصنفین اُردو کو کیا چیز بنا رہے ہیں اور پریم چند صاحب نے نولکشور پریس کو ریڈروں کو جس ذہنیت کے ماتحت تیار کیا ہے وہ کیا بلا ہے؟

گزشتہ چند ماہ کے اندر جو جدید رسائل رونما ہوئے ہیں ان میں ایک سابق العہد رسالہ حریم ہے۔ جو یہیں لکھنؤ سے ہمارے عزیز دوست محمد نسیم انہونوی کے اہتمام اور ایک خاتون "آنسہ جمال" کی اڈیٹری میں شائع ہو رہا ہے۔ اس وقت تک اسکے دو پرچے نکل چکے ہیں، اور انکی ترتیب و تہذیب کو دیکھتے ہوئے ہر شخص بہ آسانی اس کے شاندار مستقبل پر حکم لگا سکتا ہے۔ کیا بہ لحاظ کتابت و طباعت، کیا بہ لحاظ تصاویر و ترتیب، رسالہ نہایت پاکیزہ، دلکش اور مفید ہے۔ افسانے، نظمیں، معلومات، اور تدبیر منزل کے متعلق تمام مقالات اچھے ذوق اور سنجیدہ انتخاب کا ثبوت دیتے ہیں اور یقین کیا جاتا ہے کہ نہ صرف طبقۂ خواتین بلکہ طبقۂ رجال میں بھی یکساں دلچسپی کے ساتھ اسکا خیر مقدم کیا جائے گا۔ ہمارے نسیم صاحب چونکہ بہت محنتی اور مستقل مزاج انسان ہیں، اسلئے انکی کوششوں اور حوصلوں کو دیکھتے ہوئے اس رسالہ کے بقاء و تحفظ اور عروج و ترقی کے متعلق پیشین گوئی کرنا بے محل نہ ہوگا۔

دوسرا رسالہ یادش بخیر (ہندستانی) وہ تماہی جریدہ ہے جو سرزمین ترتیبی سے نکلنا شروع ہوا ہے۔ اس کے متعلق ہم اپنی رائے ابھی محفوظ رکھتے ہیں۔ اگر ممکن ہوا تو ماہ آیندہ کی اشاعت میں ذرا البسط و تفصیل کے ساتھ اظہار خیال کیا جائے گا۔

اس ماہ کے مضامین میں جناب شمعون احمد صاحب بی۔ ایس۔ سی کا مضمون نہایت سخت قسم کا علمی مضمون ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ آخر کب تک ہم کام کی باتوں سے احتراز کرتے رہیں گے۔

پہلا مضمون تاریخی و علمی دونوں حیثیات کا مالک ہے مگر مبحث کے لحاظ سے بہت دلچسپ نظر آئے گا۔ حضرت ریاض کے خود نگاشتہ سوانح حیات کے متعلق لکھنا بیکار ہے کیونکہ اسکی اہمیت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ جناب اعظم کریوی کا فسانہ بھی خاص انکے رنگ انتخاب کا ہے۔ نولکشور پریس کی ریڈروں کے متعلق جو لکھا گیا ہے، اس پر تمام اُردو کے صحائف اور اہل مطابع کو توجہ کرکے کوشش کرنا چاہیئے کہ محکمۂ تعلیمات اس طرف متوجہ ہو۔ اور ایسی کتابوں کو نصاب سے خارج کردے۔ نظم کے حصہ میں جناب مولوی علی اختر صاحب کی نظم اور ان کی غزلیں ایسی پاکیزہ چیزیں ہیں کہ وہ آپ اپنی داد حاصل کرنیکی ذمہ دار ہیں۔ میں کیوں لکھوں اور کیا لکھوں؟

نیاز

اسے اس پر شاید کسی قدر تعجب ہوا اور کہنے لگی :" مگر میں تو اُس کے ساتھ جا رہی ہوں" یہ کہکر اُس نے اُس خوبصورت آدمی کی طرف اشارہ کیا۔

وہ مجھے ایک خالی کمرہ میں لیگئی اور رخصتی بوسہ دیا جس کے جواب میں میں نے کہا" تم مجھے فریب دے رہی ہو! تم جھوٹی ہو!"

میں گاڑی میں سوار ہوا اور گھر روانہ ہو گیا۔ بازار بھی سنسان تھا۔ صبح کی کہر مکانوں کی چھتوں پر چھائی ہوئی تھی۔ میں اور میرا ملازم دونوں خاموش تھے۔ وہ سر جھکائے ہوئے کچھ سوچ رہا تھا۔ میں بھی سردی سے کوٹ کے کالر میں منھ ڈھانپے ہوئے اپنے خیالات میں غرق تھا۔ لوگ ابھی تک مکانات میں سو رہے تھے اور خواب دیکھ رہے تھے۔ میں بھی خواب دیکھ رہا تھا۔

مجھے رہ رہ کر اس قتالۂ عالم کا خیال آ رہا تھا۔ اس نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا۔ اس خیال کے آتے ہی میں اپنے آپ کو مردہ سمجھنے لگا۔ صبح کی سپیدی جو مکانوں پر سے چمک رہی تھی مجھے ضرور مردہ تصور کر رہی ہوگی۔ جبھی تو اس قدر ساکن تھی۔۔۔ ہم بازاروں میں سے گذرتے ہوئے چلے گئے کہ یکایک صبح کا نورانی سورج اچھی طرح چمک اُٹھا اور ایک سفید بادل میرے سامنے سے گذرا جس کے ساتھ ہی مجھے رات کی" ہا، ہو ہو!" یاد آ گئی۔

(۲)

اس نے جھوٹ بولا تھا۔ وہ نہیں آئی اور میں اس کا فضول انتظام کرتا رہا۔ آسمان پر سے ایک تاریک سوگوار اور گہری بُرودت کائنات پر چھا رہی تھی۔ مجھے احساس نہ ہو سکا کہ کس طرح شفق، شام کی تاریکی میں اور تاریکی رات کی خموشی میں تبدیل ہو گئی میرے لئے یہ سب ایک طویل رات کی برابر تھا۔

میں انتظار میں آہستہ آہستہ ٹہلتا رہا میں اس سڑک کی جادہ پیمائی کر رہا تھا جس میں اس کا مکان تھا اور جو اس وقت تک بند تھا۔ وہ اب تک مکان سے نہ نکلی تھی۔ اس نے جھوٹ بولا تھا۔

میں سڑک پر یوں ہی آتا جاتا رہا ۔۔ کبھی اس دروازہ میں جھانکتا تھا جس کے شیشہ کے کواڑوں میں آہنی چھت کا عکس پڑتا تھا۔ کبھی سردی سے کپکپانے لگتا تھا۔ دفعتاً شمال کی جانب سے ایک سرد ہوا کا جھونکا اٹھا اور میرے چہرہ اور مکانوں کی چھتوں پر برف کے باریک ذرات بکھیرتا ہوا چلا گیا۔

سڑک کا لیمپ اپنی زرد و سوگوار روشنی کے ساتھ جھلملا رہا تھا۔ مجھے اس شعلہ پر ترس آیا جسکی عمر صرف ایک رات تھی۔ اور رات بھی سرد و سوگوار۔ میں سمجھ گیا کہ عمر یونہی کٹ جائیگی اور وہ کبھی نہ آئے گی۔۔۔ اس نے جھوٹ بولا تھا۔

میں سمجھتا تھا کہ میری اور اس لیمپ کی حالت یکساں تھی۔ وہ بھی سوگوار تھا اور میں بھی فراق زدہ، فریب خوردہ۔ میں سڑک پر یونہی آتا جاتا رہا، اکثر لوگ میری طرف گھورنے لگے۔ اور پھر اپنی اپنی راہ لگ گئے۔ مگر وہ مکان بے

نہ نکلی۔ میں بھی ناکام ٹہلتا رہا۔

مجھے تعجب ہے کہ اس آزمائش و ابتلا کے بعد میں چلّایا کیوں نہ اٹھا اور اس تکلیف سے رو کیوں نہ پڑا؟ میں ہنس دیا۔ اور محسوس کرنے لگا کہ میری انگلیاں اور پنجے اکڑے جا رہے ہیں۔ وہ اس زہریلے سانپ ——— جھوٹ ——— کو کچلنا چاہتے تھے جس نے مجھے دیوانہ وار اس سڑک کی پیمائش پر مجبور کر دیا تھا۔

ماضی اور حال، کے درمیان سے حجاب اٹھ گیا، زندگی سے پہلے اور بعد کے درمیان سے سب رکاوٹیں دور ہوگئیں۔ "ہا، ہو ہو!" کی آوازیں کان میں گونجتی ہوئی سُن رہا تھا۔

دفعتاً جب نظر اس کے مکان کی کھڑکیوں کی طرف پڑی تو ایسا معلوم ہوا کہ اس کی زرد اور نیلی روشنیاں مجھے یہ پیغام دے رہی تھیں:۔

"کیوں فریب میں آ رہا ہے! وہ تو جھوٹی ہے! جبکہ تو اس سخت کہر اور سردی میں سڑک پر ٹھٹھر رہا ہے۔ وہ اس شخص کے ساتھ جو تجھ سے نفرت کرتا ہے۔ اپنی پوری رعنائیوں کے ساتھ بیٹھی ہوئی سرگوشیاں کر رہی ہے۔ اگر تو ہمت کرکے اُسے قتل کر دے تو بڑا نیک کام کرنے یعنی دنیا سے جھوٹ ہمیشہ کے لئے فنا ہو جائے!"

میں نے اس ہاتھ کی گرفت کسی قدر اور تنگ کی جیب میں ایک لمبا چاقو تھا "ہاں! ہاں!! میں اُسے قتل ہی کر دونگا!"

مگر کھڑکیاں میری طرف پھیر مخاطب ہوتی ہوئی معلوم ہوئیں:۔

"نادان! کیا تو سمجھتا ہے کہ یہ چاقو فریب نہیں دیگا! یہ بھی جھوٹا ہے بلکہ اُس کی محبت سے زیادہ جھوٹا!" بازار بالکل سنسان ہوگیا۔ ہر چیز ایک وہمی سایہ ہوگئی۔ اور میں یونہی ساکت کھڑا رہا۔ دور کے کلیسہ نے گھنٹہ بجایا۔ اس کی غمگین اور سوگوار آواز فضائے بسیط میں گونجی اور میں متحیر ہوگیا کیونکہ اس نے پندرہ بجائے تھے۔ "جھوٹ!" کلیسہ کا گھنٹہ بھی خراب ہوگیا ——— نہیں نہیں فریب دینے لگا! ہر طرف جھوٹ اور فریب مسلط تھا!

گھنٹہ کی آخری غلط ضرب ختم ہی ہوئی تھی کہ مکان کا دروازہ کھلا اور وہی دراز قد شخص خوش و خرم نکلا۔ میں اسکی صرف پُشت دیکھ سکا مگر پہچان گیا۔ کیونکہ کل ہی تو اسے اچھی طرح دیکھ چکا تھا۔

اسکی چال سے اس کی اندرونی مسرت بے پایاں کا اندازہ پوری طرح ہو سکتا تھا۔ میں بھی کبھی اسی گھر سے اسی طرح نکلا کرتا تھا اور کون ہے؟ جو ایک عورت کی پُر فریب محبت سے اس طرح مسرور ہو کر نہ نکلے!

(۳)

میں نے دھمکایا سختی سے مطالبہ کیا اور دانت پیسے اور کہا "سچ بتادو!"

اس نے برف جیسے سفید چہرہ کو میری طرف پھیرا، جس کی متحیر پُر اسرار سیاہ آنکھیں میری طرف گڑی

ہوئی تھیں۔

"کیا میں جھوٹ بول رہی ہوں؟" اس نے پوچھا

اسے خوب معلوم تھا کہ میں اسے جھوٹا ثابت نہیں کرسکتا تھا اور یہ کہ وہ میرے تمام شبہات، میری تمام تشویش ناک قوت تفتیش صرف ایک جھوٹے لفظ سے فنا کرسکتی تھی۔ چنانچہ وہ لفظ اسکے منھ سے نکلا۔ اور اپنی پوری نورانی سطح لئے ہوئے مگر اس کے نیچے سخت تاریکی تھی۔

"میں تم سے محبت کرتی ہوں! کیا تمہاری نہیں ہوں؟" وہ بالآخر بولی۔

سامنے کہرسے ڈھکا ہوا میدان تھا جو تاریکی سے گھرا ہوا تھا۔ کمرہ میں آتشدان کی حرارت سے کافی آرام محسوس ہو رہا تھا۔

میں نے ذرا سختی سے کہا "سچ سچ بتاؤ! حقیقت مت چھپاؤ۔ خواہ وہ کتنی ہی اندوہناک کیوں نہ ہو۔ مجھے مرنا قبول ہے۔ بہ نسبت اس کے کہ حقیقت نہ معلوم ہو! مجھے تمہاری آنکھوں میں فریب نظر آرہا ہے۔ بتادو۔ سچ بتادو۔ میں تمہیں ہمیشہ کے لئے چھوڑ دونگا۔"

وہ خاموش رہی، مگر آنکھوں کی سرد چبھن میرے سینہ میں پیوست ہوتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔ اس کی سیاہ آنکھوں کی استفسارانہ چمک میرے اعماق دل میں پہنچ رہی تھی اور میں اسے محسوس کر رہا تھا۔

"سچ بتادو ورنہ میں تمہیں قتل کردونگا" میں نے چلا کر پوچھا۔

"مار دوگے!" اس نے آہستہ سے کہا "مار ڈالو اکثر زندگی وبال جان ہوجاتی ہے۔ لیکن کیا تم سمجھتے ہو کہ اسطرح دھمکیاں دیکر مجھ سے حقیقت معلوم کرلوگے؟"

میں دوزانو ہوگیا اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر زور سے بھینچا اور چیخا: "خدا کے لئے مجھ پر رحم کر۔ رحم! ——— سچ بتادے!"

"نادان ——— نادان!" اس نے محبت بھرے لہجہ میں کہا اور میرے بالوں پر ہاتھ پھیرا "نادان"

"مجھ پر رحم کرو، جھوٹ نہ بولو، خدا کے لئے سچ بتادو!"

میں نے اس کی پیشانی کی طرف دیکھا۔ ایک مجنونانہ خواہش پیدا ہوئی کہ اس پردے کے پیچھے صداقت چھپی ہوئی ہے۔ اس کا سر توڑ کر دیکھنا چاہئے۔ اس میں کیا چھپا ہوا ہے۔ اس کے نرم سینہ میں ضربات قلب صاف سنائی دے رہے تھے۔ دل میں ایک طوفان اٹھا کہ اس جواب کی گہرائی میں حقیقت ضرور پنہاں ہوگی۔ اسے کھول کر دیکھ ——— دیکھ انسانی قلب کو عریاں کرکے دیکھ!

کمرہ تاریک ہو رہا تھا۔ زرد شمع اپنے آخری لمحات پورے کر رہی تھی۔ اس وقت یہاں ایسا سکوت، ایسا

سوگ اور ایسی تاریکی تھی کہ دل میں خوف، غم اور تاثرات پے بہ پے پیدا ہو رہے تھے۔
"ناداں ـــــ ناداں!" وہ بولی۔
دفعتاً شمع بجھ گئی۔ کمرہ بالکل تاریک ہو گیا۔ میں اس کا چہرہ، اُسکی آنکھیں اور بازو مطلق نہ دیکھ سکتا تھا
یکایک اس نے اپنی باہیں میرے گرد حمائل کر دیں اور میں نرم پڑ گیا۔ مجھے اس آغوش میں سچائی کا شائبہ نظر آتا تھا۔
تاریکی میں اس کی پُراسرار اور ڈراؤنی آواز سنائی دی:۔ "مجھے آغوش میں لے لو! مجھے ڈر لگ رہا ہے!"
پھر سکوت ایک حزیں اور سوگوار سکوت۔
"تم مجھ سے صداقت کے طالب ہو! لیکن کیا یہ میرے پاس ہے؟ خود مجھے ضرورت ہے کہ کوئی سچائی کی طرف رہنمائی کرے۔ میں جھوٹی نہیں ہوں۔ مجھے بچاؤ! مجھے بچاؤ!! اف! کس قدر خوفناک ہے!" وہ سسکیاں لیتے ہوئے بولی۔
کمرہ میں تاریکی تھی۔ مجھے محسوس ہوا کہ کوئی کھڑکیوں میں سے ہماری طرف گھور رہا تھا وہ مجھ سے آکر چمٹ گئی اور چیخی:۔ "آہ! کس قدر خوفناک ہے!!"

(۴)

میں نے اُسے قتل کر دیا۔ اس کا بےحس جسم اس کھڑکی کے نیچے پڑا ہوا تھا۔ جہاں سے میدان صاف نظر آتا تھا۔ میں نے اس کے ساکت جسم پر پاؤں رکھا اور ایک قہقہہ لگایا ــــ یہ کوئی مجنونانہ قہقہہ نہ تھا، ہرگز نہیں یہ قہقہہ تھا اس مسرت کے اظہار کا، اس سکونِ قلب کے ثبوت کا جو مجھے آج محسوس ہو رہا تھا۔ آج میرا قلب پرسکون تھا، کیونکہ وہ ہستی جس نے میرے جسم و روح کو تباہ کر رکھا تھا آج فنا ہو گئی تھی۔
جھک کر میں نے اس کی بےحس آنکھوں کی طرف دیکھا۔ بڑی بڑی پُرسکون آنکھیں میری طرف گھور رہی تھیں۔ بے کیف اور سوگوار۔ میں نے اپنی اُنگلیوں سے ان آنکھوں کو کئی دفعہ کھولا اور بند کیا۔ اب مجھے ان سے کوئی خوف محسوس نہیں ہوتا تھا۔ کیونکہ اب وہ پُراسرار اور فریب دہ نہیں رہی تھیں۔ اب میں خوش تھا۔
جب لوگوں نے مجھے پکڑ کر گرفتار کر لیا تو میں نے ایک قہقہہ لگایا۔ لوگوں نے اسے ایک وحشیانہ اور خوفناک چیز سمجھا۔ لعض کمزور لوگ ڈر کر پیچھے ہٹ گئے۔ کچھ جرات کر کے میری طرف بڑھے لیکن میری مسرور نگاہوں اور خوش و خرم چہرہ کو دیکھا تو وہ زرد پڑ گئے اور انکے قدم چلتے چلتے ٹھہر گئے۔
"دیوانہ ہے!" کسی نے کہا۔
میرے خیال میں اس جملہ نے اُنکی تسلی کر دی کیونکہ وہ حیران تھے کہ ایک شخص اگر اپنی محبوبہ کو قتل کر کے قہقہہ لگائے تو سوائے دیوانگی کے اسے اور کیا کہہ سکتے ہیں؟
ایک موٹے آدمی نے جو کسی قدر خوش طبع نظر آتا تھا۔ مجھے ایک اور لفظ سے یاد کیا جسے سُن کر میں کسی قدر

خاموش ہوگیا اور میری آنکھوں کے آگے ایک تاریک سایہ گرتا ہوا نظر آنے لگا۔

"ناوان" اس نے کہا تھا بالکل بے خیالی اور انتہائی خوش فکری کے ساتھ آہ کیا میں "ناوان" تھا؟

میں اُس شخص کی طرف دیکھکر چلایا اور لوگ ڈر کر پیچھے ہٹ گئے۔ بعض یہ سمجھے میں اُنھیں بھی مارنا چاہتا تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں ان میں سے کسی کو چھونا تک نہ چاہتا تھا۔ بلکہ جب اُس نے میری طرف دوبارہ دیکھا تو میں نے ایک اور قہقہہ لگایا۔

جب میں اس کمرہ سے جس میں لاش پڑی ہوئی تھی نکلنے لگا تو اس موٹے آدمی کی طرف دیکھ کر خطاب کیا "میں مسرور رہوں! بالکل مسرور اور بیحد خوش!"

اور یہ سچ تھا۔

(۵)

میں نے بچپن میں کسی چڑیا گھر میں ایک اژدہا دیکھا تھا اور اس نے میرے دل پر اس قدر گہرا نقش چھوڑا تھا کہ اب تک اُس کی یاد ذہن سے محو نہیں ہوئی تھی۔ وہ دوسرے جانوروں کی طرح دیکھنے والوں کی طرف غلامانہ انداز حماقت سے گھورا نہیں کرتا تھا بلکہ بالکل بے خیالی کی حالت میں اپنے پنجرہ میں اس طرح رینگتا تھا جیسے سنتری گشت کرتا ہے۔ ہمیشہ ایک مقررہ مقام پر پہونچ کر گھومتا تھا اور اپنی سنہری ناک ایک خاص سلاخ سے آکر رگڑتا تھا۔ وہ اس طرح ہمیشہ کیا کرتا تھا اور لوگ اس باقاعدہ جانور کی حرکتوں کو دیکھکر مسکراتے تھے، بعض لوگ جانے کے بعد پھر لوٹتے تھے اور ایک دفعہ اسے پھر دیکھ کر اسکی غلامی اور اپنی آزادی کا خیال کرکے ایک آہ سرد بھرتے تھے۔ مگر وہ ان سب درندوں سے مبرا تھا۔ اسے انکی ضرورت تھی وہ اپنے گشت میں مصروف رہتا تھا خواہ لوگ کچھ ہی کہا کریں۔ جب میں کسی کتاب میں یا کسی کی زبان سے "ابدیت" کا لفظ سنتا یا پڑھتا تو اس اژدہے کی زندگی سامنے آجاتی تھی اور پھر اس کی خوفناک اور سخت گیر نتائج کا احساس کرکے تھرا اُٹھتا تھا۔

میں اپنے "سنگین پنجرے" میں بالکل اس اژدہے کی مانند تھا، میں اپنے کمرہ میں برابر ٹہلتا رہتا تھا، کبھی کسی کے استفسار کا جواب نہ دیتا تھا۔ ہر وقت اپنے خیالات میں مستغرق رہتا تھا۔ دماغ میں صرف ایک خیال قائم تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میرے کندھوں پر تمام دنیا رکھ دی گئی تھی۔

یہ خیال صرف ایک لفظ پر مشتمل ہوتا تھا مگر کس قدر خوفناک اور دل کے پرخچے اُڑا دینے والا لفظ تھا! مہلک اور بیداد گر!

"جھوٹ!" —— یہ تھا وہ لفظ

یہ لفظ ایک خوفناک سانپ میں تبدیل ہوگیا اور میرے گرد وپیش ہر وقت منڈلانے لگا۔ حتیٰ کہ

مجھ سے چمٹ گیا۔ اور میں ہر وقت اسکی پھنکار سننے لگا۔ میں پریشان تھا یہ خیال میرے لئے سوہان روح بن گیا تھا۔ دل سے جو آہ نکلتی تھی وہ ایسی معلوم ہوتی تھی جیسے کوئی "جھوٹ" کا لفظ منھ سے نکال رہا ہو۔

میں کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کرہ کا فرش غیر محسوس ہے اور چھت شفاف میں نے محسوس کیا کہ میں نکل کر فضائے بسیط میں پرواز کر رہا ہوں جہاں ہر طرف تاریکی ہی تاریکی ہے۔ میں بیتابانہ اوپر اڑا۔ مگر کمرہ میں پھر پھنکار کی آواز سنائی دی۔ یہ سب کیا تھا؟ میرے دل کی صدائے بازگشت، وہ آواز جس سے میں برافروختہ ہوجاتا تھا۔ یہ آواز تھی "جھوٹ"؟

میں نے کمرہ میں زور سے پاؤں مار کر چلانا شروع کیا "جھوٹ! جھوٹ کہاں ہے، جھوٹ کو تو میں نے مار ڈالا!"

میں ارادتاً وہاں سے ہٹ گیا۔ کیونکہ خیال تھا کوئی سن کر اس چیخ کا جواب دے گا۔ مگر نہیں کمرہ کی دیواروں سے ٹکرا کر آواز گونجی ـــــ "جھوٹ!"

آپ کو معلوم ہے۔ میں نے کیا غلطی کی تھی۔ گو میں نے اس عورت کو قتل کر دیا تھا مگر جھوٹ کو ابدی اور غیر فانی بنا دیا تھا ـــــ جھوٹ دنیا سے اب بھی فنا نہیں ہوا۔ ایسی عورت کو اس وقت کبھی نہیں مارنا چاہئے جب تک "صداقت" معلوم نہ ہوجائے، کوشش کرنا چاہیئے کہ وہ پھر راہ راست پر آجائے اور حقیقت کا انکشاف کردے ـــــ ورنہ قتل آخری تدبیر ہے۔

یہ خیالات تھے جو کمرہ میں ٹہلتے ہوئے میرے ذہن میں آرہے تھے!

(۶)

وہ اپنے ساتھ جھوٹ اور صداقت کو جس جگہ لیگئی ہے وہاں تاریکی ہے اور صرف تاریکی ـــــ خوفناک اور ڈراؤنی تاریکی۔ جہاں میں بھی جانے والا ہوں شیطان کے عین تخت کے نیچے میں دوزانو ہوکر اسکا دامن پکڑونگا اور کہونگا ـــــ "سچ بتا ـــــ حقیقت کی طرف لیجا۔ کیوں فریب دے رہی ہے!"

میرے خدا! میرے خدا! یہ بھی جھوٹ ہے! وہاں تاریکی ہی تاریکی ہے اور صدیونکی کبھی نہ ختم ہونیوالی خاموشی وہ وہاں بھی نہیں ہے ـــــ کہیں بھی نہیں ہے!

جھوٹ اب بھی باقی ہے۔ جھوٹ غیر فانی ہے۔ میں ہوا کے ہر ذرہ میں اسے دیکھ رہا ہوں اور جب میں اس فضا میں سانس لیتا ہوں تو سینہ میں ایک کھٹک ہوتی ہے اور چاہتی ہے کہ اسے چیر کر نکل جائے! آہ! انسان کیلئے صداقت کی تلاش کیسا مجنونانہ فعل ہے! کسقدر تکلیف دہ ہے حقیقت کی تلاش! اے خدا مجھے بچا! بچا!! ـــــ جھوٹ ہے! کیا میں جھوٹا ہوں؟

(اندریف)

ظفر قریشی دہلوی

حضرت ریاض آپ اپنے آئینہ میں

یوں تو، ہر وہ شخص، جسکو شاعری سے کچھ بھی لگاؤ ہے، نہ حضرت ریاض کے نام سے ناواقف ہو سکتا ہے اور نہ ان کے رنگ کلام سے بیخبر، لیکن خود ریاض کیا چیز ہیں۔ اسکے جاننے والے وہی لوگ ہو سکتے ہیں جن کو اس "رند پاکباز" سے ملنے اور بار بار ملنے کا فخر حاصل ہوا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ہندوستان کا شاعر، جیسا کہ اس سے قبل میں بارہا ظاہر کر چکا ہوں، بہ حیثیت انسان ہونے کے ایک ایسی جنس فرومایہ ہے کہ مشکل ہی سے کسی کو اس کے پیش کرنے کی جرأت ہو سکتی ہے، لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ اگر واقعی کوئی انسان اس گروہ میں نکل آیا تو پھر اس کا جواب اس "عالم آب و گل" کیا معنی "ملائکہ مقربین" اور "کروبیان مقدسین" کی جماعت میں بھی نہیں مل سکتا۔

اس حقیقت کی طرف اول اول میرا خیال اس وقت منتقل ہوا جب غالباً سنہ ۲۵ء میں سب سے پہلے ریاض کی زیارت کا شرف بھوپال میں مجھے حاصل ہوا اور پھر اس حقیقت کے مدارج رفتہ رفتہ مجھ پر اس وقت واضح ہوئے جب میں لکھنؤ آ گیا اور زیادہ قرب کے ساتھ، بار بار، رات، دن کے مختلف حصوں اور متنوع کیفیات رکھنے والی صحبتوں میں ریاض کے مطالعہ کی فرصت نصیب ہوئی۔

ریاض کیا چیز ہیں؟ اگر میں تفصیل سے کام لوں تو اس کے لئے دفتر کے دفتر ناکافی ہیں، لیکن اختصاراً اجمال کے ساتھ اگر کوئی دریافت کرے تو میں اس کے جواب میں وہی کہہ سکتا ہوں جو یوسف کی خصوصیات معلوم کرنے کے بعد بعض زبانوں سے بے اختیار نکل گیا تھا کہ

ان ھذا الا ملک کریم

اور اس کے بعد بھی عرفی کا یہ مصرعہ پڑھوں گا کہ

مرغ اوصاف تو از اوج بیاں انداختہ

کیونکہ یوسف تو خیر، پیغمبر پیدا ہوئے، پیغمبر زندہ رہے اور پیغمبر مرے، اور ان کے لئے ملک کریم ہو جانا کوئی امتیاز نہ تھا، لیکن ریاض تو بقول شخصے اس "تیرہ خاکدان ہند" میں ایک گنہگار انسانی خاندان میں پیدا ہوئے، اور جوانی کا معصیت کوش زمانہ اس فضا میں بسر کیا جہاں "حسن" کا مفہوم "استغنا"

نہ تھا اور اب ضعیفی ان حالات کے ماتحت گزار رہے ہیں۔ جب "ممنوعات و محرمات" کا سوال شرعاً و قانوناً دونوں طرح اُٹھ جاتا ہے۔ لیکن کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ ریاضؔ اپنی زندگی کی کسی منزل پر، اپنی حیات کے کسی مشغلہ میں اور اپنی عمر کے کسی موسم میں ایک لمحہ کے لئے بھی اُس جادۂ انسانیت و اخلاق سے ہٹے ہوئے نظر آئے، جو کبھی کبھی گنہگاروں کو تو مل جاتا ہے، لیکن "زاہدانِ مرتاض" کے حصہ میں کبھی نہیں آتا اس لئے اگر ان کو ملک کریم کہنے کے بعد بھی عُرفی کی طرح اعتراف قصور کیا جائے تو غالباً نادرست نہ ہوگا۔

ریاضؔ اس عہد کی یادگار ہیں جب اودھ اور مضافات اودھ کے اکثر مقامات میں زندگی کا مفہوم باوجود انتزاع سلطنت کے بدستور خندہ و قہقہہ چلا آ رہا تھا اور ہر صحبت اس احساس حسن و شباب کا مکمل نمونہ ہوتی تھی، جسے شعر و موسیقی کا خلاق کہنا چاہئیے

یہ وہ زمانہ تھا۔ جب ہر اجتماع ہنگامہ نائے و نوش تھا اور ہر منظر بساطِ گلفروش۔ بیفکریاں تھیں اور عیش کوشیاں عیش کوشیاں تھیں اور ان اسباب کے ساتھ حسن کا ایک ادنیٰ منظر صاحب رسائل طغرا کی زبان میں "بہر سو بنا گوشِ مطرباں جلا جل نعل در آتش" کے تیور لئے ہوتا تھا۔ ظاہر ہے کہ جس شخص پر ایسے مدہوش اور مدہوش کُن زمانہ میں جوانی آئے اور شخص بھی کون ؟ ریاضؔ ایسا فطرت کی طرف سے غیر معمولی طبع رنگیں رکھنے والا وہ جس قدر رداءِ معصیت سیاہ کم تھا، لیکن اس کا علم بہت کم لوگوں کو ہوگا کہ یہ ساری عمر خمریات کی شاعری میں مبتلا رہ کر ذوق بادہ سے ناآشنا رہنے والا شاعر، یہ زندگی کی تمام شگفتہ سامانیوں کے ساتھ حسن و شباب کے ہجوم میں بہترین ایام حیات گزارتے ہوئے جادۂ اخلاق سے کبھی ایک لمحہ کے لئے نہ ہٹنے والا شخص، جس طرح ایک انسان پیدا ہوا تھا، بدستور اسی طرح انسان رہا اُس زمانہ میں بھی جبکہ گناہ سے پہلے عذر گناہ پیدا ہو جاتا ہے، اس سنِ کہولت کا کیا ذکر کہ اب تو ریاضؔ حقیقی معنے میں رضواں ہے۔

ریاضؔ موجودہ حالت میں ضعف و کہولت کے جس دور سے گزر رہے ہیں وہ اس تصویر سے ظاہر ہے جو اس مضمون کے ساتھ شائع ہو رہی ہے لیکن باوجود اس کے کہ زمانہ موافق نہیں، حالات نے سخت دلگیر بنا رکھا ہے، ہجوم افکار نے چاروں طرف سے گھیر لیا ہے، ریاضؔ باوجود سراپا غم و الم ہونیکے اب بھی دوسروں کے لئے، یکسر بہار و شگفتگی ہے، آپ خواہ کتنے ہی مغموم و ملول کیوں نہ ہوں، لیکن یہ ممکن نہیں کہ ریاضؔ آپ کو مل جائیں اور تھوڑی دیر کے لئے آپ کسی اور عالم میں نہ پہنچ جائیں، ان کی دلکش و دلنشیں گفتگو، ان کا انداز بیان، ان کی لطیف بذلہ سنجیاں اور پھر سب سے بڑھکر انکا خلوص — یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان کسی ایسی فضا میں پہنچ گیا ہے، جہاں فردوس کی ہوا ہے، کوثر و سلسبیل کی روانی ہے

اور شجر طوبےٰ کے طیور کا ترنم! بچوں کے لئے انکے وجود گہوارۂ استراحت جوانوں کے لئے ان کی ہستی داستان حسن و عشق اور ضعیفوں کے لئے ان کی ذات ایک برادرانہ آغوش ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ کوئی شخص ریاض سے ملے اور اپنے ذوق کو انکے پاس سے "ناآسودہ" واپس لائے۔

چونکہ ریاض نے اس زمانہ میں ہوش سنبھالا، جب لکھنوی شاعری شباب پر تھی اور داغ نے بھی دلی کے رنگ سخن کو چمکا رکھا تھا ہر صحبت، صحبت شعر و سخن تھی اور ہر بزم دائرۂ شمع و لگن۔ رام پور میں خلد آشیاں نواب کلب علی خاں کے دربار میں ملک کے تمام اکابر شعراء کا ہجوم تھا، ہر محفل لطائف ادبیہ اور نکات شعریہ کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ اور ریاض بھی ان گلدستوں میں ایک گل نو دمیدہ کی حیثیت سے کہیں نہ کہیں ضرور پائے جاتے تھے اس لئے آج ریاض کے سوا کوئی نہیں جو ان محافل کی داستان کا بیان کرنے والا ہو اور صرف انھیں کا سینہ ہے جس کے اندر خدا معلوم کتنے واقعات اُس دورِ زریں کے محفوظ ہیں۔ اب سے دو سال قبل ریاض کے اوقات کا اکثر حصہ لکھنؤ میں بسر ہوتا تھا۔ میں نے سید امتیاز احمد بی۔ اے مرحوم (آہ امتیاز!) سے بارہا کہا کہ وہ ریاض سے ان جواہر کو حاصل کرکے کسی نہ کسی طرح محفوظ کرلیں اور چونکہ وہ شب و روز ریاض ہی کی معیت میں رہتے تھے، اور ہر وقت انکی گل افشانیوں سے لطف اندوز رہتے تھے۔ اس لئے انکے لئے زیادہ دشوار نہ تھا۔ مگر یہ خوش بختی میرے لئے دوسری طرح مقسوم ہو چکی تھی اور وہ یوں کہ خود ریاض اپنے ہی ہاتھوں سے یہ نعمتیں نگار کو ارزانی فرمائیں گے اور اس طرح "شاہد و مشہود و مشاہدہ" سب کا امتیاز اٹھکر یہ حقائق رونما ہونگے۔

ریاض شاعر ہونے کی حیثیت سے کس مرتبہ کے مالک ہیں اور لکھنؤ اسکول کی شاعری میں وہ کس امتیاز و خصوصیت کے حامل ہیں؟ اس کا ذکر اس جگہ بے محل ہے۔ علاوہ اس کے یوں بھی میں نگار میں ایک بار اس مسئلہ پر گفتگو کر چکا ہوں۔ لیکن یہاں یہ ضرور بتا دینا چاہتا ہوں کہ ریاض کس مرتبہ کے انشا پرداز ہیں۔ کیونکہ اب زمانہ اس بات کو محو کر چلا ہے کہ ریاض کسی وقت اس خصوصیت کے لحاظ سے بھی خاص مرتبہ رکھتے تھے اور یہ فراموشکاری کس قدر دردناک ہے کہ آج وہ لوگ جو انتہائی دعوائے تحقیق و تفتیش کے ساتھ تاریخ زبان اُردو لکھتے ہیں وہ بھی ریاض اور اُنکے لٹریچر سے بحث نہیں کرتے، حالانکہ یہ واقعہ ہے کہ جس وقت سر سید مرحوم تہذیب الاخلاق کے ذریعہ سے اصلاح مذہب کا لٹریچر پیش کر رہے تھے اور خان بہادر میر ناصر علی چودہویں صدی کی وساطت سے علمی مناظرہ کی شان پیدا کر رہے تھے، اس وقت ریاض سنہ ۱۸۸۰ء میں ریاض الاخبار، گلکدۂ ریاض فتنہ و عطر فتنہ نکال کر اور پھر سنہ ۱۸۸۵ء میں روزانہ صلح کل کا اجراء کرکے، نثر و نظم کا وہ خزانہ لٹا رہے تھے،

جو انھیں کے لئے مخصوص تھا اور انھیں کے ولولۂ عمل کے ساتھ وہ بھی ہمیشہ کے لئے ختم ہوگیا۔ کیسے خوش قسمت ہیں وہ جن کے پاس ان سب کا مکمل فائل موجود ہے، اور کس قدر قابلِ رشک ہیں وہ جنھیں اب بھی گاہ گاہ ریاضؔ کی زیارت نصیب ہو جاتی ہے اور ان کی زبان سے وہ لٹریچر سننے میں آجاتا ہے جس کے دیکھنے کو دنیا کی آنکھیں ترس ترس کر آخرکار مایوس ہو گئیں۔

پھر نگار اپنی خوش بختی پر جتنا ناز کرے کم ہے کہ وہ آج ریاضؔ کو (شاعر ریاضؔ نہیں) ادیب و نثار ریاضؔ کو پھر منصۂ شہود پر لا رہا ہے اور اُن جواہر ریزوں کو وقف عام کر دینا چاہتا ہے جو سوائے اس کے کسی اور صورت سے حاصل ہی نہ کئے جا سکتے تھے کہ خود ریاضؔ اپنے حافظہ سے نکال کر صفحۂ کاغذ پر منتشر کر دیں۔

آپ اس سلسلہ میں یقیناً کسی ترتیب تاریخی کا لحاظ نہ پائیں گے اور نہ مورخانہ اعداد و شمار آپ کو اس میں نظر آئیں گے۔ بلکہ یہ وہ موتی ہیں جو بغیر کسی نظم و اصول کے حضرت ریاضؔ نے بکھیر دئے ہیں۔ اب آپ کو اختیار ہے خواہ انھیں پرو کر کوئی ہار بنا لیں یا یوں ہی منتشر حالت میں ان کی درخشانی سے لطف اندوز ہوں۔

اس سلسلہ کی پہلی قسط نگار کی اس اشاعت میں درج کیجاتی ہے اور یقین ہے کہ یہ سلسلہ اس وقت تک ختم نہ ہوگا جبتک ریاضؔ کے خزینۂ دماغ کا آخری جواہر ریزہ کسی نہ کسی طرح حاصل کیا جا سکتا ہے۔ پس اگر میں اس جنس گرانمایہ کو پیش کر کے یہ کہنے کا مجاز ہوں کہ

شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم،

تو ریاضؔ اور ان کے لٹریچر کو دوبارہ زندہ کرنیکے عوض میں نگار کا بھی آپ سے یہ مطالبہ غالباً خلاف محل نہ ہوگا کہ اور کچھ نہیں تو کم از کم آپ اس کے متعلق

"الیس ذالک بقادر علے ان یحیی الموتے"

کے تو قائل ہو جائیں۔ **نیاز**

شوخ نگار مدیر نگار پیارے نیاز میرے لئے سرمایۂ ناز۔ پرسوں نگار آیا۔ مجھے فوراً بھولا ہوا وعدہ یاد آیا اور میں تعمیل ارشاد میں مصروف ہوا۔ جاڑوں کی لمبی راتیں کام آئیں اور میں یہ کہنے کے قابل ہوا۔

سپردم بتو نامہ خویش را — تو دانی حساب کم و بیش را

ناتمام مراسلہ بھیج رہا ہوں۔ بدقسمت بھی ہوں۔ بدخط بھی۔ مجھ سے اپنا لکھا خود نہیں پڑھا جاتا۔ حروف نہیں تحریر قسمت کی آڑی ترچھی لکیریں ہیں۔ خدا کرے آپ پڑھ لیں۔ نقل کے لئے وقت کافی نہیں۔ آپ میرا یہ مراسلہ مجھے واپس

دینے کو با حتیاط رکھ لیں۔ جواب کی ضرورت نہیں میں غالباً جلد لکھنؤ اس لئے آؤں گا کہ ہلال صیام نکر میں زار و ناتواں خیر آباد واپس آ جاؤں۔ ماہ مبارک کا آغاز لکھنؤ میں نہ ہونے پائے۔ بھوک کا مزا گھر پر لطف دیتا ہے ؎ ریاضؔ

مرے ہوئے پڑے رہتے ہیں رات دن گویا
ہماری عمر میں شاید مہ صیام نہیں

روزہ داروں کی رات مزے کی ہوتی ہے۔ میں نے خود کہا ہے ؎

روزے نہیں ہیں سخت یہ سب باتیں ہیں | ہاں لطف فزا شب کی ملاقاتیں ہیں
یاروں میں مہ صوم کی تعریف یہ ہے | کچھ ہجر کے دن وصل کی کچھ راتیں ہیں،

گر مجھ سے مفلس گرسنہ کے لئے رات دن برابر۔ مرے ہوئے پڑے رہنا اچھا کہ مہ صیام شمار عمر میں نہ رہے۔

بچوں کو دعا۔ گھر میں مزاج پرسی۔ ریاضؔ ۱۶ر جنوری ۱۹۳۱ء

نیاز صاحب۔ آپ میری تصویر کو بڑھاپے میں روشناس خلق یا رسوائے عالم کرنا چاہتے ہیں ؎

میں پھرا اس در سے تو خلقت تماشائی ہوئی | آگے آگے داغ پیچھے پیچھے رسوائی ہوئی

میں خود اپنی صورت دیکھنا پسند نہیں کرتا اور دنکی نسبت کیا عرض کروں وہ دن گئے ؎

دنیا کی پڑ رہی ہیں نگاہیں ریاضؔ پر | کس وضع کا جوان ہے کس آن بان کا

یہ کہنے کا موقعہ کہاں ؎

تم جوانی کے مزے لوٹو ریاضؔ | عیب بھی زیبا ہے اس سن کے لئے

اب تو میرے لئے ہر ایک کو مجبوراً یہ کہنا پڑے گا ع

جنت میں بھی یہ جاکے جواں ہو نہیں سکتا

گو بڑھاپے کی بڑھتی ہوئی ہوس اس عمر میں بھی یہ کہنے پر مجبور کرتی ہے ؎

دے پیر مغاں دختر رز عمر رسیدہ | بوڑھا ہوں ملے نور نظر چرخ کہن کی،

وہ زمانہ بھی غنیمت تھا جب دھوپ چھاں یا نیم سپید ریش کسی کے دست حنائی سے رنگ حنا کی خواستگار ہوتی تھی اور کسی موقع پر خان بہادر سید احمد حسین صاحب رضوی لکھنوی سے یہ سننا پڑا تھا ؎

حنا لگا کے پہنچتے ہیں گلرخوں میں ریاضؔ | کچھ ان کی ریش مبارک کا اعتبار نہیں

یا خداوند نعمت حضور مہاراجہ صاحب بہادر بالقابہ والی محمود آباد دام دولتہ۔ صورت دیکھتے ہی ارشاد فرمایا کرتے تھے ؎

بڑے نیک طینت بڑے صاف باطن | ریاضؔ آپکو کچھ ہمیں جانتے ہیں،

خود بھی رنگینی خضاب کے اسباب فراہم کرکے شوق خضاب میں کتنا پڑتا تھا ؎

خوب ہیں شاہدان بازاری ہم سیہ کاردہ خضاب فروش،

دیکھیئے کالا منھ کرنے کے محاورے کو کس حسن سے ادا کیا ہے۔ ایسے ابتذال پر غیر متبذل صدہا شعر صدقے آپ بھی غالباً قدر کریں گے گو بہ اعتبار ریش گوری کالی یعنی سیاہ و سفید دونوں سے آپ بے نیاز ہیں۔

کالی گوری کے متبذل استعمال نے اس وقت ایک شعر بے محل اور ریش سے غیر متعلق یاد دلوایا۔ شاید اُتری جوانی اور ریش آہن کردہ سے گو نہ دور کا تعلق ہو آپ جبین پر بل ڈال کر بادلِ ناخواستہ وہ میرا متبذل شعر بھی سن لیجئے مگر کوشش فرمایئے گا کہ میرے قدردان مہربان مولوی عبدالسلام صاحب ندوی مولف شعرالہند تک نہ پہنچنے پائے ؎

کالی گوری کوئی نہ چھوٹی، افیوں کھاکر، پی لی۔ توبہ،

آپ اُس زمانے میں تصویر شائع کر رہے ہیں جب ریش سفید پر کوئی رنگ ہی نہیں چڑھتا نہ ساون کی مہندی کام دیتی ہے نہ کسی شوخ کے لب نازک سے شراب کی کلیاں۔

اب ریش سفید نے درازعمر شیخوخیت سے زیادہ اعتبار پیدا کر لیا ہے۔

کبھی کبھی دراں بچہ دہد خر گوشئے بھی سُن لینا پڑا ہے مگر قصر ناز کی طرح قصر ریش کی طرف طبیعت مائل نہ ہوئی۔

اس وقت ریش مبارک کے ذکر میں ایک غیر متعلق قصہ عنفوان شباب یا اُس سے کچھ پہلے کا یاد آگیا اُسے بھی سُن لیجئے۔ اب تو بہ اعتبار ریش و برودت یہ کہنے کے بھی قابل نہیں ہوں ؎

تشنہ تھا مرا شباب پی لی بھیگیں جو مسیں شراب پی لی،

یہ وہی زمانہ ہے کہ بغیر شراب کے مسیں بھیگ رہی تھیں۔

واقعہ یہ ہے۔ لکھنؤ میں کسی تقریب سرکاری کے ذریعہ سے کچھ والیان ملک بھی آئے تھے۔ داروغہ عباس علی مرحوم الخبیر ویکتائے فن فوٹوگرافر کے دولت خانے پر جس کا اب نشان تک نہیں ہے۔ چند مقتدر نوابین و رؤسائے شہر تشریف فرما تھے۔ منشی نولکشور آنجہانی بھی موجود تھے اور میں بھی۔ کہ ایک رئیس با اختیار مع مختصر اسٹاف کے مرغ زریں بنے۔ آتے نظر آئے۔ اطلاع کے ساتھ ہی سب حضرات تعظیماً استقبال کے لئے بہ عجلت بڑھے۔ دیکھا کہ ریش دونوں جانب پائے پر چڑھی ہوئی۔ شکل مشین۔ چہرہ غضبناک نہ سلام میں خود سبقت کی نہ سلام کا جواب دیا۔ زبان پر لکھنؤ کا نام اور صدہا صلواتیں۔ لعنت اور پھٹکار کی بار بار تکرار اس طرح مقام نشست تک تشریف لائے۔ اور باوصف تلخ گوئی اعزاز کے ساتھ بٹھائے گئے۔ مگر گفتار اور کردار و لہجے میں فرق نہ آیا۔ مزاج پرسی کی جرأت کون

کر سکتا تھا۔ وہ البتہ سخنہائے درشت سے مزاج پرسی فرمائے جاتے تھے کچھ دیر کے بعد جب زبان تالو سے لگی۔ تو ایک سن رسیدہ گرم و سرد دیدہ نواب صاحب نے بہ ادب عرض کیا۔ لکھنؤ سے برافروختگی کا سبب معلوم ہو تو ہم بھی ہم نوا ہونے کی جرأت کریں۔ فرمایا یہ کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ اسلامی شہر مگر جسے دیکھیے داڑھی صاف مسلمان و غیر مسلمان میں امتیاز نہیں نہ مصافحہ و معانقہ کا موقع نہ سلام علیک کا۔ ساتھ ہی پھر لعنت کی تکرار سلسلہ ٹوٹنے پر مسن نواب صاحب نے عرض کیا۔ برافروختگی کا سبب تو معلوم ہو گیا مگر حضور نے خود سبب نہ دریافت فرمایا۔ یہ ادب عرض کرتا ہوں۔ سنئے۔

غدر سے پہلے میں بھی اور سب مسلمانان لکھنؤ بھی۔ ریش کے رکھ رکھاؤ میں آپ ہی کے مقلد تھے۔ ایک دن میں خط بنوا رہا تھا۔ آئینے پر نظر تھی۔ اطلاع پہ اطلاع مسجدوں امام باڑوں کے منہدم کئے جانے اور بے احتیاطی برتنے کی آرہی تھی دفعتاً یہ اطلاع ملی کہ نواب آصف الدولہ کا مشہور امام باڑہ اور اسکی وسیع و حسین مسجد گھوڑوں کا اصطبل بنا دی گئی نہ روک تھام کی طاقت تھی نہ انتقام کی۔ میں نے مشتعل ہو کر خاص تراش سے کہا کہ ریش بھکر مسلمان صورت رہوں اور یہ خبریں سنوں۔ تو اسے صاف کر دے۔ اس کے بعد ہی رئیس صاحب کی طرف ہاتھ بڑھا کر لعنت ہے اس داڑھی پر۔ پھٹکار ہے اس داڑھی پر۔ جواب میں خاموشی تھی اور سناٹا۔ وہ سین اس وقت تک خیال کے ساتھ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ مسن نواب صاحب کے دندان شکن جواب سے بہتر جواب ایسے کج خلق رئیس کے لئے کیا ہو سکتا تھا۔ میں ڈر رہا ہوں سارد ابلی اور مسجد دافران کا معاملہ مسلمانوں کی ریش مبارک پہ حملہ نہ کرے اور میری ریش مبارک پر بھی نہ بن جائے میں نے تو اس امید پر اسے لگا رکھا ہے کہ ؏

خدا شرم دارد ز موئے سفید

ناظرین نگار و تصویر کو صرف میرے اشعار دیکھنا چاہیئے نہ کہ مجھے ؎

کہتا تھا گر خوں سے ریاض شکستہ حال　　مجھ کو نہ دیکھیے مرے اشعار دیکھیے

یہ سنتے ہی۔ میری تصویر یقیناً نظروں سے گر جائے گی اور مذہبی تاریک نقطۂ نظر سے۔ تصویر کھنچوانے کے جرم میں۔ میں بھی۔ رہے اشعار زیادہ حصہ ان کا بھی تاریک ہے۔ خدا کرے یہ بھی ناظرین کی آنکھ کا نور بنے۔ اور کبھی نظر سے نہ گرے۔ میں شعر صرف اپنے لئے کہتا ہوں جو ایسا نہیں سمجھتے ان کو اپنے مذاق کے خلاف خواہ وہ مبتذل اشعار ہوں یا عریاں۔ موقع اور محل کے لحاظ سے ضرورتاً استعمال کرنا چاہیئے ورنہ تضیع وقت اور ادنے مبتذل عریاں مذاق کا ثبوت ؏

ہر سخن وقتے و ہر نکتہ مقامے دارد

ابھی عرض کر چکا ہوں۔ ؏

کالی گوری کوئی نہ چھوٹی!

جو مبتذل بھی [illegible] بھی۔ مگر دوسرے مصرع نے نہ ابتذال باقی رکھا نہ عریانی۔ ضرب المثل کا موقع سے استعمال ہو گیا اور لغت نگاروں کے لئے سند کی وقت رفع ہو گئی۔ میں نے یہ مثالاً کہا نہ کہ اس خیال سے کہ میرے اشعار سند کا کام دینگے۔ دوسری مثال امیر مینائی کے کلام سے پیش کرتا ہوں۔ ارشاد فرماتے ہیں۔ ع سینے پہ چڑھ کے جتنے کیا پیار کیا ہوا اس سے زیادہ ابتذال اور عریانی کیا ہو سکتی ہے۔ یہ کمال شاعری ہے کہ مصرع اول نے ابتذال و عریانی رفع کر کے شعر کو کچھ سے کچھ بنا دیا۔ مصرع اول سننے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ مصرع مبتذل کے لئے مصرع بہم پہنچنا ناممکن تھا۔ نہ اب قوت شعری کوئی دوسرا مصرع بہم پہنچانے کے لئے کار فرما ہو سکتی ہے۔ اب مصرع اول کے ساتھ دوسرا مصرع ملاحظہ فرمائے ؎

اترا ہوا گلے کا ترے ہار کیسا ہوا　　سینے پہ چڑھ کے جتنے کیا پیار کیا ہوا

جناب داغ ارشاد فرماتے ہیں ؎

ایسے کو تو خدا کی قسم چھوڑنا ہے کفر　　مٹی کی بھی ملے تو روا ہے شباب میں

یہ شعر داغ صاحب موزوں نہ فرماتے تو ضرب المثل کے لئے سند کا ملنا دقت سے خالی نہ تھا۔ واقعاتی اسلوب بیان لیا ہے کہ [illegible] وصف ابتذال ادھر سنا ادھر یاد ہو گیا۔ قسم شاہد پرستی کے اعتبار سے ہے یا اثر حسن و شباب کا تقاضائے طبیعت پرتا ہو نہ رہنے کی حالت میں وہی اثر قسم کے استعمال کا حامی ہے۔ یہ شعر خود ہی اجازت نہیں دیتا کہ بے محل اس کو زبان پر لائے۔ اس کا ابتذال بے محل سنانے والے کے لئے الزامی صورت پیدا کرتا ہے نہ کہ کہنے والے کے لئے۔

غالب کا شعر ملاحظہ فرمائیے۔ جس کا مسلمہ صحیح مذاق سخن اور پاکیزگی زبان و قدرت بیان اور رنگینی کم پائی جاتی ہے۔ ؎

دھول دھپا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں　　ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیشدستی ایک دن

قدرت بیان نے بیساختہ زبان کے اتفاقی واقعات نے اس سخت قافیہ کو موزوں کرنے میں۔ شاعری کے کمال فن کو ظاہر کر دیا۔ علیٰ ہذا مستند شعرائے مقدمین متاخرین کے کلام میں ایسے ابتذال و عریانی کے اشعار بھی پائے جائینگے۔

مجھے کہنا صرف یہ تھا کہ میں شعر اپنے لئے کہتا ہوں اگر اور لوگ بھی لطف اندوز ہونے میں اپنا حق سمجھتے ہیں تو بہ اعتبار موقع و محل انکا استعمال کریں ورنہ الزام انکے سر۔ انکی خاطر سے۔ اخلاقی طور پر میں اپنے سر ہی۔ مبتذل گوئی و لغو گوئی کا الزام لے لونگا اور آفریں کے عوض نفریں کو اپنا حصہ سمجھونگا۔ ؎ ریاض

تحسین ناشناس کا صائب ہے شکوہ سنج　　نفرین ناشناس کا ہم کیوں گلہ کریں ،

مجھے اس وقت دور حاضر کے مہذب تعلیم یافتہ شعرا کے مذاق اور زبان شعری سے بحث نہیں ہے وہ صحیح ارتقائی حالت میں ہو یا اسکے برعکس مجھکو دور آخر کے مستند اساتذہ و ثقات شعرا سے ملنے اور مستفید ہونے کا اتفاق ہوا ہے۔ انکے لطیف اشعار کا تو کیا ذکر انکی ہر بات نقش دل ہے۔ میں نے انکے مذاق شعری میں۔ عاشقانہ رنگ بھی

یا صوفیانہ۔ یہاں تک کہ سوقیانہ بھی بہ اعتبار نوعیت کلام قریب قریب یکسانیت دیکھی۔ گو کہنے کا جادہ جدا ہوتا تھا۔ اُنکی انتخابی یکسانیت نے جو متقدمین کے تتبع سے علیحدہ نہ تھی۔ صحیح مذاق سخن کا معیار ہمیشہ کے لئے میرے خیال میں پیدا کر دیا ہے۔ موجودہ دور میں۔ مغربی شعری مذاق نے احترامی تغیرات ضرور پیدا کئے۔ جن سے نظم و نثر دونوں میں ٹکسالی شان کا خاص رنگ جھلکتا نظر آتا ہے۔ اب ہندی نا مانوس الفاظ کی جدید آمیزش کا زیادہ بیجا حصہ اسی طرح دکنی انحرافی اصطلاحات (جو مستند اہل زبان کے اتفاق رائے کے غالباً محتاج ہے) ٹکسالی اردو پر کب تک اور کہاں تک اثر ڈالیں گے ابھی نہیں کہا جاسکتا اور وہ جگہ حاصل کرنے کے بعد دیر پا بھی ہوگا یا نہیں۔ تراجم کے خصوصیات اور اخباری زبان کی امتیاز ہمہ گیر وسعت آئیندہ بہ ترقی جو صورت ٹکسالی اُردو کے لئے اختیار کرے۔ بہ اعتبار بلندی مضامین نہ پاکیزگی تخیل ٹکسالی خصوصیات چھوڑ کر اُردو زبان بہت کچھ سرمایہ دار ہوگئی ہے خدا کرے صحیح زبان اور صحیح مذاق سے جو بیگانگی یا بے نیازی پائی جاتی ہے وہ جاتی رہے کاش انگریزی مذاق و خیالات کے بتتع حضرات ایسے اشعار موزوں کرنیکی طرف اور زیادہ توجہ کو دخل دیں جو مغربی اور ایشیائی مذاق دونوں میں اعلےٰ درجہ مقبولیت حاصل کریں۔

مجھے یاد ہے۔ غازیپور میں شاہ احمد اللہ مرحوم سب جج اور شاہ امجد اللہ مرحوم منصف کے دولت خانے پر چند معزز حضرات بی۔ اے۔ ایم۔ اے پاس تشریف فرما تھے۔ ایشیائی شاعری کے متعلق۔ کسی قدر بُرے پہلو کو لئے ہوئے اظہار خیالات ہو رہا تھا۔

میں نے عرض کیا۔ میرانیس مرحوم و مغفور کے نیچرل مناظر کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ میں امیر مینائی کا ایک شعر سنانا چاہتا ہوں۔ شاید وہ اس صحبت میں درجۂ قبولیت حاصل کرے اور آپ حضرات اس سے بہتر یا اس کے برابر کسی انگریزی شعر کے ترجمہ سے مجھے ممنون فرمائیں۔

اجازت ملنے پر میں نے یہ شعر سنایا ؎

لچک ہے شاخوں میں جنبش ہوا سے پھولوں میں
بہار جھول رہی ہے خوشی کے جھولوں میں

میں نہیں کہہ سکتا سننے والوں پر کب تک وجد کی حالت طاری رہی۔ ممکن ہے یہ صورت میرے بنانیکے لئے اختیار کی گئی ہو۔ کبھی کبھی شعرا کے قلم سے۔ ایسے شعر نکل جاتے ہیں جو مغربی مذاق سے خراج تحسین حاصل کرتے ہیں۔

تقریباً تیس سال سے زیادہ زمانہ ہوا کہ میرا ایک شعر کسی ولایت کے اخبار میں کسی خاص وجہ سے درج ہوگیا جسے پانیر نے بھی اور سول اینڈ ملیٹری گزٹ لاہور نے بھی لیا۔ یہ اتفاق ہے کہ سول اینڈ ملیٹری گزٹ کا وہ ترجمہ خان بہادر سید ناصر علی خاں صاحب حال پنشنر انسپکٹر ٹکٹ مالک صلائے عام دہلی کی نظر سے گذرا۔ ممدوح نے وہ شعر اور اوسکا نوٹ تراش کر مجھے بھیجدیا۔ اور اس کے ساتھ جو الفاظ مجھے لکھے۔ میں اُنھیں مایۂ ناز سمجھا۔ متعدد خطوط بھی

انگریزی داں حضرات کے میرے پاس آئے۔ اور خاص الفاظ سے میری عزت افزائی کی گئی۔

برسبیل تذکرہ وہ شعر ذیل میں درج کئے دیتا ہوں۔ ممکن ہے آپ کو بھی پسند آئے اور اپنے فرمانے میں میرے لئے اخلاقی رعایت سے کام نہ لیا جائے ؎

عالم ہو میں کچھ آواز سی آجاتی ہے
چپکے چپکے کوئی کہتا ہے فسانہ دل کا

میں نے آپ کا بہت وقت ضائع کیا اور ابھی کچھ اور ضائع کرنا چاہتا ہوں۔ شعری مذاق صحیح کی نسبت اوپر کچھ عرض کر چکا ہوں۔ چاہتا ہوں تین چار شعر مذاق صحیح کے ثبوت میں پیش کروں۔

جس زمانہ میں ریاض الاخبار ہفتہ وار اور گلکدہ ریاض ماہوار خیرآباد سے شائع ہوتا تھا اور جس کے مطبع کا تاریخی نام لمعۂ رخشاں تھا۔

اعلےٰ حضور جناب نواب کلب علی خاں بہادر خلد آشیاں نے مجھے میرے استاد حضرت امیر مینائی مرحوم و مغفور کے ذریعے سے یاد فرمایا۔ میں اُس وقت دربار قیصری میں شرکت کے لئے دہلی جانے کو شدت سے بیتاب تھا۔ اس سے پہلے دربار قیصری میں تمام اخبار نویس ہر صوبے سے مدعو کئے گئے تھے۔ انکا کیمپ خاص تھا۔ خیمے بکمال تزئین و تکلف نصب تھے۔ دو اڈیٹروں کے لئے ایک خیمہ ضروری فرنیچر و اسباب آرام کے ساتھ مخصوص تھا کھانے اور ناشتے کے لئے خاص سرکاری اہتمام تھا۔ پرتکلف چائے ہر وقت تیار رہتی تھی۔ چمن بندیاں اعلےٰ پیمانہ پر تا حد نظر ہر طرف تھیں۔ میں بھی منشی نظام اللہ مرحوم مالک ریاض الاخبار بھی۔ دہلی گئے۔ کیمپ کے سوا۔ مولانا ابوالمنصور مرحوم امام فن مناظرہ کے دولت خانے پر بھی مہمان بننا پڑا۔ شب گزاری کا اتفاق وہیں ہوتا۔ کیمپ میں پنجابی اخبار لاہور کا خیمہ ہماری شرکت میں تھا۔ مولانا مرحوم کے بڑے صاحبزادے خان بہادر سید ناصر علی صاحب غالباً موجود نہ تھے۔ بعد کو آگئے۔ آپ کے چھوٹے بھائی سید نصرت علی صاحب مالک نصرت الاخبار دہلی کا زیادہ ساتھ رہا۔ مولانائے مرحوم کی طرف سے مہمان نوازی کا بار انھیں پر تھا۔

دن تو والیان ملک کے عالیشان پرفضا فردوسی کیمپوں میں گزرتا جو دہلی کے باہر کوسوں تک پھیلے ہوئے تھے ہر کیمپ میں لہلہاتے ہوئے چمن زار سجے ہوئے بازار ان کی وضع و قطع انکی آراستگی۔ یہ بھولا ہوا خواب کہاں تک بیان کر سکتا ہوں۔ تمام اڈیٹران اخبار میری ہی طرح کیمپوں کی گلگشت میں رہ کر بقدر مراتب نفع اندوز ہوتے۔ اسی گلگشت میں ظہیر دہلوی مرحوم سے بھی شرف نیاز حاصل ہوا۔ میری باریابی نواب مردان علی خانصاحب بہادر خیرپور سندھ کے حضور میں بہ امتیاز خاص ہوئی تھی۔ مگر لے صرف دو سو روپیہ حضور نواب صاحب اور تمام درباری فارسی زبان کا استعمال کرتے تھے۔ خان قلات کے کیمپ میں بھی دو ایک اخبار نویس پہنچے۔ امیر قلات نے جب دریافت کیا

کون لوگ ہیں تو کہنے والے نے کہا کہیر والا۔ امیر صاحب ان کو گورکن سمجھے متنغص پیدا ہوا اور وہ کیمپ باہر کر دئے گئے۔

مجھے مہاراجہ کشمیر کے کیمپ میں جانے کا اتفاق اس بنا پر ہوا تھا کہ مہاراجہ اس سے پیشتر حسب رونق افروز لکھنؤ تھے تو سیٹھ سیتا رام صاحب تعلقدار لسواں جن کے روابط مہاراجہ سے تھے۔ مجھے بھی اپنے ہمراہ لے گئے تھے مگر اس وقت مہاراجہ بعزم واپسی سوار ہو رہے تھے۔ سرسری شرف تعارف حاصل ہو سکا۔ دربار دہلی کی تقریب میں سیٹھ صاحب موصوف بھی تشریف فرمائے دہلی تھے۔ مجھے بھی مہاراجہ کے کیمپ میں ہمراہ لے گئے۔ درباری کیمپ کے قریب پہونچکر ہمنے دیکھا کہ درباری کیمپ سے شمس العلماء مولانا عبدالحق صاحب علامۂ خیر آبادی کسیقدر منغض آ رہے ہیں۔ کشمیر کے ایک اعلےٰ افسر بھی لجاجت کناں ساتھ ہیں۔ مولانا اسی تنغص کے ساتھ فٹن پر سوار ہو گئے۔ ہم لوگ اڈی کانگ کے خیمے میں چلے آئے۔ ہر طرف خاموشی تھی۔ سیٹھ صاحب نے استفسار فرمایا۔ کیا واقعہ ہے۔ جواب ملا اس وقت مہاراجہ سے ملاقات نہیں ہو سکتی واقعہ یہ پیش آگیا ہے کہ شمس العلما کے تشریف لانے کے واسطے یہ وقت مقرر کیا گیا تھا شمس العلما تشریف لائے۔ مہاراجہ نے براہ تعظیم گوشہ مسند پر جگہ دی۔ مزاج پرسی فرمائی ساتھ ہی حکم دیا کہ ولیعہد کے اتالیق مولانا صاحب کو بھی تکلیف دو وہ بھی تشریف لائے۔ مہاراجہ نے انھیں بھی براہ تعظیم شمس العلماء کے مقابل گوشہ مسند پر جگہ دی ممکن ہے شمس العلما کی نازک مزاجی نے اسے پسند نہ کیا ہو۔ مہاراجہ نے فرمایا مجھے مدت سے آرزو تھی کہ ایسے بلند پایہ علما کا کسی مسئلہ پر مناظرہ دیکھوں۔ یہ سنتے ہی شمس العلماء نے برافروختگی کے ساتھ کہا۔ مہاراجہ آپ نے مرغ اور بٹیر کی پالیاں دیکھی ہوں گی۔ علما کی یہ شان نہیں ہے۔ ساتھ ہی اُٹھ کھڑے ہوئے مہاراجہ کو عرق آگیا۔ شمس العلماء کے روانہ ہوتے ہی مہاراجہ نے افسر اعلےٰ کو بہ ندامت کچھ ایما فرمایا۔ وہ شمس العلماء کے ہمراہ لجاجت کناں فٹن تک آئے۔ شمس العلماء نے کچھ جواب نہیں دیا سوار ہو گئے۔ ہم لوگ بھی بغیر ملاقات واپس آئے۔ مہاراجہ پر اس ناگوار واقعے کا زیادہ اثر تھا۔ میں شمس العلماء کی خدمت میں ان کی فرودگاہ پر برابر جایا کرتا تھا۔ مجھے معلوم ہوا۔ دوسرے روز مہاراجہ کشمیر نے افسر اعلےٰ کے ذریعہ سے گیارہ پارچے کا خلعت اور نقد دو ہزار روپے معذرت کے ساتھ شمس العلماء کی خدمت میں بھیجے۔ شمس العلماء نے بجواب کہا آپ میری طرف سے معذرت اور اظہار افسوس اس وقتی اتفاق پر کیجئیگا مجھے افسوس ہے کہ مہاراجہ نے براہ قدردانی خلعت و نقد سے عزت افزائی کی گر میں اس کے قبول کرنے سے معذور ہوں۔ کیونکہ میں رئیس رام پور کا ملازم ہوں۔ رئیس کی اجازت و منظوری کی ضرورت ہے۔ افسر اعلےٰ مع خلعت و زر نقد واپس گئے۔ یہ پرچہ نواب مشتاق علی خاں بہادر ولی عہد رام پور کو اپنے کیمپ میں گذرا۔ خلد آشیاں بیماری کی وجہ سے دہلی آنے اور دربار قیصری میں شرکت سے معذور تھے۔ پرچہ گذرنے پر خلد آشیاں کو اس واقعہ کی اطلاع تار پر دی گئی۔ تار ہی پر جواب آیا۔ ہماری طرف سے گیارہ پارچے کا خلعت اور نقد دو ہزار شمس العلماء کی خدمت میں پیش کر دیا جائے۔ ایسا ہی ہوا۔ شمس العلماء جو کسی بات پر مدار المہام رام پور سے برہم ہو کر دہلی اس غرض سے آگئے تھے کہ

واپس نہ جائیں اور کسی ریاست میں ملازمت کریں۔ اس قدر افزائی پر دربار قیصری کے بعد رام پور چلے آئے۔ اور پھر خلد آشیاں سے کبھی جدا نہ ہوئے۔ اول سر سالار جنگ بہادر بھی نابالغ فرماں روائے دکن اعلیٰ حضرت میر محبوب علیخاں بہادر کی معیت میں رونق افزا اپنے شاہی کیمپ میں تھے۔ وہیں ہم لوگوں کو اڈیٹر صاحب جریدۂ روزگار مدراس اور حیدرآبادی عفو صاحب وغیرہ سے ملنے کا بار بار اتفاق ہوا۔ ایک روز ہم لوگوں کو گشت میں شام ہو گئی۔ شہر کو واپس آتے ہوئے پرنس آف ارکاٹ مدراس کے کیمپ میں جانے کا اتفاق ہوا۔ نواب ناظر علی خاں بہادر خیرآبادی خویش پرنس آف ارکاٹ پرنس کے ہمراہ شرکت دربار کی غرض سے آئے ہوئے تھے۔ ممدوح ہمارے اور نظام اللہ مرحوم کے قریبی بزرگ عزیز تھے۔ دن میں سوا ناشتے کے کچھ کھانے کا اتفاق نہیں ہوا تھا بلکہ جلد واپس ہونے کا قصد تھا۔ ۹ بجے شب کو واپسی کی اجازت چاہی مگر فرش پر دسترخوان بچھ چکا تھا۔ پہلے مجھ سے یہ اصرار کیا گیا مگر میں نے معذرت کی جب نظام اللہ مرحوم سے کہا گیا وہ بے تکلف دسترخوان پر نظر آئے۔ میری طرف مڑ کر بھی نہ دیکھا کہ میں اشارے سے کچھ کام لیتا میرے لئے صبر کے سوا چارہ کیا تھا۔ کھانے کے ساتھ۔ سرخ سبز مختلف رنگ کی مدراسی شیرینی بھی تھی نظام اللہ مرحوم نے اسکے لئے بھی اشارہ کیا۔ قہر گرسنہ بر جان گرسنہ دسترخوان ختم ہوا تو خوابگاہ کے اندر میزوں کی طرف طشتریاں جاتی نظر پڑیں۔ کچھ دیر کے بعد میں نے اجازت چاہی بزرگ ممدوح نے فرمایا۔ شہر بہت دور ہے رات زیادہ گئی ہے واپس نہیں جا سکتے۔ میں کچھ کہنے بھی نہ پایا تھا کہ نظام اللہ مرحوم نے منظور کر لیا۔ خوابگاہ میں سامان استراحت ہو گیا۔ سب حضرات آرام فرمانے لگے۔ میں گرسنگی کی شدت میں کروٹیں بدل رہا تھا۔ نیند کا کیا ذکر۔ روشنی کم کر دی گئی تھی۔ مجھے کچھ سہارا اتنا تو رنگین شیرینی کی طشتری کا۔ جب ہر طرف سے نفیر خواب بلند ہوئی میں اُٹھا اور دبے پاؤں میز کے قریب پہنچکر ہاتھ بڑھایا۔ ڈلی کا محسوس ہوتا تھا کہ وہ منہ کے اندر پہنچ گئی۔ میں چاہتا یہ تھا زبان پر پہنچنے سے پہلے حلق میں اتر جائے مگر وہ کمبخت سانپ کے منہ کی چھچھوندر بن گئی نہ اگلنے کی نہ نگلنے کی۔ رفیق شئے ہوتی تو آپ مے تلخ کا دہو کھاتے۔ یہ رنگین شیرینی کی ڈلی نہ تھی۔ صابن کی بٹی تھی میری مصیبت کا پورا لطف اُٹھانا ہو تو کچھ دیر کے لئے صابن کی ٹکیہ منہ میں رکھکر کام و دہن کو ممنون کیجئے۔ وہاں سے صاف ہو کر وہ چیز وہیں گئی۔ جہاں سے اُٹھائی گئی تھی۔ پانی کی تلاش میں کسی کی آنکھ کھل جانے کا اندیشہ تھا۔ وہاں کی کارفرمائی منہ کے اندر بھی رہی۔ ہم اس آسانی سے پلنگ تک نہ پہنچ سکے جس طرح وہ چیز منہ تک پہنچی تھی۔ اب صابن اپنی جگہ پر تھا۔ مگر اسکی لذت زبان پر۔ سب حضرات پابند نماز تھے نماز فجر ادا کی۔ ساتھ ہی چائے مع بسکٹ وغیرہ سامنے آگئی۔ میں نے دو چار گھونٹ پی کر بسکٹ اُٹھا کر اتنے زیادہ پیالی میں ڈالے کہ بزرگ ممدوح کو میری طرف توجہ ہو گئی دوسری پیالی بڑھا کر کہا اب بسکٹ اس میں ڈالے جائیں نظام اللہ مرحوم کو ہنسی آگئی جو معنی خیز تھی۔ استفسار پر انھوں نے کہا آپ تمام دن بھوکے رہے تھے۔ پھر بھی شب کو کھانے میں تکلف کیا۔ واپسی کا بھی سہارا ٹوٹا۔ چائے میں تکلف رخصت ہو گیا۔ آپ بسکٹ سے زیادہ بے تکلف ہو گئے۔

میں دل میں خوش تھا کہ خدا نے صابن کے واقعہ کا پردہ رکھ لیا۔ نیاز صاحب یہ اُسی کا اثر تھا آپ نے جب کہا آپ کے ساتھ کھانے میں اس طرح شریک ہو گیا جس طرح کسی کافر کے ساتھ پیتے ہیں۔ خدا کرے یہ کہنے کا کہیں جلد موقع ملے ؎

یہ چھلکتا ہوا کیا جام شراب آتا ہے ، اسے میں قربان مرا عہد شباب آتا ہے ،

کیا صابن کا واقعہ۔ صحیح مذاقِ شعری رکھتے ہوئے آپ کے لئے اچھے شعر سے کم ہے۔

اب میں دربار دہلی کا ذکر چھوڑتا ہوں۔ اس کے لئے بوستان خیال کی ضخامت درکار ہے۔ کمبخت کی یاد یاد جوانی سے کم نہیں۔

یہی کہتے ہوئے وہاں رہے اور یہی کہتے ہوئے واپس ہوئے ؎ ریاض

دربار قیصری کے عجب رنگ ڈھنگ ہیں ، دہلی ہے اور ہم ہیں بتانِ فرنگ ہیں ،

میں دہلی سے آگرے آیا۔ میرے والد ماجد مولوی سید طفیل محمد کوتوال آگرہ تھے دو چار روز ٹھہر کر براہ مراد آباد و رام پور پہنچا۔ استاد مرحوم نے سرکاری مہمان نہ بننے دیا۔ اپنے یہاں ٹھرایا۔ سرکار سے اجازت لیلی تھی دوسرے روز جناب داغ۔ جناب منیر اور بعض شعرا مجھ سے ملنے آئے۔ میں بھی سب حضرات کی خدمت میں تا قیام حاضر ہوتا رہا وہ سب حضرات بھی تشریف لاتے رہے۔ جان صاحب مشہور ریختی گو دو بار روزانہ آتے تھے۔

یہی زمانہ تھا کہ سرکار کا فارسی دیوان۔ لسان الملک وزیر ایران کی اصلاح سے مزین دو معزز سفیروں کی معرفت رام پور آیا تھا۔ سفیر سرکاری مہمان تھے۔ ہر طرف اصلاحات دیوان کا چرچا تھا۔ خلد آشیان کا شغف خاطر بڑھا ہوا تھا۔ میں برسم دیرینہ نواب آفتاب الدولہ خلق سے جا کر ملا جناب اسیر موجود نہ تھے۔

شعرا علماء فضلا و دیگر ممتاز حضرات روزانہ دربار میں جاتے دربار کا وقت ایک بجے سے ۴ بجے تک تھا درباری ہال سے ملا ہوا ایک کمرہ استاد مرحوم کے لئے عوارض کی وجہ سے مخصوص تھا۔ درباری نشستگاہ سے کچھ دور مصاحب منزل کی عمارت تھی۔ سب حضرات وہاں موجود رہتے۔ سرکار جسے یاد فرماتے چوبدار نام لیکر درباری ہال کے آخری دروازے سے پکارتا۔ حضور یاد فرماتے ہیں۔ یہ سلسلہ تا دیر جاری رہتا۔

خلد آشیاں کا شاہی رعب ہر ہستی پر بہت زیادہ اثر انداز تھا البتہ شمس العلما مولانا عبدالحق علامہ خیرآبادی اس سے مستثنیٰ تھے۔ میں بھی مصاحب منزل میں وقت سے کچھ پہلے حاضر ہوا۔ جناب داغ جناب منیر علامہ خیرآبادی منیر دو چار صاحب اور تشریف فرما تھے۔ آنے کا سلسلہ جاری تھا۔ معانقہ و معانقہ و مزاج پرسی کے بعد۔ جناب داغ نے باصرار کچھ سنانے کے لئے مجھے ایما فرمایا۔ بہ تعمیل ارشاد میں نے یہ مطلع پڑھا ؎

ہنگام نزع گریہ یہاں بیکسی کا تھا ، تم ہنس پڑے یہ کونسا موقع ہنسی کا تھا

تحسین و آفرین کی آواز ہر طرف سے ہمت افزائی کے لئے آئی۔ اسی طرح ہر شعر کی داد مجھے ملی۔ میں نہیں کہہ سکتا

تقاضائے اخلاق و مہمان نوازی تھا۔ یا واقعی اشعار اس کے مستحق تھے۔ اس زمن میں ایک شعر ایسا تھا جو بعض حضرات کو یاد رہ گیا۔ میں وہ شعر بھی آپ کے ملاحظے کو یہاں درج کئے دیتا ہوں ؎

یہ اپنی وضع اور یہ دشنام مے فروش سُن کر جو پی گئے یہ مزا مفلسی کا تھا

اب یاد فرمائی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ آواز آئی۔ مولانا عبد الحق صاحب کو حضور یاد فرماتے ہیں۔ اسی طرح منیر و داغ اور دیگر حضرات تشریف لے گئے۔ بیس بچیس کے بعد میرا نمبر آیا۔ خسخانے میں بیرونی روشنی سے آتے گونہ تکلف ہوتا تھا۔ میں اس دروازہ پر پہنچا نگہ رو برو کی صدا بلند ہوتی تھی۔ آواز کے ساتھ ہی مجھے سلام کے لئے جھکنا پڑا۔ درباری سب آداب استاد مرحوم سے دریافت کر کے نقش دل کر چکا تھا۔ سرکار کی نشست تقریباً وسط ہال میں مسہری پر تکیوں کے سہارے تھی۔ ایک صف مسہری کے رو برو جنوب میں اُستاد مرحوم سے شروع ہو کر کسی ادر پر ختم ہوئی ہے دونوں صفوں کے مابین۔ کچھ جگہ چھوٹی ہوئی تھی۔ جس سے نگہ رو برو کی منزل طے کر کے مجھے نذر دینے مسہری کی طرف بکمال ادب دست بستہ نیچی نظر کئے۔ خسخانہ کی خوش گوار کم کم روشنی میں سنگ مرمر کی خنک فرش پر سے گزرنا پڑا۔ نذر پیش کی قبول ہوئی۔ واپسی میں بھی رخ خلد آشیاں کی طرف تھا۔ خدا نے بخیر و خوبی منیر کے برابر نشست کی مشکل آسمان کی زانو شکستہ دست بستہ نیچی نگہ کئے بیٹھ گیا۔ سرکار نے فرمایا ریاض تم نے آنے میں بہت دیر کی معذرت کے الفاظ ختم ہونے پر داغ سے فرمایا۔ ہمارا کچھ کلام ریاض کو سناؤ۔ جناب داغ نے اپنے قامت سے زیادہ کشیدہ و بلند آواز سے اپنے مخصوص انداز میں سرکار کے اشعار سنائے۔ کبھی حضور خود۔ قافیہ و ردیف اور کسی غزل کا مصرع داغ صاحب کو بتا دیتے۔ جس طرز خاص سے اشعار کی داد دیجاتی تھی۔ اس نے حضور کو اس قدر لطف اندوز کیا کہ خود حضور اپنے شعر سنانے لگے۔

دیر تک یہ رنگ قائم رہنے کے بعد ارشاد فرمایا۔ ریاض تم کو فارسی کا بھی شوق ہے۔

سنتے ہی روح مائل پرواز نظر آئی اس لئے کہ اصلاحی دیوان فارسی دیکھنے کا استاد مرحوم نے کچھ موقع اپنے دولت خانے پر دیدیا تھا۔ جس میں بہ کثرت عربی فارسی کے لغت۔ بندشیں خاص۔ بلند مطالب کے سوا زبان بدلی ہوئی۔

مجھے جواباً عرض کرنا پڑا۔ حضور کے فارسی کلام کا بہت مشتاق ہوں۔ حضور نے استاد مرحوم سے بہ انظما قافیہ مخصوص قصیدہ سنانے کی فرمائش کی۔ چوبدار دیوان لایا۔ استاد مرحوم نے اپنے خاص انداز میں بلند آواز سے مطلع پڑھا۔ مجھے اتنا موقع مل گیا تھا کہ منیر مرحوم سے اشارہ کر سکوں۔ روشن ضمیر منیر یقیناً میرا مفہوم سمجھ گئے آپ نے اس وضاحت سے لفظ لفظ کی تعریف کی کہ مجھے منیر کے ساتھ ہمنوا رہنے میں زیادہ دقت نہیں پیش آئی قصیدہ ختم ہونے پر زیادہ دقت گزر جانے سے۔ یکے بعد دیگرے حضرات رخصت ہونے لگے۔ میں بھی اسی سلسلہ میں اپنی قیام گاہ تک پہنچ گیا۔ درباری نشست جس کا اتفاق پھر بھی ہونے والا تھا۔ ایسی نہ تھی کہ میں اسے کبھی بھول سکوں۔

میں جاتے ہی بیمار ہو گیا اور مصنوعی صحت بھی قائم نہ رکھ سکا۔

دوسرے روز استاد مرحوم نے دربار سے واپس آنے پر سرکار کی ایک غزل تضمین عطا فرمائی اور بہ ایمائے سرکار اسی طرح میں غزل کہنے کے لئے بھی ارشاد فرمایا۔ بیماری نے حاضری دربار سے مطمئن کرکے مجھے فکر کا اچھا موقع دیدیا۔ غزل بھی کہی مصرعے بھی لگائے۔ آپ اگر چاہیں گے تو ناظرین نگار کے روبرو مجھے پیش کرنے میں عذر نہ ہوگا۔

میں تو عذر بیماری سے سرکار میں جا نہ سکا۔ استاد مرحوم نے تضمین بھی پیش کی اور غزل بھی۔ وقت حضوری سرکار نے مجھ سے ارشاد کیا اگر مشق سخن رہی تو مجھ سے گوئے سبقت لے جاؤ گے۔

اشعار مندرجہ ذیل حاضرین کو بھی سنائے گئے۔ منیر و داغ نے بھی مجھ سے تعریف کی یہ دونوں شعر لوگوں کو یاد بھی ہو گئے خصوصاً دوسرا شعر وہ شعر یہ ہیں ؎

جس کا تمام خلق نے رکھا ہے خضر نام
کھٹکا ہوا یہ کوئی مرا نامہ بر نہ ہو

با ہم شب وصال اُٹھائے ہیں کیا مزے
وہ بھی یہ کہہ رہے ہیں الٰہی سحر نہ ہو

خلد آشیاں نے چاہا۔ میں رام پور سے واپس نہ جاؤں۔ ماہوار بھی تجویز فرما دی۔ استاد مرحوم نے مجھ سے مشورہ فرما کر اخبار و پریس کی وجہ سے فوراً تعمیل ارشاد میں میری طرف سے اظہار معذرت اور چند روز کے بعد وعدہ حاضری کا اظہار فرمایا جس روز میں رخصتی سلام کو جانیوالا تھا۔ اس سے ایک دن پیشتر استاد مرحوم نے افسردگی کے ساتھ مجھ سے فرمایا کہ شمس العلماء اور داغ صاحب نے ذکر آنے پر سرکار سے عرض کیا کہ دیوان ناظم کی مطبوعہ جلدیں بہ احتیاط کتب خانے میں مدت دراز سے رکھی ہوئی ہیں اگر ریاض کو مرحمت فرمائی جاویں تو پریس و اخبار کی وجہ سے وہ بہت کافی طور پر نفع اندوز ہو سکیں گے۔ سرکار نے بھی یہ تجویز پسند فرمائی۔ میں نے استاد مرحوم سے عرض کیا خیرآباد ایسا مقام ہے جہاں کاغذ بھی آسانی سے فراہم نہیں ہو سکتا۔ استاد مرحوم نے فرمایا آپ ہی سرکار میں وقت رخصت عرض کریں۔ میں خود کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھتا۔

میں نہایت افسردگی کے ساتھ دوسرے دن۔ سلام رخصت کی غرض سے حاضر دربار ہوا سرکار نے بہ لطف خاص ارشاد فرمایا کہ ریاست کو ہمیشہ اپنا گھر سمجھو اور حسب وعدہ تاامکان بے نظیر کے میلے سے کچھ قبل آ جاؤ۔ میں نے عزت افزائی پر دلی شکریہ ادا کیا۔ کچھ غدر کا ذکر اور ریاست کی خدمات بیان فرمائے۔ ساتھ ہی یہ بھی ارشاد ہوا کہ ریاض الاخبار میں اسکا ذکر نہ آنے پائے۔ آخر میں حسب ایما چوبدار۔ ایک کشتی حضور کے روبرو لایا۔ مجھے بھی قریب جانا پڑا۔ حضور نے خلعتی دوشالہ اپنے دست مبارک سے میرے زیب دوش کیا۔ مقررہ آداب دربار کے موافق بہ ادب سلام کرکے جب مکان کو روانہ ہوا تو بے ساختہ یہ شعر موزوں ہو گیا ؎

ریاض اس درجہ دہ نواب کی بخشش یہ عاشق تھی لپٹ کر رہ گئی تقدیر خلعت کے دوشالے میں

استاد مرحوم دربار میں آج تشریف نہیں لے گئے تھے۔ منتظر تھے کہ کاغذ خیرآباد میں نہ فروخت ہونے کی معذرت کا کیا نتیجہ ہوا۔ استاد مرحوم سے زیادہ جناب مفتی طالب حسین صاحب برادر معظم امیرؔ مینائی مرحوم جو غالباً اسوقت مفتی عدالت تھے اور جامع کمالات بھی میرے نتیجۂ رخصت کے منتظر تھے۔ میری واپسی خلعتی دوشالہ عطا ہونے سے بہت خوش ہوئے یہ ذکر ہو ہی رہا تھا کہ گیارہ چوبدار وردی پوش مع جمعدار کے کشتیاں سربند لئے ہوئے آئے۔ جمعدار نے استاد مرحوم سے عرض کیا۔ سرکار نے ریاض صاحب کے لئے یہ کشتیاں بھیجی ہیں۔ ہر کشتی میں دس یا پندرہ جلدیں دیوان ناظم کی تھیں اور ایک کشتی میں کچھ پارچہ اور دو سو روپیہ۔ نقد کے ساتھ کسی چیز کے لینے میں مجھے کیا عذر ہو سکتا تھا۔ استاد مرحوم مع موجودین بہت خوش ہوئے۔ چوبداروں کو استاد مرحوم نے زر انعام دیکر رخصت کیا اور مجھے زردار بنا کر۔

عالم ہمہ افسانہ ما دارد و ما ہیچ

(حقوق نقل محفوظ) (باقی آئندہ)

ریاض خیرآباد اودھ ۱۶ جنوری ۱۹۳۱ء

فہرست کتب موجودہ دفتر رسالہ اردوئے معلیٰ کانپور

جلد رسالہ اردوئے معلیٰ بابت ۱۹۲۵ء و ۱۹۲۶ء مکمل مجلد للعہ

جلد رسالہ اردوئے معلیٰ بابت ۱۹۲۷ء و ۱۹۲۸ء و ۱۹۲۹ء ر للعہ

جلد رسالہ اردوئے معلیٰ بابت ۱۹۳۰ء مکمل و مجلد للعہ

دیوان غالب معہ شرح۔ از حسرت موہانی مع مقدمہ مفید حالات غالب و تنقید کلام غالب عہ

کلیات حسرت موہانی یعنی مجموعہ دواوین حسرت از حصہ اول تا حصہ ہشتم مع ضمیمہ مکمل ے

انتخاب کلیات حسرت موہانی۔ مع ترجمہ انگریزی نہایت عمدہ چھاپا ٹائپ قیمت مجلد عہ

انتخاب سخن از حسرت موہانی گیارہ جلدوں میں

یعنی اردو زبان کے جملہ مستند اور مقبول دیوان شعرا کے نایاب کلام کا انتخاب حسب تفصیل ذیل

انتخاب سخن۔ جلد اول۔ (سلسلۂ شاہ حاتم) یعنی انتخاب دواوین۔ بقا۔ رنگین۔ نثار۔ بیدار۔ تاباں۔ ماہر۔ امیر۔ افسر۔ بیتاب۔ عشرت۔ طالب۔ معروف و شاہ نصیر۔ ۱۰ر

انتخاب سخن۔ جلد دوم۔ (سلسلۂ ذوق) دیوان ذوق جملہ دواوین۔ داغ۔ رسا۔ جگر ۱۰ر

انتخاب سخن۔ جلد سوم۔ (سلسلۂ مومن) دیوان مومن۔ نسیم۔ تسلیم و حسرت موہانی قیمت عہ

انتخاب سخن۔ جلد چہارم۔ (سلسلۂ مظہر) دیوان حسرت۔ یقین۔ حزیں۔ شاکر و بیان۔ گویا۔ مظہر قیمت ۱۲ر

انتخاب سخن۔ جلد پنجم (سلسلۂ جرأت) دیوان حسرت۔ استاد جرأت۔ دیوان جرأت۔ عنبر۔ رضا۔ رقت۔ رضوی۔ محبت۔ نصرت۔ معروف و محبت۔ جلال۔ شائق۔ نساخ و حسرت قیمت (۱۰ر)

انتخاب سخن۔ جلد ششم (سلسلۂ مصحفی) دیوان مصحفی۔ مسرور۔ منظر۔ قیمت (۱۲ر)

انتخاب سخن۔ جلد ہفتم (سلسلۂ آتش) دیوان آتش۔ صبا۔ خلیل۔ ماہ۔ قمر۔ فروغ۔ ۶ر

انتخاب سخن۔ جلد ہشتم۔ (سلسلۂ اسیر امیر) دیوان اسیر۔ امیر۔ دلبر۔

انتخاب سخن۔ جلد نہم۔ (سلسلۂ ناسخ) دیوان ناسخ۔ برق۔ جلال۔ آزاد قیمت ۱۲ر

انتخاب سخن۔ جلد دہم (سلسلۂ غالب) مجروح۔ سالک۔ حالی۔ ذکی۔ شعلہ۔ رشک۔ اسمٰعیل عہ

انتخاب سخن۔ جلد یازدہم (اساتذہ متفرق) دیوان فغاں۔ راسخ۔ ذوق۔ صمیم۔ ندرت۔ فانی۔ عزیز و محشر۔ قیمت ۱۰ر

دیوان شاہ حاتم	۶ر	دیوان علی میاں کامل لکھنوی	۸ر
دیوان میر راسخ عظیم آبادی	۱۰ر	دیوان نوبت رائے نظر لکھنوی	۴ر
دیوان سودا و میر و شاد	۴ر	دیوان نازش بدایونی	۴ر
دیوان میر سوز	۴ر	رسالہ مومن سخن از حسرت موہانی	۶ر
رسالہ متروکات سخن از حسرت موہانی	۶ر	رسالہ نکات سخن۔ رسالہ نکات سخن یعنی فہرست سلاسل شعرائے اردو	۴ر

ملنے کا پتہ: حسرت موہانی دفتر رسالہ اردوئے معلیٰ کانپور

جسم کیلئے خانوں کی اہمیت

جاندار اشیاء کی ساخت تمام حیوانات اور نباتات کا جسم چھوٹے چھوٹے خانوں سے بنا ہوا ہے۔ پودوں میں یہ چھوٹے خانے ایک دوسرے سے ایک باریک جھلی سے علیحدہ ہوتے ہیں۔ لیکن حیوانوں میں ان خانوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ رکھنے کے لئے کوئی جھلی نہیں ہوتی۔ پودوں میں خانہ کی جھلی تمام جسم کو مضبوط اور قوی رکھتی ہے۔ لیکن یہ جھلی خانوں کے باہمی ربط میں کوئی مزاحمت نہیں کرتی۔ کیونکہ جھلی کے بیچ میں سے مادہ حیات کے نہایت مہین مہین تار ایک خانہ سے دوسرے خانہ میں گذرتے ہیں اور ایک نظام کے تمام خانوں کو آپس میں ملاتے ہیں اور اس طرح تمام خانے ہم آہنگی کے ساتھ اپنا فعل ادا کرتے ہیں۔

بعض پودوں میں خانے گُروی ہوتے ہیں۔ لیکن عام طور پر مخروطی منشوری یا کثیر السطح ہوتے ہیں۔ لانبے خانے ریشوں اور نلکیوں[۵۱] کی شکل میں بھی عام طور پر پائے جاتے ہیں۔ خانے اتنے چھوٹے ہوتے ہیں کہ بلا ایک طاقتور خوردبین کے نظر نہیں آسکتے۔ ایک خانہ کا اوسط قطر $\frac{1}{100}$ ملی میٹر تک ہوتا ہے۔ بعض خانے جو درخت کے لئے کسی خاص طور پر مفید ہوتے ہیں ۲ سینٹی میٹر تک قطر رکھتے ہیں۔ اور ایسے خانے جو درختوں میں عرقی نالیوں[۵۲] کا کام دیتے ہیں کئی کئی گز لمبے ہوتے ہیں۔

خانوں کی دریافت کا حال ۱۶۶۵ء میں رابرٹ ہک نامی ایک انگریز محقق نے کاگ کے ایک ٹکڑے کو باریک کاٹ کر خوردبین کے نیچے دیکھا اور معلوم کیا کہ وہ بیشمار چھوٹے چھوٹے خانوں کا بنا ہوا ہے۔ اس نے جو کچھ خوردبین میں دیکھا اس کا نقشہ کاغذ پر اتارا جو اس طرح کا تھا۔

سنہ ۵۱ پودے یا درخت کی ان نلکیوں سے مراد ہے جو جڑ سے تنے تک یا ایک حصہ سے دوسرے حصے تک یا کوئی محلول پہنچاتے ہیں۔

سنہ ۵۲ دیکھو نوٹ نمبر ۵۱

اس کے بعد اس قسم کے نقشے ہم کو ایک اطالوی محقق میلفیجائی کے بنائے ہوئے ملتے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ سترہویں صدی عیسوی میں اس نظریہ کی بنیاد پڑ چکی تھی کہ تمام جاندار اشیا کا جسم چھوٹے چھوٹے خانوں سے بنا ہوا ہے۔

خانہ کے کیمیاوی اجزاء اور انکا فعل

اب ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ یہ خانے درخت کیلئے کس طرح پر مفید ہیں اور کیا کام انجام دیتے ہیں اسکے لئے پہلے ہم کو یہ دیکھنا چاہیئے کہ ایک خانہ کی ترکیب کیا ہے۔ ایک اُبھرتے ہوئے پودے کی نوک سے ایک باریک ٹکڑا کاٹ کر اگر خوردبین کے نیچے دیکھا جائے تو چھوٹے چھوٹے خانے ایک نیم سیال گوند کی قسم کے مادہ سے بھرے ہوئے نظر آئیں گے۔ اس مادہ کو تخم مایہ کہتے ہیں اور اس پر پودے کی نشوونما بلکہ اس کی حیات کا پورا مدار ہے۔ ہر ایک خانہ کی شکل تقریباً ایسی ہوتی ہے۔

ہر ایک خانہ کے اندر ایک کُردی یا بعض اوقات بیضاوی شے ہوتی ہے۔ یہ خانے کے بہت بڑے حصے کو گھیرے رہتی ہے اس کو خانے کا مرکزہ کہتے ہیں ایک صاف دانے دار مادہ جو کہ خانہ کی جھلی اور مرکزہ کے درمیان میں بھرا ہوا ہوتا ہے مادالحیات کہلاتا ہے۔ مادالحیات میں متعدد چھوٹے اور روشن جسیمے ہوتے ہیں جنھیں رنگ دانے کہتے ہیں یہ مرکزہ۔ مادالحیات اور رنگ دانے خانے کے حیاتی اجزا ہیں اور سب مل کر پودے کا تخم مایہ کہلاتے ہیں۔ اگرچہ ابھی تک پودے کا صحیح فعل دریافت نہیں ہوسکا ہے لیکن یہ امر یقینی ہے کہ مرکزہ اور مادالحیات کے باہمی عمل سے خانہ کی زندگی اور خانوں کی زندگی سے تمام پودے کی زندگی قائم ہے۔ اس بات کا بیان کرنا ضروری ہے۔ کہ صرف پودے کے منقسم حصے کے خانے تخم مایہ سے بھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ پودے کے اس حصہ کو منقسم حصہ کہتے ہیں کیونکہ پودے کے نشوونما کا طریقہ یہ ہے کہ ایک خانہ سے تقسیم ہوکر دو اور دو سے چار اور چار سے آٹھ خانے بنتے ہیں۔ خانہ کی تقسیم کا صحیح طریقہ کسی قدر تفصیل کے ساتھ ہم آگے بیان کریں گے۔ جیسے جیسے ہم پودے کے نیچے حصہ کے خانوں کو دیکھتے ہیں جن میں نشوونما کا عمل بند ہوگیا ہے اور خانے کسی خاص فعل کے لئے مخصوص ہوگئے ہیں۔ ہم کو مادالحیات میں خلے ملتے ہیں۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ مادالحیات خانہ کے حجم کی تناسب سے نہیں بڑھتا۔ اس صورت میں

مادالحیات کی ایک پتلی تہ خانہ کی جھلی کے اندر چاروں طرف لگی رہتی ہے اور مرکزہ بھی اسی مادالحیات کی تہ میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے۔ بعض حالتوں میں خلیے کے اندر مادالحیات کی پٹیاں ایک کونے سے دوسرے کونے تک تنی ہوئی ہوتی ہیں ان صورتوں میں مرکزہ اکثر خلیے کے درمیان ان پٹیوں کے ذریعہ سے لٹکا رہتا ہے۔ مرکزہ خواہ کسی مقام پر ہو وہ ہمیشہ مادالحیات میں ڈوبا رہتا ہے۔ اس کا کوئی تعلق خلیے سے نہیں ہوتا۔ ذیل کے نقشوں سے اس بیان کے سمجھنے میں سہولت ہوگی۔
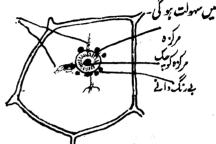
نخزمایہ حیات کی بنیاد ہے

نخزمایہ کے خواص دریافت کرنیکے لئے ہمکو اپنی توجہ نبات متحرک کی طرف لیجانی چاہیئے۔ نبات متحرک ایک قسم کی کائی ہوتی ہے جو تالابوں میں پانی کی سطح پر اکثر تیرتی ہوئی ملتی ہے۔ چونکہ اس کے خانوں میں خوردبین کے نیچے قسم قسم کی حرکتیں نظر آتی ہیں۔ اس لئے اسکو حیوانات اور نباتات کے درمیان رکھا ہے۔ نبات متحرک کی ایک خاصیت یہ ہے کہ وہ اپنی زندگی کے ایک وقت میں بہت سے بے جھلی کے خانوں کا ایک تودہ ہوتے ہیں۔ مادالحیات ایک لوچ دار سیال کی مانند ہوتا ہے جسکے اندر بہت سے چھوٹے چھوٹے ذرات ہوتے ہیں خانہ کی سطح پر سیال ذرا گاڑھا ہوتا ہے اور نسبتاً ذرات کم تعداد میں ہوتے ہیں لیکن درمیان میں سیال ذرا پتلا ہوتا ہے اور ذرات تعداد میں زیادہ ہوتے ہیں۔ ان ذرات سے محقق کے نقطہ نظر سے ایک فائدہ یہ ہے کہ مادالحیات میں جتنی حرکتیں ہوتی ہیں وہ صاف صاف نظر آسکتی ہیں اب ہم بے جھلی کے خانوں کے اس تودے کو خوردبین کے نیچے رکھکر دیکھتے ہیں۔ ہم کو مادالحیات کی ایک مستقل رو خاص سمت میں بہتی ہوئی نظر آتی ہے۔ یہ رو ہر وقت اپنی سمت بدلتی رہتی ہے جس سمت میں مادالحیات اندر حرکت کرتا ہے اسی سمت میں اس تودہ کا حصہ باہر کی جانب ابھر جاتا ہے یعنی مادالحیات کی اندرونی حرکت[۵] تودے کی بیرونی

[۵] حرکتیں کئی وجوہ سے ہوتی ہیں۔ ایک حرکت جو اندرونی حرکت سے متاثر ہو کر ظاہر ہوتی ہے جیسا کہ بیان کیا گیا ہے۔ اور دوسری حرکت کسی بیرونی شے سے مس کرکے پیدا ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر ایسا ایک یکخانوی خوردبینی جانور ہے۔ اس کے سامنے اگر کوئی چیز رکھدی جائے تو فوراً اسکی حرکت کی سمت بدل جاتی ہے۔ یہ بحث علم افعال الاعضاء سے متعلق ہے۔

بیرونی نقل وحرکت کا باعث ہوتی ہے۔ اس نقل وحرکت میں جب بنات متحرک کسی اور چھوٹی شے سے مس کرتی ہے تو اس کو اپنے اندر ہضم کر لیتی ہے جو اسکی خوراک ہو جاتی ہے۔ اسی نقل وحرکت کا نام اصل میں حیات ہے اور اسی سے وہ تمام فعل ظہور میں آتے ہیں۔ جو حیات کو قائم رکھنے کے لئے ضروری ہیں۔ مثلاً خوراک حاصل کرنا۔ ہضم کرنا۔ فضلے کو خارج کرنا وغیرہ۔ اسلئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ تخم مایہ ہی اصل میں زندگی کا مبنیٰ ہے۔

اب ہم تخم مایہ کی حرکت کا۔ خانہ کے اجزا کا اور اُنکے خواص کا ذرا مزید تفصیل کے ساتھ مطالعہ کرتے ہیں۔ تخم مایہ کے اندر عموماً دو قسم کا دوران پایا جاتا ہے ایک وہ دوران کہ تخم مایہ ایک ہی وقت میں مختلف سمتوں میں گھومتا ہوا نظر آتا ہے۔ اسکی رو ہر لحظہ سمت بدلتی رہتی ہے اور کسی خاص راستہ کی بھی پابند نہیں ہوتی۔ دوسرا دوران وہ کہ بغیر اپنی سمت کو بدلے ہوئے رو برابر ایک ہی راستہ پر چلتی رہتی ہے۔ پہلے قسم کے دوران کو ہم گردش غیر وضعی اور دوسرے کو گردش وضعی کہیں گے۔

گردش وضعی

گردش غیر وضعی

گردش وضعی عموماً ان خانوں میں ہوتی ہے جن کا مادالحیات سمٹ کر خانہ کی جھلی کے ساتھ لگجاتا ہے مادالحیات کی رو بھی اس صورت میں جھلی کے برابر بہتی ہے۔ برخلاف اسکے گردش غیر وضعی مادالحیات کے اس حصہ میں بھی ہوتی ہے جو جھلی کے ساتھ ساتھ لگا ہوا ہوتا ہے اور ان پٹیوں میں بھی جو خلیے کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک تنی رہتی ہیں۔ بعض دفعہ یہ رو اپنے ساتھ مرکزہ اور رنگ دانوں کو بھی بہائے پھرتی ہے۔

تخم مایہ کے کیمیاوی خواص

زندہ تخم مایہ کیمیاوی آزمائش پر القلی عمل دیتا ہے اور بعض حالات کے اندر غیر جانب دار لیکن تیزابی[1] عمل کبھی نہیں دیتا۔ یہ بہت سے کیمیاوی

---

[1] القلی۔ غیر جانب دار اور تیزابی عمل۔ یہ کیمیاوی اصطلاحات ہیں۔ القلی کی مثالیں سوڈا (Sodium Carbonate) چونہ (Lime) امونیہ (Ammonia) وغیرہ ہیں۔ تیزابی عمل کی مثالیں۔ گندھک کا تیزاب

(بقیہ صفحہ ۵۱ پر)

مرکبوں کا مجموعہ ہے۔ بعض مرکبات اکثر رد و بدل ہوتے رہتے ہیں۔ جسکی وجہ سے تخمایہ میں زندگی کے گوناگون مظاہر رونما ہوتے ہیں۔ ان مرکبات میں زیادہ اہم پروٹیڈ ہیں۔ دوسرے مرکبات انزائم۔ کاربوہائیڈریٹ اور چربی کی قسم سے ہوتے ہیں۔ چربی بہت پتلے محلول کی صورت مین موجود ہوتی ہے۔ پوٹاش کے محلول میں تخمایہ کے تمام اجزا حل ہوجاتے ہیں۔ آئیڈین کے عمل سے اس کا رنگ زردی مائل بھورا اور پارے کے نائیٹریٹ سے گلابی سرخ ہوجاتا ہے۔ ان عملوں سے تخمایہ فوت ہوجاتا ہے۔

خوردبین نے اور بعض کیمیاوی محلول نے خانوں کے چھوٹے سے چھوٹے اجزا کی تحقیق کو بہت آسان کردیا ہے۔ پودے کے جس حصہ کے خانہ کو ہم دیکھنا چاہیں کہ اس کے اندر کیا عمل ہو رہا ہے اور کیا کیا تغیرات ہو رہے ہیں۔ اس کا طریقہ جو تمام تجربے خانوں میں استعمال کیا جاتا ہے یہ ہے کہ اس پر ایک خاص اثر رکھنے والا کیمیاوی محلول ڈالدیں اور پھر اس پر دو ایک اور متعلقہ کیمیاوی عمل کرنے سے اس حصہ کے تمام خانے جس صورت میں ہوں گے۔ اسی صورت میں مردہ ہوجائیں گے۔ اور پھر کسی مزید تبدیلی کے قابل نہیں رہیں گے۔ یہ قدرتی بات ہے کہ ایک حصہ کے متعدد خانے ایک وقت میں نشو و نما کے مختلف مدارج پر ہوں گے۔ کوئی خانہ نشو و نما کی کسی منزل پر ہوگا اور کوئی کسی پر۔ ان مختلف مدارج اور منازل کو خوردبین کے نیچے رکھ کر نشو و نما کی پوری مسلسل کہانی بنائی جاسکتی ہے۔

پیشتر اس کے کہ پودوں کی نشو و نما یعنی خانہ کی تقسیم کا طریقہ دریافت کریں یہ بہتر ہے کہ خانے کے ان اجزا کا جو اس تقسیم میں حصہ لیتے ہیں۔ ذرا تفصیل کے ساتھ مطالعہ کرلیں۔ یہ مطالعہ معملوں میں اسطرح ممکن ہے۔

(بقیہ صفحہ ۵۰ ملاحظہ ہو)

(Sulphuric Acid) شورہ کا تیزاب (Hydrochloric Acid) طعامی نمک کا تیزاب (Nitric Acid) فاسفورس کا تیزاب (Phosphoric Acid) وغیرہ ہیں۔ ایک القلی اور تیزاب باہم ایک مقررہ مقدار میں ملانے سے کسی قسم کا نمک بنجاتا ہے۔ جو غیر جانبدار ہوتا ہے یعنی نہ القلی کا عمل دیتا ہے نہ تیزابی عمل۔ اسکی عام مثال معمولی نمک ہے جس کا کیمیاوی نام (Sodium Chloride) ہے۔ ان کیمیاوی صفات کی شناخت کے کئی ذریعے ہیں منجملہ انکے ایک طریقہ جو عموماً معملوں میں استعمال کیا جاتا ہے یہ ہے کہ لٹمس محلول (Litmus Solution) جو معمولی طور پر ارغوانی رنگ کا ہوتا ہے القلی کے عمل سے نیلا ہوجاتا ہے اور تیزابی عمل سے سرخ ہوجاتا ہے غیر جانبدار اشیا کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ یعنی لٹمس محلول اگر تیزابی عمل سے سرخ کردیا جائے تو غیر جانبدار شے کس مقدار میں اس میں ڈالی جائے وہ سرخ ہی رہیگا۔ اسی طرح اگر وہ القلی عمل سے نیلا کردیا گیا ہے تو اس صورت میں نیلا ہی رہے گا۔ لیکن اگر سرخ لٹمس میں القلی صرف اس قدر ڈالا جائے کہ تیزاب کے ساتھ ملکر نمک میں تبدیل ہوجائے تو لٹمس اپنا ارغوانی رنگ اختیار کرلے گا۔ مزید القلی ڈالنے پر وہ نیلا ہوجائیگا۔

کہ کیمیاوی محلول خانے کے مختلف اجزاء کو مختلف رنگ دیتے ہیں۔ مثلاً ایک کیمیاوی محلول سے خانہ کا کوئی جزو زرد۔ کوئی سرخ۔ کوئی نیلا۔ کوئی سبز ہو جاتا ہے اور اس طرح تمام اجزاء کی علیحدہ علیحدہ شناخت ہو سکتی ہے۔ خانہ کا جزو اعظم مرکزہ ہے۔ مرکزے عموماً گروی۔ بیضاوی یا عدسی ہوتے ہیں۔ لمبے خانوں میں مرکزے لمبے بھی ہوتے ہیں۔ مرکزہ خانہ کا تقریباً دو تہائی حصہ گھیرے رکھتا ہے مختص اور مستقل حصہ کے خانوں میں مرکزے بہت چھوٹے ہوتے ہیں۔ چوب ساقی پودوں میں ایک خانہ میں عموماً ایک ہی مرکزہ ہوتا ہے لیکن اکثر سمارودغی اور بعض صوف البحری[۵] پودوں میں ایک ایک خانہ میں کئی کئی مرکزے بھی ہوتے ہیں۔ مرکزہ کے اندر ایک یا ایک سے زیادہ گول اور بہت روشن ذرے ہوتے ہیں۔ جنکا فعل ابھی تک پوری تحقیق کے ساتھ دریافت نہیں ہوا۔ انکو مرکزہ کو چک کہتے ہیں۔ مرکزہ ایک جھلی سے ملفوف ہوتا ہے۔ یہ جھلی مرکزہ کے اردگرد کے مادالحیات کو مرکزہ کے اندرونی سیال (مرکزی سیال) سے علیحدہ رکھتی ہے مرکزہ کے اندر پروٹیڈ کا ایک جال ہوتا ہے جسکی جالیوں میں کوچک مرکزے پھنسے ہوتے ہیں۔

خانہ کا دوسرا جزو رنگ دانے ہیں۔ منقسم حصہ[۵] میں رنگ دانے مرکزے کے اردگرد رہتے ہیں۔ یہ گول یا تکلے کی شکل کے ہوتے ہیں۔ پودے کے مختص حصے میں یہ تین مختلف قسموں کے ہوتے ہیں۔

(۱) خضر دانے (۲) رنگین دانے (۳) بے رنگ دانے

(۱) پودے کے ان حصوں میں جو روشنی کے سامنے رہتے ہیں رنگ دانے خضردانوں کی شکل میں مبدل ہو جاتے ہیں۔ یہ سبز رنگ کے چپٹے دانے ہوتے ہیں اور خانے کے سطحی حصے پر لگے رہتے ہیں۔
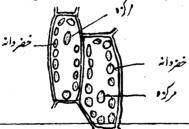
[۵] منقسم حصہ پودے کے اس حصہ کو کہتے ہیں جس میں خانہ کی تقسیم جاری ہو۔ یہ حصہ عموماً پودے کی نوک پر ہوتا ہے۔ برخلاف اسکے مختص حصہ وہ حصہ ہے کہ جس میں خانے تقسیم نہیں ہوتے بلکہ کسی خاص فعل کے لئے مخصوص ہو جاتے ہیں۔

[۵] چوب ساقی پودے (Cormophytes) ان پودوں کو کہتے ہیں جن میں تنے اور جڑ موجود ہوں۔ سمارودغی پودوں (Fungi) کی عام مثال پھپوندی ہے جو نم چیزوں پر اگ آتی ہے صوف البحری پودوں (Algae) کی عام مثال کائی ہے۔

خضر دانے پودے کے لئے ہوا سے خوراک حاصل کرنے کو نہایت ضروری ہیں جس عمل کے ذریعہ سے یہ پودے کو خوراک بہم پہنچاتے ہیں اسکو استحالہ کاربن یا شعائی ترکیب[۵۷] کہتے ہیں۔ یہاں یہ موقع نہیں ہے کہ استحالہ کاربن کی پوری تفصیل کی جائے تاہم اتنا بیان کرنا ضروری ہے کہ خضر دانوں کے ذریعہ سے پودے کاربن ڈائی آکسائڈ کو جو ہوا کے اندر ملا ہوا ہوتا ہے اپنے اندر جذب کر لیتے ہیں۔ کاربن ڈائی آکسائڈ پودوں کی خوراک کا ایک بڑا حصہ ہے۔ جن پودوں میں خضر دانے نہیں ہوتے وہ کاربن ڈائی آکسائڈ کو اپنی خوراک کے لئے استعمال نہیں کر سکتے۔ خضر دانے کے اندر چار رنگ ہوتے ہیں اول نلاگی مائل سبز کلوروفل یا خضر مایہ الف۔ دوم زردی مائل سبز کلوروفل یا خضر مایہ۔ب۔ یہ دونوں رنگ تین اور ایک کی نسبت میں ہوتے ہیں۔ سوم نارنجی سرخ قروطین یا گجر مایہ۔ یہ رنگ گاجر کی جڑ میں کثرت سے ہوتا ہے۔ چہارم زرد زنتوفل یا زرد مایہ۔ خضر مایہ کی کثرت کی وجہ سے خضر دانے کا رنگ سبز ہی نظر آتا ہے۔ ان چاروں رنگ میں سے مذکورہ بالا صرف دو کلوروفل ہی استحالہ کاربن کے لئے مفید ہیں۔

(۲) رنگین دانے۔ یہ دانے پودے کے حصوں کو زرد اور سرخ رنگ دیتے ہیں۔ خصوصاً پھول اور پھل کو یہ شکل میں خضر دانوں کی مانند ہوتے ہیں۔ لیکن ان سے چھوٹے ہوتے ہیں۔ یہ عموماً زرد اور نارنجی سرخ ہوتے ہیں جو زنتوفل یا قروطین کے اوپر منحصر ہے۔

(۳) پودے کے اندرونی حصوں میں جہاں روشنی کا گذر نہیں ہوتا بے رنگ دانے پائے جاتے ہیں یہ بہت چھوٹے ہوتے ہیں اور اگر کسی وجہ سے یہ دانے روشنی کے سامنے آجائیں تو یہ بھی خضر دانوں میں منتقل ہو جاتے ہیں۔ منجملہ اور کاموں کے بے رنگ دانوں کا ایک کام یہ ہے کہ وہ شکر کو نشاستہ[۵۸] میں تبدیل کر دیتے ہیں۔

اب ہم کو دیکھنا یہ ہے کہ ایک جاندار کی نشو و نما کس طرح ہوتی ہے اور خانہ کی تقسیم کا کیا طریقہ ہے۔ اس سلسلہ میں ہمیں یہ خیال رکھنا چاہیئے کہ نخزمایہ یا مادالحیات۔ مرکزہ۔ رنگ دانے وغیرہ کبھی غیر موجود شئے سے خود بخود نہیں

---

۵۷ استحالہ کاربن کی بحث علم افعال الاعضاء کے اندر آتی ہے۔ لیکن مختصراً اسکی ترکیب یہ ہے کہ پودا روشنی میں کاربن ڈائی آکسڈ گیس اپنے اندر جذب کرتا ہے (اسی وجہ سے اس عمل کو شعائی یا ضیائی ترکیب بھی کہتے ہیں) یہ گیس پودے کے اندر پانی سے مل کر فارمیلڈی ہائیڈ بنتا ہے اور آکسیجن گیس باہر نکلتا ہے۔ فارمیلڈی ہائیڈ کے چھ سالے ایک کیمیاوی ضابطہ کے ماتحت یکجا ہو کر شکر کے ایک سالمے کے اندر تبدیل ہو جاتے ہیں۔ یہ شکر پودے کی خوراک کے کام آتی ہے۔

۵۸ شکر نشاستہ میں تبدیل ہو کر پودے کی خوراک کے کام نہیں آسکتی۔ اس لئے ضرورت ہوتی ہے کہ جو شکر فوری خوراک سے زائد ہو وہ نشاستہ میں تبدیل ہو کر آیندہ ضرورت کے لئے محفوظ رہے۔ ضرورت کے وقت یہ نشاستہ کیمیاوی مرکبات کے ذریعہ سے جو پودے کے اندر موجود ہوتے ہیں۔ پھر شکر کی صورت میں تبدیل ہو کر خوراک کے کام آسکتا ہے۔

تھے۔ بلکہ ہمیشہ وہ اپنی موجودہ جنس سے تقسیم ہوکر ایک سے دو، دو سے چار اور چار سے آٹھ ہوتے ہیں۔ تقسیم کے طریقہ سے ایک خانہ سے متعدد خانے اور ایک مرکزے سے متعدد مرکزے ہونا ایک جسمیہ کا نشو و نما ہے۔

خانے کی تقسیم کے طریقے

اصل میں تقسیم کا عمل مرکزے سے شروع ہوتا ہے۔ مرکزے کی تقسیم کے دو طریقے ہیں۔ (۱) تقسیم مستقیم (۲) تقسیم غیر مستقیم۔

(۱) تقسیم مستقیم اس طرح ہوتی ہے کہ خانہ بڑھتے بڑھتے جب کافی حجم اختیار کرلیتا ہے تو مرکزہ بیچ میں سے کٹ کر دو رہو جاتے ہیں۔ اور پھر اس کے ارد گرد کا سیال اور خانہ کی جھلی بھی اسی طرح کٹ جاتی ہے اور تقسیم پوری ہوجاتی ہے۔

(۲) تقسیم غیر مستقیم ذرا پیچیدہ طریقہ ہے۔ مرکزہ کا باریک جال سمٹنے لگتا ہے اور یکجا ہوکر متعدد ٹکڑوں میں تقسیم ہوجاتا ہے۔ یہ ٹکڑے شروع میں تار کی مانند ہوتے ہیں۔ لیکن بعد میں چھوٹے اور موٹے ہوجاتے ہیں۔ تب ہم ان کو لونی پارے کہتے ہیں (دیکھو تصویر نمبر ۳) پھر ہر ایک لونی پارہ طولی سطح سے دو برابر لونی پاروں میں تقسیم ہوجاتا ہے (تصویر نمبر ۴) اس طرح لونی پارے تعداد میں دو چند ہوکر خانے کی استوائی سطح پر برابر دو لائنوں میں جمع ہوجاتے ہیں۔ (تصویر نمبر ۵)

اسی درمیان میں مرکزے کے باہر مادالحیات کے تار مرکزی جھلی پر چمٹ کر اسکے اوپر ایک تہ بنالیتے ہیں یہ تہ دو مقابل نقطوں پر ذرا ابھری ہوئی ہوتی ہے۔ ان نقطوں کو ہم قطبی نقطے کہیں گے (تصویر نمبر ۴) اسوقت
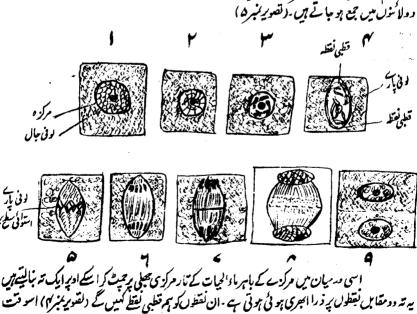
مرکزی جھلی اور مرکزہ کو چک تحلیل ہو کر غائب ہو جاتے ہیں اور اس طرح قطبی نقطوں کے ریشوں کو مرکزی شکم کے اندر بڑھنے کا موقع ملتا ہے۔ اندر پہونچ کر یا تو یہ لونی پاروں سے مل جاتے ہیں یا ایک قطبی نقطہ کے ریشے دوسرے قطبی نقطہ کے ریشوں سے اس طرح مل جاتے ہیں کہ تکلے کے شکل کی ایک مسلسل لکیر قطبین کے درمیان قائم ہو جاتی ہے (تصویر نمبر ۵) اب ذرا لونی پاروں کی دونوں لائنوں پر غور کیجئے۔ یہ دونوں لائنیں ایک دوسرے سے ہٹتے ہٹتے ایک اس قطب پر پہنچ جاتی ہے اور دوسری دوسرے قطب پر (تصویر ۶ و ۷) قطبین پر لونی پاروں کے دو تودے بنجاتے ہیں اور مادالحیات ان کے چاروں طرف ایک جھلی بنا کر انکو گھیر لیتا ہے۔ لونی پارے اس اثنار میں گڈ بڑ ہو کر ایک جال کی شکل اختیار کر لیتے ہیں (تصویر نمبر ۸)۔ اب ایک مرکزے سے تقسیم ہو کر دو مرکزے تیار ہو گئے۔ یہ مرکزے بڑھ جاتے ہیں۔ اور ہر ایک کے اندر ایک ایک دو دو کو چک مرکزے پھر نمودار ہو جاتے ہیں۔ (تصویر نمبر ۹) جب لونی پارے قطبین پر جمع ہوتے ہیں تو باریک باریک ذرے استوائی سطح پر جمع ہو جاتے ہیں۔ اور ایک جھلی بنا لیتے ہیں (تصویر ۷ و ۸) یہ جھلی بڑھتے بڑھتے خانہ کی دیواروں تک آجاتی ہے۔ جسوقت دو مرکزے مندرجہ بالا طریقہ سے تیار ہو جاتے ہیں تو یہ جھلی بیچ میں سے پھٹ جاتی ہے۔ یعنی پورا خانہ دو برابر خانوں میں تقسیم ہو جاتا ہے (تصویر نمبر ۹)

اوپر بیان کئے ہوئے مشاہدوں سے یہ بات حل ہو گئی ہے کہ حیات کے تمام مظاہرے خانہ کے سیال میں تخمایہ پر مبنی ہیں۔ کائنات میں ایسے بے شمار چھوٹے چھوٹے خوردبینی زندہ جسم ہیں۔ جو صرف ایک ہی خانے کے بنے ہوئے ہیں۔ اور ان کے اندر پوری طرح حیات موجود ہے اور وہ زندگی کے تمام افعال اسی طرح ادا کرتے ہیں جس طرح کثیر الخانوی جانور۔ پودے اور درخت وغیرہ۔

شمعون احمد

تیار ہے

نگارستان
(جدید اڈیشن معہ کچھ اضافہ کے)
علاوہ محصول عہ
"مینجر نگار"

شہاب کی سرگذشت
(نہایت خوبصورت جدید اڈیشن)
علاوہ محصول (عہ)
"مینجر نگار"

روپ کا نشہ

اپنی سسرال میں بیوہ حمیدہ گذر کا کوئی سہارا نہ دیکھکر اپنے میکے آگئی ظفر علی اپنی بیٹی کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ وہ اپنے ضعیفی کا زمانہ تنہا کاٹ رہے تھے۔ بیوی کئی سال پہلے مرچکی تھی اب حمیدہ کے سوا ان کا دنیا میں اپنا کوئی عزیز نہ رہ گیا تھا۔ انھوں نے سوچا کہ کچھ دنوں کے بعد حمیدہ کی کسی اچھی جگہ شادی کردینگے۔

آس پاس کے گانوں میں ظفر علی ایک نامی پہلوان سمجھے جاتے تھے۔ کئی کشتیاں مار چکے تھے سینکڑوں شاگرد تھے۔ اس ضعیفی کے عالم میں بھی جب وہ لنگوٹ کس کر اکھاڑے میں کودتے تو جسم فولاد بن جاتا۔ ان کے داؤں پیچ کو دیکھکر لوگ عش عش کرنے لگتے۔ کشتی سے ظفر کو عشق تھا اسکے علاوہ اسے اور کسی چیز کا شوق نہ تھا۔ اٹھتے بیٹھتے جب دیکھو تو کشتی ہی کی بات چیت۔ ان کے لئے یہ دنیا کشتی۔ اکھاڑہ اور پہلوان ہی کے لئے بنی تھی۔ اسی میں انھوں نے اپنا لڑکپن گذارا۔ جوانی ختم کی اور بڑھاپا آگیا۔ ماں باپ کے مرنے پر ظفر نے آنسوؤں کی دو چار بوندیں تو ضرور گرائی تھیں لیکن اکھاڑے میں جانا آنا کبھی بند نہیں ہوا۔ اکلوتی لڑکی حمیدہ بیوہ ہوئی اس صدمہ سے ان کا کلیجہ پھٹ گیا لیکن اکھاڑے کی حاضری میں کوئی کمی نہ کی۔

کھانے پینے کی طرف سے ظفر کو بے فکری تھی۔ کھیتوں میں کافی اناج پیدا ہوجاتا۔ گھی دودھ کے لئے بھینس اور گائیں پلی تھیں۔ باہر کا کام شاگردوں سے کرالیتے حمیدہ کے آنے سے گرہستی کی طرف سے بھی اطمینان ہوگیا۔ اور ظفر بڑی بیفکری سے اکھاڑے کا کام دیکھنے لگے۔ یوں تو سینکڑوں شاگرد تھے۔ لیکن عنایت سے بڑھکر ظفر کو اور کوئی عزیز نہ تھا۔ وہ ان کا شاگرد رشید تھا۔ پہلوانوں میں جو خوبیاں ہونی چاہیئے عنایت میں وہ سب موجود تھیں۔ بڑا خوبرو۔ ہنس مکھ اور طاقتور جوان تھا۔ استاد ظفر اسکو اپنے لڑکے کی طرح سے مانتے تھے۔ اس پر انھیں اتنا اعتبار تھا کہ حمیدہ سے بھی کوئی پردہ نہ کراتے۔

استاد کے کام سے عنایت کو قریبًا روزانہ گھر کے اندر جانا پڑتا۔ اس کو حمیدہ سے بھی باتیں کرنے کا موقع ملتا حمیدہ بھی اس سے بلا تکلف ملتی۔ عنایت اُسے اپنے اُستاد کی لڑکی سمجھتا اور حمیدہ اُسے اپنے باپ کا شاگرد رشید سمجھتی۔ عنایت حمیدہ کی طرف مودبانہ نظروں سے دیکھتا اور حمیدہ اس پر مہربان رہتی تھی۔ یہ ادب و مہربانی کے خیالات دونوں کے دلوں میں نہ معلوم کتنے دنوں تک جاگزیں رہے۔

مطبوعات موصولہ

HINDOUSTAN PHONETICS

جناب سید محی الدین قادری زور ایم۔اے۔پی۔ایچ۔ڈی نے انگریزی میں یہ رسالہ اس موضوع پر لکھا ہے کہ دکن کے اہل علم کی اردو زبان کا لہجہ کیا تھا۔

جناب زور حیدرآباد کے اُن مخصوص طلبہ میں سے ہیں۔ جنھوں نے ولایت جاکر صحیح معنے میں علم حاصل کیا اور دوسروں کو اس سے مستفید کیا۔ آپ نے وہاں لسانیات کی اعلےٰ ڈگری لینے کے بعد بھی سلسلۂ تحقیق و تفتیش جاری رکھا ہے۔ جس کا بالکل تازہ نتیجہ یہ کتاب ہے۔

اس موضوع پر غالباً یہ بالکل پہلی کتاب ہے۔ اور اگر اردو میں ہوتی تو ہم کہتے کہ یقیناً ـــــ

جناب زور نے پہلے تاریخی روشنی اس مسئلہ پر ڈالی ہے اور شمالی و جنوبی لب لہجہ کے اختلاف سے بحث کی ہے۔ اس کے بعد تین ابواب میں محض صوتیات سے متعلق ایک جامع گفتگو کی گئی ہے۔

یہ کتاب پیرس میں طبع کرائی گئی ہے۔ جہاں آج کل جناب زور مقیم ہیں۔ لیکن مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن سے بھی دستیاب ہو سکتی ہے۔

علاؤالدین خلجی

جناب سلطان حمید صاحب ایم۔اے۔ایل۔ایل۔بی ساکن اٹاوہ نے انگریزی میں علاؤالدین خلجی کے حالات پر یہ کتاب تحریر فرمائی ہے۔

علاؤالدین کو تاریخ ہند میں جو اہمیت حاصل ہے کسی سے مخفی نہیں۔ کیونکہ ہندوستان کا وہ دور انتہائی اضطراب کا دور تھا اور علاؤالدین نے اسی زمانہ میں نہایت کامیاب حکومت کی اور نظم و نسق کی ایسی مزین مثالیں اس نے قائم کیں کہ مشکل ہی سے کوئی دوسری نظیر اسکی ملسکتی ہے۔

ہمیں مسرت ہے کہ جناب سلطان حمید صاحب نے اس کتاب کو اصل ماخذ سے مرتب کیا ہے اور کافی داد تحقیق دی ہے۔ ضرورت ہے کہ مدارس انگریزی میں اس قسم کی تاریخی کتابوں کو جگہ دی جائے۔ مغربی مصنفین کی تصانیف تاریخ کافی طور پر یہاں کی آبادی کے دل و دماغ کو مسموم کر چکی ہیں۔

دولت غزنویہ

مولفۂ مولوی محمود الرحمان صاحب ندوی۔ چھوٹی تقطیع کے ۳۹۲ صفحات کو محیط ہے اور دو روپیہ میں کتب خانۂ دار الادب لاہور سے مل سکتی ہے

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، اس کتاب میں دولت غزنوی کی تاریخ درج کی گئی ہے، لیکن غالب حصہ محمود کے حالات و تذکرہ کا ہے، کیونکہ حقیقتاً دولت غزنوی عبارت ہی ایک اوسی کی ذات سے۔

محمود غزنوی کو انگریزی مصنفین نے صرف ایک بُت شکن کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ اور اس میں کلام نہیں کہ واقعۂ سومنات سے اس کی اس حیثیت کو زیادہ نمایاں کرنے کا موقع سیاسی مورخین کو ملجاتا ہے، لیکن یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ محمود میں رواداری عفو و درگزر بھی اس حد تک تھا کہ اگر اسکی بُت شکنی کے ساتھ ساتھ اس پر نگاہ ڈالی جائے تو خود بت پرست قوم اس کی عزت کرنے پر مجبور ہوسکتی ہے۔

مولوی صاحب موصوف نے اسی نقطۂ نظر کو سامنے رکھکر یہ تاریخ لکھی ہے اور کافی داد تحقیق دی ہے، ہر چند حوالہ کے اظہار کی پابندی نہیں کی گئی، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس کی ترتیب میں اصل ماخذوں کو نظر انداز نہیں کیا گیا ہے، عبارت بہت صاف شگفتہ ہے اور انداز بیان دلچسپ طباعت و کتابت بھی کافی دلکش ہے۔

نیرنگِ زمانہ

تذکرہ ہے دور جہانگیری کی اس مہتم بالشان جلیل القدر ہستی کا جس کا اصل نام زمانہ بیگ تھا اور جو بعد کو موتمن الدولہ خانخانان سپہ سالار اعظم نواب مہابت خاں کے طویل الذیل القاب وخطابات سے مشہور ہوا۔

عہد جہانگیری میں کوئی اہم یا قابل ذکر واقعہ ایسا نہیں ہوا جس کا تعلق کسی نہ کسی طرح مہابت خاں سے نہ رہا ہو، اور اسی لئے اس زمانہ کی تاریخ کا مطالعہ کرنے والے کیلئے ناگزیر ہے کہ وہ صفحات تاریخ میں باربار مہابت خاں کا نام پڑھے۔ لیکن چونکہ تاریخ کے واقعات منتشر ہوتے ہیں، اس لئے اُن کو یکجا کرکے کسی ایک ہستی کے متعلق مخصوص واقعات و حالات کو سلسلہ و ترتیب سے مرتب کردینا آسان کام نہیں، بنابراں ملک کو شکر گزار ہونا چاہیئے۔ جناب شیخ علی حسن صاحب منصرم ریاست محمود آباد کا جنھوں نے اس مشکل فرض کو نہایت خوبی سے انجام دیا اور ایک خوبصورت کتاب کی شکل میں مہابت خاں کے حالات زندگی کو جو تزک جہانگیری۔ جہانگیر نامہ۔ شاہجہاں نامہ۔ سیر المتاخرین۔ ماثر الامرا اور دربار اکبری وغیرہ میں منتشر طور پر پائے جاتے تھے، یکجا کردیا۔

اس کتاب کے ۲۱۹ صفحات ہیں، لیکن عبارت اس قدر شگفتہ، انداز بیان ایسا دلچسپ ہے کہ مشکل ہی سے ایک شخص اس کو شروع کرنے کے بعد بغیر ختم کئے ہوئے رہ سکتا ہے، جا بجا مفید حواشی سے

اس کتاب کی اہمیت کو اور زیادہ بڑھا دیا ہے۔ قیمت درج نہیں ہے، لیکن منصرم صاحب موصوف سے خط و کتابت کرنے پر معلوم ہو سکتی ہے۔

تاریخ ریاست حیدر آباد دکن ہمارے صوبہ متحدہ کے مشہور مصنف و مورخ مولوی محمد نجم الدین خانصاحب رامپور کی تالیف ہے جو ۶۲۷ صفحات میں ختم ہوئی ہے۔

اس تالیف کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصہ میں دکن کی جغرافی و طبعی خصوصیات کے علاوہ خاندان آصف جاہی کے مورث اعلےٰ عابد خاں تاتاری سے لیکر سید محمد خاں صلابت جنگ تک کے تمام واقعات و حالات درج کئے گئے ہیں اور اسی سلسلہ میں عہد محمد شاہ کی تاریخ بھی ضمناً آگئی ہے۔ اور مرہٹوں کا خروج اور احمد شاہ درانی کی حملہ آرائیاں بھی بیان کی گئی ہیں۔ دوسرے حصہ میں میر نظام علی خاں آصف جاہ ثانی سے لیکر آصف سابع (موجودہ فرمانروائے دکن) تک کے زمانہ کو لیکر تمام واقعات و حالات کا اس قدر جزدی استقصاء کیا گیا ہے کہ فاضل مولف کی محنت و کاوش کی بے اختیار داد دینا پڑتی ہے۔

دکن کی تاریخ، تاریخ ہند کی ایسی اہم کڑی ہے کہ جب تک اس کا مطالعہ نہ کیا جائے، اُس عہد کی سیاسیات کا سمجھنا محال ہے، اور اس نکتہ کو اس قدر تکمیل کے ساتھ اُس تاریخ میں پیش نظر رکھا گیا ہے کہ اگر تاریخ ہند ہی کا ایک حصہ اُس کو قرار دیدیا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔

الغرض یہ کتاب دکن کی جغرافی، آثاری، تاریخی، معاشرتی، ادبی اور سیاسی حالات کی انسائیکلو پیڈیا ہے۔ جس پر فاضل مولف کی جس قدر تعریف کی جائے کم ہے۔ اس کی تکمیل میں مولوی صاحب موصوف کو عربی، فارسی اور اُردو کی تقریباً سو تصانیف کا مطالعہ کرنا پڑا۔ جن میں بعض تصانیف وہ ہیں جو عام طور سے دستیاب بھی نہیں ہوتیں۔

یہ کتاب نولکشور پریس لکھنؤ سے مل سکتی ہے۔

تاریخ مغربی یورپ ترجمہ ہے ڈاکٹر رابن سن کی کتاب کا جسے فاضل مترجم مولوی محمد یحییٰ صاحب تنہا بی۔اے۔ایل۔ایل۔بی نے کسی وقت سبقاً سبقاً پڑھا تھا۔ اس کتاب میں گویا سلطنت روما کی پراگندگی شیرازہ کی تاریخ بیان کی گئی ہے جو یورپ کے موجودہ سلطنتوں کے قیام کا باعث ہوئی تھی۔ اور اس میں کلام نہیں کہ باوجود اس قدر ایجاز کے جس تفصیل سے مصنف نے کام لیا ہے وہ موجودہ فن تاریخ نویسی کا خاص کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔

ترجمہ کو میں نے کہیں کہیں سے دیکھا تو بڑی حد تک صاف و شگفتہ پایا۔ البتہ کہیں کہیں انگریزی کے الفاظ بجنسہ باقی رکھے گئے ہیں اور ان کا مفہوم بھی نہیں بتایا گیا۔

طباعت کتابت بہت پاکیزہ ہے اور مکتبۂ جامعۂ ملیہ دہلی سے ۱۲؍ میں ملسکتی ہے۔

سیرۃ نبوی اور مستشرقین

ترجمہ ہے برٹانکا کے اس آرٹکل کا جو محمڈنزم کے عنوان سے مشہور مستشرق دلباوزن نے لکھاہے۔ اس کے مترجم مولوی عبدالحلیم احراری نے جا بجا حواشی کا اضافہ کرکے اُن اغلاط کا بھی ازالہ کردیا ہے۔ جو دلباوزن سے سرزد ہوئی ہیں۔ ابتدا میں ایک دلچسپ مقدمہ بھی فاضل مترجم کا ہے۔

یہ کتاب بھی مکتبۂ جامعۂ ملیہ دہلی سے (۱۴؍) میں مل سکتی ہے۔

انتخاب سودا

جناب ثاقب کانپوری نے ایک تمہید و مقدمہ کے ساتھ سودا کے کلام کا انتخاب اس نام سے کیا ہے۔ اور جامعۂ ملیہ دہلی نے اسکی اشاعت کی ہے۔

اس انتخاب میں صرف اُس کی غزلیں اور رباعیات نظر آتی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے۔ قصائد کے لئے علیحدہ کوشش کی جائے گی۔ سودا کا جو مرتبہ دنیائے شعر و شاعری میں ہے وہ کسی سے مخفی نہیں، اسلئے یقیناً جناب ثاقب کی اس سعی سے مشکور ہونا چاہیئے۔

انتخاب بُرا نہیں ہے۔ اور مقدمہ بھی کافی شگفتہ و دلچسپ ہے، لیکن تاریخی حیثیت سے زیادہ چھان بین کی ضرورت تھی۔

اصل الاصول فی الاستناد بقول الرسول

پنجاب میں مذہبی مناظروں کے لحاظ سے امرتسر کو وہی مرتبہ حاصل ہے جو شہادت حسینؑ کے سلسلہ میں کوفہ کو حاصل ہوا کہ وہی مرکز علوئین کا بھی تھا اور خوارج کا بھی۔

ایک زمانہ سے امرتسر میں دو جماعتیں چلی آرہی ہیں۔ ایک وہ جو اپنے آپ کو اہل حدیث کہتی ہے اور دوسری وہ جو اہل قرآن کے نام سے موسوم ہے۔ اول الذکر کے سرگروہ مولانا ثناءاللہ صاحب ہیں اور دوسرے کے مولانا احمدالدین صاحب۔

کچھ عرصہ ہوا ان دونوں کے درمیان حدیث کی صحبت قرار دئے جانے پر ایک مباحثہ ہوا جسپر مولانا سید محمود علی صاحب پروفیسر ذہیر کالج کپور تھلہ نے ایک محاکمہ اصل الاصول فی الاستناد بقول الرسول کے نام سے تحریر فرمایا ہے۔ مولانا محمود علی صاحب ملک کے مشہور اہل فکر و قلم ہیں اور اصول مذہب و عقائد پر بھی ان کے بعض رسائل مقبول ہوچکے ہیں۔ اس لئے وہ یقیناً اس مباحثہ میں محاکمہ تحریر فرمانے کے اہل تھے اور جو کچھ اُنھوں نے لکھا ہے وہ متانت و سنجیدگی، استدلال و استنتاج کے اصول سے بہت خوب ہے اور وہ حضرات جنھوں نے امرتسری مناظرہ کرنے والوں کا بیان دیکھا ہے اِن کے لئے ضروری ہے کہ مولانا محمود علی صاحب

کے اس محاکمہ کو بھی دیکھیں۔ ہر چند مجھے جزواً ان تینوں حضرات سے اختلاف ہے۔ لیکن اصل الاصول میں یقیناً بعض باتیں ضرور ایسی نظر آتی ہیں جو اس طرح کے معمولی اختلافات کو دور کر کے مرکز مشترک پر سب کو لا سکتی ہیں۔ اس کی قیمت ۸ہر ہے اور رسالہ پیام اسلام جالندھر سے مل سکتا ہے۔

ہندو اخلاقیات ترجمہ ہے جی۔ اے چند اور کر بی۔ اے کی کتاب کا جسے مولوی غلام ربانی صاحب مدرس مدرسہ نارمل اسکول اورنگ آباد نے اُردو میں کیا ہے۔ اس کتاب میں نہ صرف ویدوں اور اپنشدوں کی اخلاقی تعلیم سے بحث کی گئی ہے۔ بلکہ منو۔ والمیکی۔ مہابھارت۔ شنکراچاریہ بھگوت گیتا۔ بھرتری ہری اور بودھ کے اصول اخلاق پر بھی بسیط گفتگو نظر آتی ہے۔ میری رائے میں اس کتاب کا مطالعہ ہر مسلمان کو کرنا چاہیئے تاکہ وہ اپنی ہمسایہ قوم کے مذہبی اصول اور اخلاقی تعلیمات سے آشنا ہو کر تنگدلی و عصبیت سے بچ سکے۔ یہ کتاب (عہ/۲) میں پروہت اینڈ کو کتب فروش ریذیڈنسی بازار حیدر آباد دکن سے مل سکتی ہے۔

پرانا خواب (اردو) اور افسانہ مجموعہ ہے ملک کے مشہور ادیب سید سجاد حیدر بی۔ اے کے تین افسانوں کا جو ترکی زبان سے ترجمہ کئے گئے ہیں۔

جناب یلدرم کو جو قدرت ترکی زبان پر حاصل ہے وہ کسی سے مخفی نہیں اور اسی طرح یہ بھی سب کو معلوم ہے کہ ترکی زبان کی انشا لطیف کس قدر پاکیزہ و بلند چیز ہے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ جس کتاب میں ایسا پاکیزہ اقتران ہو جائے وہ کیا کچھ نہ ہوگی۔

اس میں پہلا مضمون "پرانا خواب" ایک ڈرامہ کا ترجمہ ہے اور باقی دو آسیب آسیب الفت اور مطلوب حسینان فسانے ہیں یہ مجموعہ عہ میں مسلم یونیورسٹی پریس علی گڈھ سے مل سکتا ہے۔

نقش و نگار یعنی جناب جلیل احمد صاحب قدوائی بی۔ اے (علیگ) کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ جو (عہ/) میں مسلم یونیورسٹی پریس سے مل سکتا ہے۔ اس مجموعہ میں بارہ نظمیں ہیں ۴۵ غزلیں اور دس رباعیاں شروع میں حسب دستور جدید ایک تعارف نامہ ہے جناب احسن مارہروی کی طرف سے اور ایک مقدمہ ہے جناب عبد الشکور صاحب کے قلم سے۔

اس سے قبل بھی کسی وقت ہم جناب جلیل کے کلام پر ریویو کرتے ہوئے اس کی تعریف کر چکے ہیں۔ اور اب پھر اس کا اعادہ کرتے ہیں کہ جلیل قدوائی کی غزلیں صحیح معنے میں تغزل کی کیفیت رکھتی ہیں۔ اور حسرت موہانی کے رنگ کو اس قدر تکمیل کے ساتھ نبا ہنے والا شاید ہی کوئی دوسرا ہو۔ ان کی نظموں میں بھی جذبات نگاری کا وہی عالم ہے اور رباعیوں میں بھی۔

یہ مجموعہ ہرچند بہت مختصر ہے لیکن یکسر انتخاب ہی انتخاب ہے۔

پطرس کے مضامین اس خولصورت کتاب میں دارالاشاعت پنجاب لاہور نے اپنے صوبہ کے مشہور مزاحیہ نگار جناب پطرس کے گیارہ مضامین مجلد کر دئے ہیں۔ جناب پطرس کا اصل نام احمد شاہ بخاری ہے جو کیمبرج کے گریجویٹ ہیں اور لاہور کے مشہور اہل علم و ذوق میں شمار کئے جاتے ہیں۔ پنجاب کے مختلف رسائل میں ان کے مزاحیہ مضامین شائع ہوکر درجۂ قبول حاصل کر چکے ہیں۔ دیباچہ کی چند ابتدائی سطروں میں آپ لکھتے ہیں کہ:۔

"اگر یہ کتاب آپ کو کسی نے مفت بھیجی ہے تو مجھ پر احسان کیا ہے اگر آپ نے کہیں سے چُرائی ہے تو میں آپ کے ذوق کی داد دیتا ہوں، اپنے پیسوں سے خریدی ہے تو مجھے آپ سے ہمدردی ہے۔ اب بہتر یہی ہے کہ آپ اس کتاب کو اچھا سمجھکر اپنی حماقت کو حق بجانب ثابت کریں۔

اگر حماقت کو حق بجانب ثابت کرنا، حماقت کی تکرار نہ ہوتی، تو میں بھی اس کتاب کو یقیناً اچھا کہدیتا۔ مگر بُرا بھی نہیں کہہ سکتا۔ کیونکہ اس طرح اس احسان کی اہمیت کم ہوجانے کا اندیشہ ہے جو دارالاشاعت پنجاب نے میرے پاس مفت بھیجکر جناب پطرس پر کیا ہے۔

گائے اور اسکی قربانی اس مختصر رسالہ میں مولوی اکبر شاہ خانصاحب نجیب آبادی نے گائے کے متعلق جس قدر لغوی و تاریخی تحقیقات ہوسکتی تھی یکجا کر دی ہے اور یہ ثابت کرتے ہوئے کہ گائے کی عظمت کا حقیقتاً شرک و کفر کے باقیات میں سے ہے۔ ہندوؤں کی مقدس کتابوں سے اس حقیقت کو ظاہر کیا ہے کہ اُنھوں نے خود گائے ذبح کی اور کثرت سے ذبح کرکے اس کا گوشت کھایا اور مہمانوں کو کھلایا۔ اخیر میں ہندوؤں کو مخاطب کرکے مشورہ دیا ہے کہ قربانی گاؤ کے باب میں ان کا تشدد مصلحت کے خلاف ہے اور نہ حقیقتاً زراعت کو اس سے نقصان پہونچنے کا اندیشہ ہے جیسا کہ بیان کیا جاتا ہے۔ یہ رسالہ ۸؍ میں منیجر عبرت نجیب آباد سے مل سکتا ہے۔

وید اور اُسکی قدامت یہ رسالہ بھی مولوی اکبر شاہ خانصاحب کی تحقیق کا نتیجہ ہے۔ اس میں فاضل مصنف نے لسانیات، تاریخی روایات اور مذہبی تعلیمات کو سامنے رکھ کر ثابت کیا ہے کہ وید کو قدیم ماننا درست نہیں، کیونکہ وہ حقیقتاً مجوسیوں کی تعلیمات سے ماخوذ ہیں۔ یہ رسالہ بھی ۸؍ میں منیجر عبرت نجیب آباد سے دستیاب ہوسکتا ہے۔

عبادت اور اُسکی غایت یہ نام ہے تفسیر سورۂ فاتحہ کا جسے ہمارے فاضل دوست میرزا ابوالفضل نے مرتب کیا ہے۔ اور منیجر صاحب کتابستان (دہلی روڈ۔ الہ آباد) نے شائع کیا ہے۔

کتاب ٹائپ میں بہایت نفیس کاغذ پر طبع ہوئی ہے اور مجلد شائع کی گئی ہے۔
جن لوگوں نے جناب میرزا ابوالفضل کی مذہبی تصانیف کو دیکھا ہے وہ سمجھ سکتے ہیں کہ اس کتاب کا رنگ کیا ہوگا اسکے فاضل مصنف اس جماعت میں شامل ہیں جو مسلمانوں میں مذہبی اصلاح کی حامی ہے لیکن جدید اصول پر اسی لئے انکے تمام تصانیف میں ایک خاص جدت پائی جاتی ہے۔ جو حضرات قرآن کو قرآن ہی کے ذریعہ سے سمجھنا چاہتے ہیں ان کو اسکا مطالعہ ضرور کرنا چاہیئے۔ قیمت ۸ر اسکے تمام محاسن کو دیکھتے ہوئے زیادہ نہیں ہے۔

رنج و راحت چودھری سردار خاں صاحب پسروری نے چند اسباق درستی اخلاق کے متعلق اس رسالہ میں یکجا کر دیے ہیں، لیکن اسکے مطالعہ سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ مقصود اس کتاب کی اشاعت سے بچوں کو درس دینا ہے یا ذی فہم لوگوں کو۔ اگر بچے مخاطب ہیں تو زبان اور جا بجا کثرت سے اشعار کی بھرتی ناموزوں ہے اور اگر خطاب ذی شعور لوگوں سے ہے۔ تو مطالب و طریق ادا اس پایہ کے نہیں ہیں۔ اسکی قیمت ایک روپیہ رکھی گئی ہے۔ جو معمولی تقطیع کے ۶ جزو کے لئے بہت زیادہ ہے۔

اسلامی روایات جناب محمد حفیظ اللہ صاحب نے تاریخ اسلامی سے مختلف و متعدد اخلاقی واقعات و روایات اس رسالہ میں یکجا کر دئے ہیں۔ جو معنی و مفہوم اور زبان کے ہر لحاظ سے یقیناً اس قابل ہیں کہ ان کو اسلامی درسگاہوں میں رواج دیا جائے۔ ۸ر میں مسلم بک ڈپو پھلواری شریف سے ملسکتا ہے۔

(ISLAMIA BROTHER HOOD) یہ ترجمہ ہے انگریزی میں جناب محمد حفیظ اللہ کی کتاب اسلامی مساوات کا جس پر اس سے قبل نگار میں ریویو ہو چکا ہے۔ اس کے مترجم مولوی عبد الغنی صاحب اور مسلم بک ڈپو (پھلواری) نے اسی بھی شائع کیا ہے۔

تعلیم اسلام ایک مختصر سا مذہبی رسالہ ہے۔ جس کا موضوع اس کے نام سے ظاہر ہے۔ مولوی سید معین الدین صاحب اس کے مصنف ہیں اور نظامی پریس بدایوں نے اسے شائع کیا ہے۔ رسالہ موضوع کے لحاظ سے اچھا اور تحقیق استدلال کے لحاظ سے غنیمت ہے۔

محاسن اسلام مرزا عبد القادر بیگ صاحب وکیل اجمیر کا وہ لکچر ہے جو آریہ سماج اجمیر کی دعوت پر آپ نے ۱۹۲۸ء میں پڑھا تھا۔ اور (۲) آنہ میں دفتر تبلیغ اسلام اجمیر سے ملسکتا ہے۔

نور الحق۔ الناموس المفصل رسالہ پیام اسلام جالندھر میں ایک حصہ تفسیر کے لئے بھی وقف ہے اسی میں سے سورۂ الفلق اور سورۂ المزمل کی تفسیر لے کر یہ طوسہ

رسالوں کے علیحدہ شائع کی گئی ہیں۔ یہ تفسیر مولوی محمد نور الحق صاحب کا نتیجۂ فکر ہے۔ اور اُردو کی تمام موجودہ تفاسیر میں ایک خاص امتیاز کی صورت رکھتی ہے۔ مطالب بلند کو نہایت صاف و پاکیزہ انداز میں بیان کیا ہے۔ یہ رسالے علی الترتیب دو آنے (۲ر) اور چار آنے (۴ر) میں منیجر پیام اسلام سے مل سکتے ہیں۔

بجائے کارخانہ مشین سویاں قادیان (پنجاب) کے اب ہمارا پتہ ہندوستانی ایجاد گھر دہلی ہے

تحفۂ عید مبارک

خلاف تحریر ہو تو قیمت واپس

ہمارے کارخانہ قائم شدہ سنہ ۱۹۱۴ء کی تیار کردہ مقبول عام پیتل کی خوبصورت پالش شدہ منٹوں میں سیروں نفیس و لذیذ رومالی سویاں تیار کرنے والی

نو ایجاد مشین سویاں وزن کم حجم معمولی

بچہ چلا سکتا ہے

ہینڈل

نقشہ مشین سویاں

ایجاد کردہ فضل کریم عبدالکریم

ایجنٹوں کو معقول کمیشن

قیمت فی مشین پیتل پالش شدہ چھلنی دو عدد (سوراخ ۲۰۰) ہے، علاوہ محصول ڈاک وغیرہ

ملنے کا پتہ: ہندوستانی ایجاد گھر دہلی

زندگی لیکن نہیں صرفِ شکستِ انفعال
زندگی ہے بے خبر! اک سرمدی نقشِ جمال

خاک سی، ہر سمت اُڑتی ہے خزاں آنیکو ہے　　　مطمئن ہے تو، بہارِ شادماں جانیکو ہے
آسماں پہ گھر کر رحمت کی گھٹائیں چھا چکیں　　　بجلیاں تیرے نشیمن پہ بہت لہرا چکیں
نرم موجیں، صرفۂ اجزائے طوفاں ہو چکیں　　　مسکرا کر صبح کی کلیاں پریشاں ہو چکیں
دیکھ تو کیا کہہ رہی ہے، فطرتِ آزادہ کار　　　اے اسیرِ حلقۂ دامِ علائق ہوشیار
یہ بھی کوئی زندگی ہے خستہ و زار و تباہ　　　موت کا ناداں! ہو جس زندگی پہ اشتباہ
سرنگوں سازِ عمل ہے گوشہ گیری پہ تری　　　ذرہ ذرہ مسکراتا ہے اسیری پہ تری
سوزِ بربادی، نہ اطمینان آبادی میں ہے　　　زندگی کا جلوۂ تکمیل آزادی میں ہے
بے خبر! یہ اعترافِ نارسائی تا بکجا　　　فتح کر بڑھتے ہوئے طوفان آمید امیں آ
رہ نہ جائے تیری بیداری میں کوئی اشتباہ　　　دیکھ! تیری سمت ہے ناموسِ ہستی کی نگاہ

جمع کر خرمن، خیالِ برقِ خرمن چھوڑ دے
ہمنشیں، اُٹھ! رشتۂ اوہامِ باطل توڑ دے

علی اختر اختر

قبائے رنگیں

کاشانۂ فقیر پر، اک شیخ روزگار — تشریف لائے اور بڑھا عز و افتخار
ہر لہجہ تھا، حقیقتِ تجوید کا کفیل — ہر جملہ شانِ علم و تورع کا ذمہ دار
جب تک برنگِ خاص، گل افشانیاں رہیں — کرتا گیا قبول، اثر اور اقتدار
شامت سے اتنی بات مرے لب پر آگئی — موجِ طرب، بڑھاتی ہے رنگینیٔ بہار
کچھ دیر چل کے باغ میں گلگشت کیجئے — قدرت کے راز پھولوں سے ہوتے ہیں آشکار
ہر پھول اگر ہے، ساغرِ بادہ بنا ہوا — ہر نونہالِ باغ ہے، مدہوش بادہ خوار
جوشِ غضب میں، ہاتھ عصا تک پہنچ گیا — پھر یوں خطاب تھا کہ سُن اے مردِ ذی وقار
آئینِ اتباعِ شریعت سے دور ہے — سرمستیٔ بہار و تماشائے لالہ زار
اوراقِ دفترِ فقہا میں کہیں نہیں — ذکرِ جوازِ سیرِ گلستان و لالہ زار
مفہومِ دین ہے کہ عبادات کے سوا — جو وقت ہے، وہ لہو و لعب ہی میں ہے شمار

کچھ دن کے بعد پھر جو ملے شیخِ حق نگر — دھج ایسی جسکا عقل کو ہوتا نہ اعتبار
ریشِ سپید، رنگِ حنا کی رہینِ شکر — پیراہنِ دراز، صفائی میں جوئبار
رنگینیٔ قبا کی بھی اُس دن یہ شان تھی — گویا کہ قدِ سرو پہ ہے، عکسِ لالہ زار

کی عرض اگرچہ شوخ یہ طرزِ خطاب تھا — جائز کہاں ہے؟ مسلکِ رندانِ بادہ خوار؟
گلکاریٔ شباب سے بچنا تھا آپ کو — وہ کیا ہوا جناب کا دعوائے اعتذار؟

ہنس کر جنابِ شیخ کا ارشاد یہ ہوا — "باکس نگو کہ رازِ درون باشد آشکار"
دو شیشہ در حبالۂ، عقدم نگارست — "در آمد و، اشارت او بود بار بار"
"کاے ہوشمند، گوش کن و سوئے ما نگر! — دامن چنان سزد کہ گلِ تازہ بہار!!"

بسمل قاضی پوری

نالۂ سحری

مژہ پہ اشک وداعی نگاہ نیند بھری — افق پہ دیکھ رہا ہوں ستارۂ سحری
لباسِ ہستیٔ موہوم کے اڑا پرزے — وگرنہ کارِ عبث ہی یہ شغلِ جامہ دری
نگاہِ شوق کو پابندِ حسیات نہ کر — دلیلِ راہِ تجلی ہے کاوشِ نظری
مشاہدات کی دنیا کو چھاننے والے — تخیلات میں کر صرف قوتِ بصری،
نہاں ہیں سینکڑوں سورج حقیر ذروں میں — بلند کرکے ذرا دیکھ مطمحِ نظری!
ستارے ٹوٹ رہے ہیں سیاہ بختی کے — وہ آرہے ہیں ٹھہر جائے گردشِ قمری،
شفق ہے عکس مری خون شدہ تمنا کا — اُفق پہ نقش ہے تصویرِ نالۂ سحری،

لبِ خموش کو آمادۂ فغاں کردے
غذائے روح ہیں طالب صدائیں درد بھری

طالب باغپتی

گریۂ بے اختیار

ستم رسیدۂ ہجراں کو خوب رونے دو — پڑے ہیں دامنِ دل پر جو داغ دھونے دو
اگر سرشکِ محبت نہیں ہیں بے حاصل — تو کشت کا ہے یہی وقت بیج بونے دو
خیالِ یار کو اشکوں کا ہار ہے مرغوب — اب احتیاط سے موتی مجھے پرونے دو
کسی کے لالۂ رخسار کے تصور میں — دل و جگر کو مرے گلفروش ہونے دو
کرو نہ مجھکو گرفتارِ صد عذابِ الیم — میں باز ہوش سے آیا حواس کھونے دو
گذر رہی ہے جو مجھ پر نہیں جب اسکا علاج — تو کیا برا ہے کہ جو ہو رہا ہے ہونے دو

امیں ہیں سخت پریشاں غریب ہمسائے
یہ شب کو نالے تو چھوڑو انھیں تو سونے دو

(امین حزیں)

رباعیات آسی

جب سے کہ پیا ہے جام عشرت میں نے پائے ہیں سرور و عیش و راحت میں نے
جنت کی نہیں رہی تمنا باقی دنیا کو بنا لیا ہے جنت میں نے

~~~

داماں ثبات عیش سیتا ہوں میں ملتی ہے جہاں وہیں سے پیتا ہوں میں
یہ بھی معلوم ہے کہ مرنا ہے ضرور یہ بھی مشہور ہے کہ جیتا ہوں میں

~~~

آزادی دل کو بند غم میں نہ جکڑ ناصح کی نہ مان بات رندوں سے نہ لڑ
دنیا ہے یہ سب ہوا ہی کرتا ہے یہاں پینا ہے تو پی فضول جھگڑوں میں نہ پڑ

~~~

اک آرزوئے طرب چلی جاتی ہے اک خواہش بے سبب چلی جاتی ہے
پینے کا نہیں ہے ہوش مستوں کو مگر ساقی سے وہی طلب چلی جاتی ہے

~~~

گو روبہ سرور و خرمی ہے ساقی فانی ہے خوشی تو کیا خوشی ہے ساقی
جس جام سے تو پلا رہا ہے مجھ کو جانے کتنوں نے اس سے پی ہے ساقی

~~~

چشمے دودھ اور شہد کے بہتے ہیں کھاتے پیتے ہیں جو وہاں رہتے ہیں
واعظ نے بتائی ہے یہ شان جنت رندوں سے بھی پوچھ لو وہ کیا کہتے ہیں

~~~

میخانے میں لطف زیست پانے والے مینا و سبو سے دل لگانے والے
پی لی ہے تو میکدہ کو خالی کر دے باقی ہیں ابھی بہت سے آنے والے

غزلیات

(علی اختر اختر)

جو راز اب تک حجاب میں ہیں، وہ خود بخود آ گئے زباں پر
ادا تو کر سجدۂ عقیدت، نگارِ فطرت کے آستاں پر

قفس میں ہوں، ہمصفیر! آزاد ہونے کا قصد ہے، خبر تو لینا
کہ بجلیاں رقص کر رہی تھیں ابھی ابھی میرے آشیاں پر

وہ رہروِ نامراد ہوں میں، جو راہ میں تھک کر رہ گیا ہو
شکستہ پائی کا غم ہے دل میں، نگاہ ہے گردِ کارواں پر

زمیں کی جانب بھی دیکھ، ناداں، کہ انجمستاں ہے ذرہ ذرہ
رہے گی تیری نگاہ، کب تک جمی ہوئی اوجِ آسماں پر

مجھے نہ دے طعنِ سطح بینی، نہ کھا فریبِ حیات، ہمدم
جہاں کہ ہر شعبۂ عمل میں یقیں کی بنیاد ہے گماں پر

ترا یہ دعوے! رموزِ فطرت سے آشنا ہیں تری نگاہیں
پڑے ہوئے تاریکیوں کے پردے ہیں جب اسقدر وسعتِ جہاں پر!!

زمانہ سر دھن رہا ہے جس پر، نمود ہے سطح کی وہ اختر
نہ جانے کیا ہو، جو روحِ شاعر کے بھید آجائیں سب زباں تک

(علی اختر-اختر)

کوئی کہاں تک سے جفائیں، یہ بارِ غم کسطرح اُٹھالے،
دُکھے ہوئے دل کی التجا سُن، بجھی ہوئی روح کی دُعا لے

نہ چھیڑ، مطرب، ترانۂ غم کہ ہے ابھی تک تو رات باقی
ابھی سے اندیشۂ سحر کیا، سحر کا تارا تو مُسکرا لے

میں اُس کی گہری نظر کے صدقے، جو رازِ ہستی سے باخبر ہو
میں اُس کے حسنِ ادا کے قرباں، جو نیستی میں لذت فنا لے

رہے گا سازِ حجاب میں یوں، نہاں سرودِ جمال کبتک
کسی کا دمسازِ عشق ہو جا، کسی کو خود ہمنشیں بنالے

رہینِ پندارِ ہوش! خاکِ رہِ خمستانِ عشق ہو جا
کہ طالبِ عیش سرمدی ہے تو روح کو خواب سے جگالے

حریمِ ہستی کا ذرّہ ذرّہ گواہ ہے، میرے سوزِ غم کا
یہ اوّلیں امتحانِ دل تھا، اب اور چاہے تو آزما لے

یہ جانگزا رنج نامرادی، کوئی کہاں تک اُٹھائے اختر
میں اب تو یہ چاہتا ہوں دُنیا سے مجھکو میرا خدا اُٹھالے

(کوکب شاہجہانپوری)

جلوۂ شمعِ حرم زینتِ کاشانۂ دل — یادِ ساقیِ ازل قسمتِ پیمانۂ دل

اللہ اللہ اثرِ سوز و گدازِ الفت — غیرتِ شمعِ دل افروز ہے پروانۂ دل

جو کسی سے بھی نہ اٹھا تھا اٹھایا وہ بار — ہے وفادارِ ازل ہمتِ مردانۂ دل

حسرتِ وصل و غمِ ہجر — الٰہی توبہ — میں مسلمان ہوا چھوڑ کے بتخانۂ دل

میں طلب گارِ مئے عشرتِ فانی؟ توبہ! — بادۂ عشق سے معمور ہے غمخانۂ دل

مٹنے والوں سے ہوئی گرمیٔ بازارِ وجود — غازۂ حسن ہے خاکسترِ پروانۂ دل

زندگی جوشِ تصور کی پرستش میں کٹی — حسنِ فطرت کا مرقع ہے صنم خانۂ دل

مدتوں راز رہا رازِ محبت کوکب
اب تو ہر اشک پہ تحریر ہے افسانۂ دل

~~~~~~~~~~~

(ناطق گلاؤٹھوی)

دولتِ دارین میرا مدعائے دل نہیں — یہ مجھے کیا دے رہے ہو۔ میں کوئی سائل نہیں

کارِ ہمت جان دینا عشق میں ایدل نہیں — زندگی مشکل ہے مرجانا تو کچھ مشکل نہیں

ڈھونڈتا ہے اے دلِ ناکام کس کا آسرا — دیکھتا کیا ہے یہاں کوئی کسی قابل نہیں

کشتیٔ عمر کو ہماری چھوڑ دے منجدھار میں — ناخدا گرداب ہے مدِ نظر ساحل نہیں

شام کی گم کردہ راہی میں خدا جانے کہاں — قافلہ آکر وہاں ٹھہرا جہاں منزل نہیں

رنجِ ناکامی نہ ہو جائے وبالِ زندگی — یہ فضائے دل تو کچھ ہمت فزائے دل نہیں

دل وہ فرزانہ کہ اپنی بھی نہیں جسکو خبر — میں وہ دیوانہ کہ اپنے کام سے غافل نہیں

وہ دلِ بے مدعا کی بات آتی ہے کہاں — مدعا حاصل بھی ہو جائے تو کچھ حاصل نہیں

کیا کریں ذکرِ وفا جب ہو نہ دنیا میں وفا
حضرتِ ناطق ہم ایسی بات کے قائل نہیں

~~~~~~~~~~~

(نظیر لودیانوی)

میں بھولا نہیں ہوں وہ اگلے زمانے   وہ دل کش ترانے وہ رنگیں فسانے
گھٹاؤں سے ہر سو سیہ شامیانے   نواؤں سے معمور سب آشیانے
کہیں چاہِ کنعاں کہیں دشتِ ایمن   حصولِ سکوں کے ہزاروں بہانے
کبھی عاشقوں نے بھی ہمت نہ ہاری   لگائے بہت عشق نے تازیانے
پشیمان ہونے کا وقت آ رہا ہے   بلا شک نہ سمجھے بلا سے نہ مانے
زمانے کا ڈر کیا ہے مردانِ حق کو   کہ اُن کی بغل میں ہیں صد ہا زمانے
شجر بن کے افلاک پر چھا گئے ہیں   رہے کچھ دنوں خاکِ رہ میں جو دانے
مجھے صاف اے دل نظر آ رہا ہے   تری خاک میں ہیں جو مخفی خزانے
فضائے چمن کچھ بدل سی گئی ہے   نہ وہ لالہ و گل نہ وہ آشیانے

نظیر اب تو دل بھی وطن سے سوا ہے
کہ بستے ہیں اس میں کئی لودیانے

(افسر صدیقی امروہوی)

اُدھر جامِ عشرت کی سرشاریاں ہیں   اِدھر شامِ فرقت کی بیداریاں ہیں
تری چشمِ مخمور کا ہے تصور   نئے رنگ کی میری میخواریاں ہیں
دمِ نزع سے کیوں پریشان ہے دل   ابھی اور بھی چند دشواریاں ہیں
تیری دلدہی کے طریقوں کو دیکھا   ستمگاریاں ہی ستمگاریاں ہیں
وفا پر ہے ثابت قدم دل ہمارا   قیامت کی تیری جفا کاریاں ہیں
کبھی کچھ تصور کبھی کچھ تصور   شبِ ہجر ہے اور بیداریاں ہیں
حقیقت مہ و مہر کی میں بتاؤں   ترے حسنِ رخ کی ضیا باریاں ہیں

تمتع زمانے سے آساں ہے افسر
مزاحم مگر میری خودداریاں ہیں

(حامد بھوپالی)

روح کا منزلِ ہستی سے جدا ہو جانا قافلہ بھر کا ہے بے بانگِ درا ہو جانا
آؤ اک قصۂ افتادِ تمنا سن لو پھر ہمیشہ کے لئے ہم سے خفا ہو جانا
یہ بھی اک مرحلۂ جوشِ بقا تھا اپنا اہل دنیا جسے سمجھے ہیں فنا ہو جانا
اک نگاہِ کرمِ یار سکھا دیتی ہے عمر بھر کے لئے پابندِ وفا ہو جانا

ہمپہ گذرا ہے محبت کا زمانہ حامد
ہمنے دیکھا ہے جفاؤں کا وفا ہو جانا

(خلیق فیض آبادی)

کہیں ایسا نہ ہو رونا پڑے الطافِ پنہاں کو ارے او بے خبر! رسوا نہ کر چشم پشیماں کو
بہت ایسے ہیں جو اکتا گئے صحرا نوردی سے مگر مجھ سے تو چھوڑا ہی نہیں جاتا بیاباں کو
نظر کے سامنے گویا کوئی ہر وقت رہتا ہے محبت کے مزے آتے ہیں مجھ محرومِ ارماں کو
بہار آئے نہ آئے میں کروں کیوں انتظار اُس کا تمہارا نام لیکر چاک کرتا ہوں گریباں کو
بھرے آتے ہیں کیوں آنکھوں میں آنسو کیا کہوں ہمدم ابھی دیکھا تھا کچھ نقش و نگارِ طاقِ نسیاں کو

خلیق بادِ وفا کی یاد آئی رو دیا ظالم
جہاں چھیڑا کسی نے داستانِ شامِ ہجراں کو

(اثر لکھنوی)

چارۂ درد سے حال اور دگرگوں ہوتا کہ اگر داغ نہ ہوتا تو یہ دل خوں ہوتا
کوندتی پیشِ نظر برق تجلائے جمال اور کچھ ولولۂ شوق جو افزوں ہوتا
چشمِ حیراں بھی ملی ذوقِ تماشا جو ملا اور کیونکر ترا چاہا دلِ مفتوں ہوتا
عمر بھر ایک اسی نے تو مرا ساتھ دیا کیوں نہ برگشتگیِ بخت کا ممنوں ہوتا

چشمِ مخمور کا جادو بھی چلا ساتھ اثر
کس طرح کوئی حریفِ لبِ میگوں ہوتا

بسم اللہ

نگار

جلد ۱۹ فہرست ماہ مارچ ۱۹۳۱ء شمار (۳)

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد ۱۹ مارچ سنہ ۱۹۳۱ء شمار (۳)

ملاحظات

جز سخن کفرے و ایمانے کجاست
خود سخن در کفر و ایماں می رود
(غالب)

جو شخص مذاہب کی حقیقت، اختلاف مسلک و کیش کی اصلیت اور امتیاز رسم و راہ کی معنویت سے با خبر ہے اور جو اہلِ نظر اس رمز سے آگاہ ہیں کہ انسان کا اگر کوئی ہدف پرستش ہو سکتا ہے تو وہ صرف "انسانیت کبریٰ" ہے جسکو تائدین مذاہب نے مختلف ناموں مختلف صورتوں اور مختلف لہجوں میں دنیا کے سامنے پیش کیا۔ وہ موجودہ نزاع کفر و ایمان پر اگر کوئی صحیح رائے رکھ سکتے ہیں تو یہ صرف وہی ہو سکتی ہے جسے غالب عرصہ ہوا ظاہر کر چکا ہے کہ

جز سخن کفرے و ایمانے کجاست
خود سخن در کفر و ایماں می رود

اب آیئے واقعات کی دُنیا میں، مشاہدات کی فضا میں، اس حقیقت پر غور کیجئے کہ اگر مذہب واقعی کوئی مستبد حکمرانی نہیں ہے، کوئی نفسی و ذاتی خود غرضی نہیں ہے اور اگر مذہب کی غایت دنیا میں اصلاح و تہذیب، اشاعت امن و سکون کے علاوہ کچھ نہیں، تو پھر تاریخ مذاہب کیوں خون سے رنگین نظر آتی ہے اور دنیا کے تمام لٹریچر سے زیادہ مذہب کا لیٹریچر

کیوں ظلم کی داستانوں سے لبریز ہے۔ کیا سبب ہے کہ دنیا میں جسقدر مذہبی تقشف بڑھا، انسانیت گھٹی، جسقدر مذہب
کا اقتدار قوی ہوتا گیا انسان میں اسی اعتبار سے درندگی بڑھتی گئی۔ کیا یہ دلیل مذاہب کی لغویت میں پیش کیجا سکتی ہے۔
کیا اس تلخ حقیقت سے یہ نتیجہ نکل سکتا ہے کہ دنیا میں مذاہب کا وجود نقصان رساں ہے؟ ممکن ہے ایک سطح بین یہی
سمجھے، لیکن زیادہ عمیق نگاہ جان سکتی ہے کہ جب مذہب خود اس دعوے کو ساتھ لیکر آتا ہے کہ وہ دنیا سے ظلم وستم اور
وحشت و درندگی کو محو کر دینے والا ہے تو پھر کیونکر اس کا وجود ہمارے لئے مضرت رساں ہوسکتا ہے۔ اس لئے ظاہر ہے
کہ ہماری تلخ کامیاں ہماری مصیبتیں اور پریشانیاں حقیقتاً مذہب سے متعلق نہیں ہیں، بلکہ عدم مذہب سے وابستہ ہیں
یعنی اُن ہستیوں سے جو مذہب کی اوٹ میں، ایمان و اصلاح کے بہانہ سے تبلیغ امن و سکون کے پردہ میں مذہب کے وجود
کو محو کرکے لامذہبیت، اصلاح و شائستگی کو تباہ کرکے جہل و تخریب اور امن و سکون کو برباد کرکے قتل و خونریزی کی
بنیاد ڈال رہی ہیں، اُنھوں نے ہمیشہ مذہب کی صحیح تعلیم کو چھپایا، انھوں نے مطالعۂ مذہب کی طرف سے لوگوں کو
غافل رکھا اور اُنھوں نے کبھی گوارا نہ کیا کہ لوگ خود اصول مذہب کو سمجھ کر ان پر کاربند ہوں۔ انھوں نے بجائے خدا
کے اپنی پرستش کرائی اور عبادت گاہوں میں جہاں صرف خدائے قدوس کا ذکر ہونا چاہیئے تھا۔ اُنھوں نے اپنے بُت
قائم کئے اور لوگوں کے سروں کو اپنے سامنے جھکا کر قدرت اور قانون قدرت کیطرف سے دنیا کو غافل بنا دیا۔

انھوں نے یہ تعلیم دی کہ مذہب نام ہے صرف اُس چیز کا جسے وہ بتائیں، اور نجات کا راستہ وہ ہے جو
وہ دکھائیں، پھر اُنھوں نے ہمیشہ مذہب کے نام سے اس چیز کو دکھایا جو یکسر طاغوت و شیطان سے متعلق تھی۔ اور
طریق نجات کے بہانہ سے ہمیشہ وہ راہ پیش کی جو نکبت و ذلت تباہی و بربادی کے گڑھے میں ڈھکیل دینے والی تھی۔

پھر جس طرح تمام مذاہب کی تاریخ میں ایسے بندگانِ نفس و غرض پائے جاتے ہیں، اسی طرح اسلام بھی
ان سے خالی نہیں رہا، اور اس جنس کی پیداوار آج نہیں بلکہ اُسی وقت سے شروع ہوگئی، جب رسولؐ کے بعد ہی مذہب
و امامت کو دنیاوی ملکیت سمجھ کر ہمارے اکابر باہمد گر دست و گریباں نظر آنے لگے۔ اغراض ذاتی کے لئے احادیث وضع
ہونے لگیں اور رفتہ رفتہ حکومت نے ایک جماعت ایسے لوگوں کی پیدا کی جو پیش تو کئے گئے قائدین مذہب کی حیثیت سے
لیکن فی الحقیقت وہ پشت پناہ تھے امارت و حکومت کی اُس مادی و دنیاوی ترقی کے جنھے بجائے حریت و مساوات کے
استبداد و قہرمانیت کی بنیاد دنیا میں ڈالی۔ پھر مذہب سے متعلق کوئی لٹریچر ایسا نہیں تھا جس میں اس جذبہ سے کام
نہ لیا گیا ہو اور کوئی حکمراں ہستی ایسی نہ تھی جس نے اس سے فائدہ نہ اُٹھایا ہو۔ فقہ و اصول فقہ میں، حدیث و
اصول حدیث میں، تفسیر و اصول تفسیر میں اور اسی طرح تاریخ، ادب، کلام الغرض تمام لٹریچر میں حق و باطل، صدق
و کذب کو اس طرح مخلوط کر دیا گیا کہ لوگوں کو امتیاز نقد و نسیہ دشوار ہوگیا اور حالت بد سے بدتر ہوتی گئی جسکا آخری نمونہ
حکومت عثمانی کا وہ دور ظلمت تھا جو "خلافت پناہی" کے نام سے یاد کیا جاتا ہو اور جس کی لعنتوں کی مکمل ترین مثال

"سلطان عبدالحمید خاں" کا وہ زمانہ تھا جب اس "سلطان البرین والبحرین اور خلیفۃ اللہ فی الارض" کا ملک سوائے ترکوں کے ساری دنیا کے لئے وقف تھا، ممالک غیر کے سفیر قسطنطنیہ میں خود مختارانہ عدالتیں قائم کئے ہوئے شاہانہ زندگی بسر کر رہے تھے اور اہل یورپ بیرا میں اس لُطف و مسرت کی داد دے رہے تھے جو ترکوں ہی کے روپیہ سے انھیں نصیب ہوئی تھی، لیکن غریب ترک اس سے بالکل محروم تھے۔ پھر یہ تمام بربادیاں اور غارتگریاں جن سے مسلمانوں کے خاندان کے خاندان تباہ ہو رہے تھے، وہ عسرت و افلاس جس نے اہل ملک سے آزادی کی آخری سانس بھی چھین لی تھی، وہ تمام اخلاقی، اقتصادی و علمی انحطاط جو ایک وبا کی طرح ہر ہر فرد پر مسلط تھا، سب انہی رہنماؤں، عالموں، قاضیوں اور شیخ الاسلاموں کا لایا ہوا تھا جو خلیفۂ وقت کی بداعمالیوں کے جواز کا فتوے دے دیکر ملک کے جذبات کو اُبھرنے نہ دیتے تھے اور طمع صرف یہ تھی کہ اس خدمت گرانمایہ کے عوض میں ان کو چند "درہم و دینار" اسی طرح ملجایا کرتے تھے، جس طرح شیر شکار کے بعد چند ہڈیاں اور گوشت و پوست کے کچھ ٹکڑے مردار خوار جانوروں کے لئے چھوڑ جاتا ہے۔ پھر ظاہر ہے کہ جب ملک کی حالت اس درجہ انحطاط پر پہونچ جائیگی تو اس کا "ردعمل" کیا ہوگا؟

سلطان عبدالحمید خاں کی معزولی اور ترکی کا پہلا انقلاب حقیقتاً اُس ردعمل کی صرف ابتدا تھی، جسکی انتہا لطل اعظم مصطفےٰ کمال کے ہاتھ پر مقسوم ہو چکی تھی اور جو اچھی طرح جانتا تھا کہ جبتک ان مذہبی رہنماؤں کو محو نہ کیا جائے گا کوئی مفید نتیجہ نہیں نکل سکتا، چنانچہ اس نے سب سے پہلے "خلافت" کا خاتمہ کیا جو سرچشمہ تھا تمام مفاسد کا اور پھر تمام مولویوں کو جنھیں "ذریات خلافت" کہنا چاہیئے ضعیف و کمزور کرکے اس انقلاب کو رونما کیا جس کی نظیر آج تک تاریخ کے صفحات پیش نہیں کرسکے۔

کہا جاتا ہے کہ ترکی بے دین ہو گیا ہے، ہندوستان کے مولوی چیخ رہے ہیں کہ ترکی کی ترقی لامذہبیت و بیدینی کی ترقی ہے، کبھی کبھی خود حدود ترکی کے اندر مولویانہ بغاوتیں رونما ہو جاتی ہیں، لیکن کیا کوئی دانشمند کبھی سمجھ سکتا ہے کہ اگر ترقی اسی بیدینی و بے راہ روی سے حاصل ہو سکتی ہے تو پھر دنیا میں کون ہے جو مذہب و مذہبیت کو اختیار کرنے پر آمادہ ہو جائے گا۔ آخر کب تک عالم کو اس فریب میں مبتلا رکھا جائے گا کہ مذہب قاطع ترقی و ہادم لذات ہے اور کیونکر اب عقول انسانی کو پیچھے ہٹا کر بجائے "اعتماد نفس" کے "اعتماد مولوی" کا یقین دلایا جائیگا۔

آج ترکی "خلافت اور مولویت" کے جال سے نکل کر تعلیم و اقتصاد، صنعت و حرفت، سیاست و تجارت غرضکہ زندگی کے ہر شعبہ میں ترقی کر رہا ہے، دنیا میں ایک خاص اقتدار حاصل کرکے "مرد بیمار" کی لعنت سے آزاد ہو گیا ہے، اسلئے اب یہ ناممکن ہے کہ وہاں پھر وہ دور قائم ہو جس کی تمنا میں ہمارا "مولوی" آتش زیر پا نظر آرہا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ بعض مسائل میں ترکی حدود سے متجاوز ہو گیا ہے اور مذہب کی کوئی قیمت ان کے نزدیک باقی نہیں رہی، لیکن سوال یہ ہے کہ اس انقلاب کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے؟ وہ لوگ جنھوں نے خلافت ترکی کے عہد آخریں کے تاریخ کا مطالعہ کیا ہے وہ سمجھ سکتے ہیں کہ اس الزام کا مستحق کون ہے؟

مس گرلیس آلی سن نے زمانۂ دراز تک وہاں زندگی بسر کر کے "موجودہ ترکی" پر جو کتاب لکھی ہے، اسکے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں اب کونسی روح کام کر رہی ہے اور یہ ردعمل کس چیز کا نتیجہ ہے؟

ماہ آیندہ کے نگار میں ہم اس کتاب کے بعض بعض اقتباسات پیش کر کے زیادہ واضح طریقہ سے "نزاع کفر و ایمان" کی اس دلچسپ داستان کو سنائیں گے۔

سیاسیاتِ ہند کی تاریخ میں وہ تحریک جس نے راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے انعقاد کی طرح ڈالی، ہمیشہ یاد رہنے والی چیز ہے۔

اس کانفرنس میں کانگریس جماعت کے سربرآوردہ اصحاب نے شرکت نہیں کی۔ مکمل آزادی چاہنے والوں کو اس میں حصہ لینے کی فرصت عطا نہیں ہوئی۔ اور یقیناً متحدہ ہند کی آواز کی نمایندگی کا شرف اس کو حاصل نہیں ہوا لیکن باوجود ان تمام نقائص کے اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ مغربی حکومت کی ذہنیت اور مشرق کے اضطراب محکومیت کے درمیان جو خلیج عرصہ سے حایل چلی آ رہی تھی وہ ضرور دور ہو گئی۔

حکومت برطانیہ کو جس نے کبھی ہندوستان کے جذبۂ آزادی کو ایک ہنگامی بحران سے زیادہ وقعت نہیں دی تھی، آخر کار سمجھنا پڑا کہ دنیا کی حقیقتوں کو عرصہ تک نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اور ادھر مشرق کو اس خواب کی تعبیر ملگئی جسے وہ مقاطعہ اور مقاومت خاموش کی صورت میں دس سال قبل سے دیکھتا چلا آ رہا تھا۔

اس میں شک نہیں کہ برطانیہ کا تسلط ہندوستان پر ایک متعدد ہاتھ رکھنے والے تسمہ پاکی سی گرفت ہے کہ اگر کسی نہ کسی طرح ہاتھوں کی تمام گرفت چھوٹ جائیں تو بھی پاؤں، گلے کا پھندا بنے ہوئے موجود ہیں اور یہ بھی صحیح ہے کہ ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ ہندوستان پوری طرح "اپنی گلو خلاصی" پر اظہار مسرت کر سکے لیکن حکومت کو یہ بالکل یقینی طور پر معلوم ہو گیا ہے کہ بہت جلد اسکو اپنی آخری گرفت بھی ڈھیلی کرنی پڑیگی اور ہماری رائے میں یہ اتنی بڑی کامیابی کانفرنس کی ہے کہ اگر کچھ اور نتیجہ نہ برآمد ہو، تو بھی اس پر اعتماد کر کے ملک عرصہ تک، قربانیاں پیش کرنے کیلیئے تیار رہ سکتا ہے۔

اس کانفرنس کا تتمہ جو خود ہندوستان میں منعقد ہو گا ابھی تک معرض التوا میں ہے اور کہا جاتا ہے کہ اسکی کامیابی یا عدم کامیابی بہت کچھ گاندھی وارون کی باہمی گفتگو کے نتیجہ پر منحصر ہے، مجھے اس نظریہ سے

اختلاف ہے، کیونکہ اول تو گاندھی اور ارون کا باہم مصالحت کر لینا بالکل یقینی ہے۔ اور اگر یہ نہ ہو تو بھی جس طرح بغیر شرکت گاندھی جی کے ولایت میں کانفرنس ہو گئی اور گاندھی جی بعد کو شرائط صلح پیش کرنے پر آمادہ ہو گئے اسی طرح اب نہ سہی تو اس تتمۂ کانفرنس کے بعد وہ پھر دوسری شرائط صلح پیش کرنے پر آمادہ ہو جائیں گے۔ اور نتیجہ یہ ہوگا کہ جو کچھ بحالت موجودہ ہندوستان کو مل رہا ہے، خواہ وہ نہایت ہی حقیر قسم کا آزاد نظام حکومت کیوں نہ ہو۔ اس کے لینے کے لئے گاندھی جی تیار ہو جائیں گے۔

مکمل آزادی کا مطالبہ اولین وآخرین فقط کی صورت میں نہ اب صرف گاندھی کے پروگرام میں شامل ہے اور نہ کسی اور شخص کے۔ اب جس پالیسی پر عمل کیا جا رہا ہے، وہ اس سے زیادہ نہیں جو خود برطانیہ نے ہندوستان پر مسلط ہونے کے لئے اختیار کی تھی اور اس لئے میرے نزدیک سپرو، جیکار، شاستری اور گاندھی جی کے مابین باہمی ردوقبول، اصرار وانکار، ہاں نہیں کا منظر اس سے زیادہ نہیں ہے جسے "جنگ زرگری" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

یہ تقریباً طے ہو چکا ہے کہ ہندوستان کو فیڈرل حکومت دیجائے گی اور تمام صوبے اپنے اندرونی انتظام میں مجلس قانونی کے ماتحت بڑی حد تک آزاد ہوں گے۔ لیکن اس سلسلہ میں سب سے اہم سوال نمائندگی کا ہنوز مختلف فیہ چلا آ رہا ہے اور اقلیت واکثریت کے مابین مخلوط وغیر مخلوط انتخاب کی نزاع ہنوز باقی ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر مخلوط انتخاب کو سب نے متفقہ طور پر تسلیم کر لیا تو پھر اقلیت کے تحفظ کے لئے کوئی نہ کوئی صورت نکالنا پڑے گی۔ اور اگر انتخاب غیر مخلوط ہوا تو پھر اس صورت میں سب سے بڑی گارنٹی مختلف صوبوں کی اقلیت واکثریت سے متعلق ہوگی جو میرے نزدیک بڑی حد تک ذہنی، خیالی اور ناقابل عمل ہے۔

اس مسئلہ کا اب تک طے نہ ہونا میرے نزدیک صرف ایک سبب پر مبنی ہے اور وہ یہ ہے کہ اقلیت نے اعتماد نفس کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے۔ اور وہ یہ سمجھ رہی ہے کہ اکثریت کا مقابلہ دشوار ہے۔ حالانکہ دنیا میں اکثریت واقلیت جس حد تک اثر انداز ہونیوالی ہے۔ اس کا تعلق میرے نزدیک کبھی کمیت سے نہیں ہوا۔ بلکہ ہمیشہ کیفیت ہی کے لحاظ سے اس پر حکم لگایا گیا ہے۔ اس لئے میرے نزدیک اقلیت والوں اور خصوصیت کے ساتھ مسلمانوں کا خائف ہونا، ایک ایسی خطرناک ذہنیت کا اظہار ہے کہ اگر اس میں برابر ترقی ہوتی گئی تو مجھے اندیشہ ہے کہ اگر انکی خواہش کے مطابق جداگانہ انتخاب بھی منظور ہو گیا تو وہ اس سے کوئی فائدہ نہ اٹھا سکیں گے۔ سوائے اس مفروضہ صورت کے جو ڈاکٹر اقبال نے اپنے خطبۂ صدارت مسلم لیگ میں تجویز کی تھی، لیکن اس کی حالت یہ ہے کہ اگر حشر کے بعد دوبارہ دنیا آباد ہو اور دنیا کی آبادی بھی علامہ اقبال کے مشورہ خاص کے مطابق آراستہ کیجائے۔ تو شاید اس پر عمل ہو سکے ورنہ یوں تو کوئی پہلو اس کے امکان کا نہیں ہے۔

بہرحال میرے نزدیک مسلمانوں کے لئے بہتر طریق کار یہی ہے کہ وہ مخلوط انتخاب کو مان لیں، اس اندیشہ

کے ساتھ نہیں کہ ہندوؤں کی آبادی ۲۲ کرور ہے، بلکہ اس اعتماد پر کہ وہ خود بھی نو کرور کی تعداد میں ہندوستان کے اندر آباد ہیں اور اگر بفرض محال تمام ہندو اُن کے پامال کرنے پر ہی تُل جائیں تو بھی آسانی کے ساتھ وہ ثابت کر سکتے ہیں کہ ۹ ——— کی قوت ۲۲ کرور کے مقابلہ میں ایسی ضعیف نہیں ہوا کرتی کہ یوں آسانی سے اُسے مٹا دیا جائے۔

اس وقت مسلمانوں کو جس امر پر توجہ کرنے کی ضرورت ہے وہ صرف اُنکی تعلیمی و اقتصادی کمزوری ہے جس نے انھیں اس قدر لرزہ براندام بنا رکھا ہے، اگر وہ اپنی تمام تر توجہ اس طرف مبذول کر دیں تو چند دن میں خود ان کو محسوس ہونے لگے گا کہ اقلیت و اکثریت کا معیار اعداد و مقدار پر نہیں ہے بلکہ کیف و اقتدار پر ہے، ورنہ یوں تو اگر نا اہلی کی حالت میں اگر تمام ہندو ہندوستان سے ترک سکونت کرکے سارا ملک مسلمانوں کے سپرد کرکے چلے جائیں تو بھی وہ چند دن میں اپنی حکومت عرصہ تک قائم نہ رکھ سکیں گے اور چند دن میں پھر ان کی وہی حالت ہو جائے گی جو ہمیشہ ایک جاہل و کم فہم قوم کی ہوا کرتی ہے۔

گزشتہ ماہ کے رسالہ میں، یو۔ پی کے ایک اور جدید رسالہ کا ذکر نہ کر سکا جو "ایوان" کے نام سے جناب مجنوں گورکھپوری نے اپنے "ایوان اشاعت گورکھپور" سے جاری کیا ہے۔ اسکا پہلا پرچہ فروری میں شائع ہو گیا ہے اور تمام اُن خصوصیات کا حامل ہے جو ایک خالص ادبی رسالہ میں پائی جانا چاہیئے۔ جناب مجنوں نہ صرف افسانہ نگار بلکہ ایک اچھے نقاد ادب اور خیالی فلسفی بھی ہیں اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ انکا رسالہ اچھے ذوق و معیار کا نہ ہو۔

جناب مجنوں نے صرف سال گزشتہ ایوان اشاعت کی بنیاد گورکھپور میں رکھی اور اس دوران میں دو قابل قدر کتابیں (شو نہار۔ مثنوی زہر عشق) اُنھوں نے شائع کیں۔ شو نہار کا ذکر اس سے قبل آ چکا ہے۔ زہر عشق کے متعلق زیادہ لکھنا بیکار ہے، کیونکہ مثنوی بجائے خود کافی دلکش ہے، چہ جائیکہ اس میں متعدد رنگین و سادہ تصاویر کے ساتھ چار چار مقدموں کا بھی اضافہ ہو۔ یہ کتاب مجلد شائع ہوئی ہے اور عہر میں ایوان اشاعت گورکھپور سے مل سکتی ہے۔ ایوان اشاعت اور کتابیں بھی شائع کر رہا ہے۔ اور مجھے اس کا بھی علم ہے کہ وہ سب اچھی ترتیب کے ساتھ رونما ہونیوالی ہیں۔

اسی سلسلہ میں مجھے ایک اور رسالہ (اعجاز) کا بھی ذکر کر دینا چاہیئے جو بارہ بنکی (اودھ) سے جاری ہو کر اپنی عمر کا پہلا سال ختم کر چکا ہے۔ جناب عقیل جعفری جو اس کے روح رواں ہیں بہت خوش ذوق اور روشن خیال آدمی ہیں اور وہ پوری سعی کر رہے ہیں کہ ان کا رسالہ دلکش و مفید مضامین کے ساتھ شائع ہو۔ بعض بعض مضامین اس میں فکاہی بھی ہوتے ہیں۔ جو تنقید صحیح کے اصول پر لکھے جاتے ہیں۔ رسالہ باوجود مختصر اور ارزاں ہونے کے

کافی دلچسپ ہے۔ کیونکہ "ریاضی" اور "ریاضیات" بھی اس کا ایک ضروری جزو ہے۔ مقامی ڈسٹرکٹ بورڈ نے مدارس کے لئے اسکی خریداری منظور کرکے کافی قدردانی سے کام لیا ہے، لیکن جب تک پبلک متوجہ نہ ہو کسی رسالہ کی دشواریاں اس نوع کے ہنگامی وعارضی امداد سے دور نہیں ہوسکتیں۔ امید ہے کہ ناظرین نگار ایک بار اس کا نمونہ طلب کرنے کی زحمت گوارا کرینگے۔

گزشتہ ماہ ہم نے نولکشور پریس کی ریڈروں کے متعلق اظہار خیال کیا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نولکشور پریس کے منیجر نے اس باب میں ہم سے گفتگو کی اور ہمکو اطمینان دلایا کہ ان ریڈروں پر نظرثانی کا اہتمام ہو رہا ہے اور کوشش کیجارہی ہے کہ قبل اشاعت اس قسم کے تمام نقائص دور ہو جائیں۔ ہم کو مسرت ہے کہ ان کا خیال اس اہم مسئلہ کیطرف مبذول ہوا اور امید ہے کہ اب بار دگر ہمکو لکھنے کی ضرورت پیش نہ آئے گی۔

جو حضرات از راہ لطف وکرم اپنے مقالات نگار میں بغرض اشاعت روانہ فرماتے ہیں۔ ان کو میں دو باتوں کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں۔ ایک تو یہ کہ وہ خود پہلے غور کرکے فیصلہ کرلیا کریں کہ آیا مضمون نگار کے معیار کے لحاظ سے زیادہ بلند ولپست تو نہیں ہے اگر فیصلہ یہ ہو کہ نگار ضرور اس کا مستحق ہے تو پھر اس کے ساتھ جواب کے لئے ایک ٹکٹ زدہ لفافہ کا آنا بھی ضروری ہے۔ تاکہ فوراً اشاعت وعدم اشاعت کے متعلق اطلاع دیدی جائے اسی کے ساتھ یہ بھی استدعا ہے کہ اگر کوئی مضمون یا نظم بغرض اشاعت رکھ لی گئی ہے تو اس امر پر مجھے مجبور نہ کیا جائے کہ میں فوراً اسے شائع کردوں۔

مجھے ان ناظرین نگار کی خدمت میں بھی کچھ عرض کرنا ہے جو اب تک اپنا نمبر خریداری رجسٹرڈ نمبر ۱۱۰۴ سمجھے ہوئے ہیں انھیں یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ یہ نمبر خریداری کا نہیں ہے بلکہ ڈاک خانہ کا نمبر ہے جو نگار کو ملا ہے نمبر خریداری وہ ہے جو پتہ کے کاغذ پر داہنی جانب بلیو بلیک سیاہی سے درج ہوتا ہے۔ اگر آپ حضرات ایک بار اس نمبر کو نوٹ کرکے خط وکتابت میں اس کا حوالہ دے دیا کریں تو کسقدر آسانی ہو۔

یہ کاپی پریس کو جارہی تھی کہ حکومت وکانگرس کی باہمی صلح کا اعلان اخباروں میں آگیا اور آخر کار وہ ہوکر رہا جسکا ہوجانا ناگزیر تھا اور اس طرح ہندوستان نے اس زینہ پر قدم رکھ دیا جو آزادی تک کسی نہ کسی دن پہونچانیوالا ہے اب بھی وقت ہے کہ مسلمان وقت کی نزاکت کو محسوس کریں اور ہوش وگوش سے کام لیکر اس راستے سے بجائے ترکستان کو جاتا ہے

زائرہ کی محبت

میری طالب علمی کا زمانہ ماسکو میں گذرا ہے۔ میں عام لڑکوں کی طرح بورڈنگ میں نہیں رہتا تھا بلکہ شہر میں ایک کرایہ کا مکان میری اقامت گاہ تھا۔ اسکی وجہ یہ کہ کرایہ کے مکان کو بورڈنگ پر کیوں فوقیت دی گئی تھی، صرف یہ تھی کہ میرے والد اکثر اپنی تجارت کے سلسلہ میں وہاں آیا کرتے تھے اور چونکہ انھیں خود بھی دوران قیام میں مکان کی ضرورت ہوتی تھی۔ اس لئے غالباً کفایت اور نگرانی دونوں اسباب کی بنا پر انھوں نے مجھ کو شہر میں رکھنا مصلحت سمجھا۔

جس مکان میں میرا قیام تھا وہ ایک وسیع حویلی تھی۔ جس کے مختلف حصے تھے، ایک حصہ مستقل کرایہ پر ایک عورت کے پاس تھا جس کا چال چلن اکثر اہل محلہ کے نزدیک قابل اعتبار نہ تھا۔ وہ پست اقوام سے تعلق رکھتی تھی اور اسکا نام زائرہ تھا جسمانی صحت و تندرستی کے لحاظ سے وہ خود اپنی مثال تھی۔

اس کا بلند و بالا قامت، مردانہ کمر، ورزشی بازو، تیز آواز، گھنے سیاہ ابرو، بیقرار نیلگوں آنکھیں ممکن ہے اس تمام اجتماع کو کسی نے "حسن" سمجھا ہو۔ لیکن عام طور پر لوگ کم ذات سمجھ کر اس سے بچا کرتے۔ اور جہانتک میری ذات کا تعلق تھا میں اس کی جوانی سے متاثر ہونے کی بجائے ایک قسم کا خوف محسوس کیا کرتا تھا۔

میں بھی مکان کی بالائی منزل میں رہا کرتا تھا اور اس کا کمرہ بھی بالکل میرے مقابلہ میں بالائی منزل پر تھا۔ میری احتیاط کا یہ عالم تھا کہ جب مجھے علم ہوتا کہ وہ اپنے کمرے میں سامنے موجود ہے۔ میں ہمیشہ اپنے کمرہ کا دروازہ بند کر لیا کرتا۔ لیکن ایسا اتفاق کم ہوتا تھا۔ اس لئے کہ دن میں جو میرے اسکول کے اوقات تھے وہی زیادہ تر اس کے گھر رہنے کے اوقات تھے۔ شب کو میں اپنے ہم جماعتوں کے ساتھ بورڈنگ میں پڑھنے کے لئے چلا جاتا تھا اور صرف سونے کے لئے مکان پر آتا تھا۔ بعض اوقات زینہ پر اترتے چڑھتے ہمارا سامنا ہو جاتا تھا اور بعض مرتبہ صحن میں آتے جاتے۔

وہ اکثر مجھے دیکھ کر اس طرح مسکرا دیا کرتی جسطرح مختلف پیشوں کے لوگ مصروفیت کار میں ایک دوسرے سے صاحب سلامت کرتے ہوئے مسکرا دیا کرتے ہیں۔ مگر اس میں بھی مجھے ایک قسم کا گنوار پن اور اوباشی محسوس ہوا کرتی۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوا کہ میں نے اسے شراب کے نشے میں چور، انگارہ سی آنکھیں بنائے ہوئے بہکتے دیکھا۔ ایسے موقعہ پر وہ بالعموم مجھے اسطرح مخاطب کیا کرتی ——— "میرال طالب العلم! کہو مزاج تو اچھا ہے؟"

اسکے بعد وہ ایسا بے معنی سا قہقہہ لگایا کرتی کہ دل میں اس کی طرف سے بہت زیادہ نفرت و حقارت

کے جذبات پیدا ہونے لگتے۔

کئی مرتبہ ان جبریہ ملاقاتوں اور بیہودہ مزاج پُرسیوں سے بچنے کیلئے میں نے یہ بھی سوچا کہ اپنا کمرہ تبدیل کر کے کہیں اور رہنے لگوں لیکن چونکہ موجودہ جگہ زیادہ آرام دہ صاف ستھری اور با موقعہ تھی۔ اس لئے ارادے نے کبھی عمل کی صورت اختیار نہ کی۔ اس کے علاوہ ایک سب سے بڑا آرام مجھے یہ تھا کہ شہری آبادی کا یہ حصہ زیادہ کاروباری نہ تھا اور میرے مطالعہ میں شور و شغب حارج نہ ہوتا تھا۔

ایک روز صبح کو میں اپنے بستر پر انگڑائیاں لے رہا تھا اور جغرافیہ نہ یاد ہونیکی وجہ سے اسکول نہ جانے کے لئے کوئی بہانہ سوچ رہا تھا کہ یکایک دروازہ کھلا اور زائرہ کی منحوس آواز چوکھٹ پر سنائی دی:۔

"خدا کرے تندرست رہو۔ میاں طالب علم! ـــــ میں اندر آجاؤں؟"

"تمہیں مجھ سے کیا کام ہے؟" میں نے سوال کیا اور دیکھا کہ وہ اس استفسار پر پریشان ہو کر کھسی گئی ہے۔ یہ حالت اُسکی عام حالتوں سے بالکل متضاد تھی۔ بالآخر اس نے نہایت مہذبانہ طور پر جواب دیا:۔

"جناب والا! میں آپ کو ایک زحمت دینا چاہتی ہوں۔ کیا آپ میرے لئے اُسے برداشت کرنا گوارا فرمائیں گے؟"

میں بستر پر پڑا ہوا دل ہی دل میں کہہ رہا تھا ـــــ "خدا خیر کرے! دیکھئے کیا ارشاد ہوتا ہے!"

"مجھے اپنے گھر ایک خط لکھوانا ہے۔ اس کے لئے تکلیف دینا چاہتی ہوں۔"

اُسکا لہجہ نرم، پشیمان اور ملتجی تھا۔

"خیریت گذری!" میں نے خیال کیا اور ایک جست کر کے میز کے قریب کاغذ قلم دوات لیکر بیٹھ گیا۔

"آؤ لکھواؤ کیا لکھوانا ہے!"

وہ بڑھی اور بڑے ادب سے ایک کُرسی پر بیٹھکر مجھے حریص نگاہوں سے تکنے لگی۔

"ہاں ـــ بتاؤ کسے لکھوانا ہے؟"

"سرائے زنیہ ـــ براہ وارسا ـــ مسٹر بروسلا کو لکھوانا ہے۔"

"اچھا ـــ بہت جلد جلد بولتی رہو!"

"میرے اچھے بروسلا .... میرے پیارے .... میرے دلنواز! ـــ خدا تجھے اپنی رحمت کے سایہ میں رکھے۔ تیری وفاداری کے وعدے کیا ہوئے؟ .... سنہرے بالوں والے! تونے اتنے زمانہ سے اپنی چھوٹی سی مغموم گڑیا زائرہ کو کیوں نہ خط لکھا؟ ...."

میں یہ الفاظ سُن کر ہنسی سے بیتاب ہوگیا ـــ "چھوٹی سی معصوم گڑیا" ـــ قدصرف پانچ فٹ چھ انچ، ہاتھ کارخانہ کے ہتھوڑے، وزن تقریباً دو من کچھ سیر، رنگت سیاہی مائل .... گویا اس "چھوٹی سی معصوم گڑیا" کو کھیلنے والوں نے عمر بھر دو وکش میں رکھا ہے۔ اور کبھی بھی جھاڑنے پونچھنے یا نہلانے دھلانے کی زحمت گوارا نہ کی ـــ واقعی ظلم ہے....!" میں نے اپنے دل میں کہا۔ بہرحال کسی نہ کسی طرح ہنسی ضبط کرکے مینے پوچھا:۔

"یہ بردسلاٹ کون ہیں؟"

"بروسلا، میاں طالب علم بردسلاٹ نہیں"۔ اس نے ذرا ترش رو ہو کر مجھ سے کہا۔ گویا غلط نام لینا اُسے ناگوار ہوا ہے ـــ "اس کا نام بردسلا ہے، وہ میرا نوجوان محبوب ہے"۔

"نوجوان محبوب!" مینے تعجب سے کہا۔

"کیوں؟ ـــ آپکو تعجب کیوں ہے؟ کیا مجھ ایسی دوشیزہ لڑکی کیلئے ایک نوجوان محبوب نازیبا ہے!"

"یہ! اور ایک دوشیزہ لڑکی!!؟ ـــ یہ بھی ایک ہی ہوئی"۔ مینے ہنسی روکتے ہوئے سوچا۔ "کیوں نہ ہو ـــ دنیا میں سب باتیں ممکن ہیں"۔ پھر مینے اُس سے مخاطب ہو کر پوچھا:۔

"کیا وہ عرصہ سے تمہارا محبوب ہے؟"

"چھ سال سے"۔

"اوہو!" میری زبان سے بیساختہ نکل گیا۔ "خیر تم خط ختم کراؤ"۔

مجھے یہ کہنے میں مطلق تامل نہیں ہے کہ میں بھی بخوشی خاطر اس بردسلا کا رقیب بننا پسند کرلیتا اگر اسکی "چھوٹی سی معصوم گڑیا" زائرہ سے ذرا اور چھوٹی ہوتی۔

"میں آپ کی بیحد شکر گذار ہوں، آپ نے بڑی تکلیف کی"۔ زائرہ نے نہایت تیزی کے ساتھ لکھا ہوا خط لیکر کہا ـــ "میرے لائق کوئی خدمت ہو؟"

"تمہاری مہربانی کافی ہے۔ میں کوئی تکلیف دینا نہیں چاہتا"۔

"آپکی قمیصوں یا پاجاموں میں اگر رفو یا درستی کی ضرورت ہو تو میں اس خدمت کیلئے حاضر ہوں"۔

مجھے اپنا پاجامہ دیکھکر بڑی ندامت ہوئی۔ اور مینے ایسا محسوس کیا کہ گویا اُسنے قصداً طنزیہ طور پر یہ فقرہ کہا ہو بہرحال مینے اس سے صاف کہدیا۔ کہ مجھے اُسکا زیادہ خیال نہیں ہے اور میں آپکو کوئی تکلیف دینا نہیں چاہتا۔ وہ یہ سُنکر چلی گئی۔

اس واقعہ کو دس بارہ روز گذر چکے تھے۔ میں ایک روز شام کو اپنی کھڑکی کے قریب سیٹی بجا بجا کر اپنا دل بہلا رہا تھا طبیعت موسمی تبدیلی کی وجہ سے ذرا مکدر تھی۔ اور میں باہر جانا نہیں چاہتا تھا سیٹی بجا کر بیکار وقت گذارنا بھی کچھ اچھا شغل نہ تھا لیکن اور کچھ کرنیکے لئے بھی اپنے آپ کو آمادہ نہ پاتا تھا۔ یکایک میرے کمرہ کا دروازہ کھلا۔ مینے تعجب سے دیکھا۔

"میاں طالب علم! آج شاید آپ خالی ہیں؟" یہ زائرہ کی آواز تھی۔

"نہیں تو ـــــ کیا بات ہے؟"

"میں آپ سے ایک خط اور لکھوانا چاہتی تھی۔"

"بہتر ہے ـــــ غالباً مسٹر بروسلا کو؟"

"نہیں۔ اس مرتبہ اُس کی طرف سے لکھا جائے گا۔"

"کیا؟ ـــــ کیا؟"

"میں ذرا بیوقوف ہوں۔ میاں طالب علم۔ وہ خط میرا اپنے لئے نہیں لکھوا رہی ہوں۔ بلکہ اپنے ایک دوست کیلئے لکھوا رہی ہوں۔ دوست کیا۔ میری اُس شخص سے شناسائی ہے۔ اُسے بھی میری جیسی ایک لڑکی سے محبت ہے۔ گویا زائرہ جیسی لڑکی سے۔ میرا مطلب آپ سمجھ گئے .... تو اب آپ اس زائرہ کو ایک خط لکھ دیجئے۔"

مینے اُسکی طرف دیکھا۔ اُس کا چہرہ ذرا پریشان تھا اور انگلیاں کانپ رہی تھیں۔ بعض اوقات وہ ایسی مسترحم نگاہیں مجھپر ڈالتی گویا آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھے جذب کر لینا چاہتی ہے۔

ابتدا میں مجھے صورتِ حالات کے سمجھنے میں دقت ہوئی۔ میں بالکل معمہ میں اُلجھ کر رہ گیا۔ لیکن رفتہ رفتہ واقعات واضح ہو گئے اور میں نے زائرہ کا حقیقی مدعا سمجھکر کہا:۔

"ادھر دیکھو محترم خاتون، میں خوب سمجھ گیا ہوں کہ نہ کسی بروسلا کا دنیا میں وجود ہے نہ زائرہ کا۔ تم مجھے فریب دیتی رہی ہو۔ اور ایک مسلسل جھوٹ بولتی رہی ہو۔ اب تمہارے لئے بہتر یہی ہے کہ مجھے پریشان نہ کرو۔ میں تمہارے ساتھ تعلقات بڑھانا مطلق پسند نہیں کرتا ـــــ سمجھ گئیں ـــــ!"

وہ یکایک خوفزدہ سی ہو گئی اور ذرا پیچھے ہٹ کر منھ ہی منھ میں بڑبڑانے لگی۔ میں اُسکی ان حرکات و سکنات کو دیکھکر اپنے دلمیں سمجھ رہا تھا کہ یقیناً اُسکے چال چلن کا اندازہ لگانے میں مینے کوئی دھوکا کھایا ہے۔ اس عورت کے پردہ میں ضرور کوئی راز ہے؟

"میاں طالب علم .....!" اُسنے حیرت سے زبان کھولی اور اپنا ہاتھ اُٹھایا۔ مگر پھر کچھ سوچکر یکایک دروازے کی طرف پلٹی اور باہر چلی گئی۔

میں بھونچکا سا رہ گیا ـــــ میرا ضمیر مجھے ایک شخص کا دل توڑنے پر ملامت کر رہا تھا۔ اسی دوران میں مینے سُنا کہ اُسکے کمرے کا دروازہ زور سے کھلا۔ کواڑوں کے دیوار سے ٹکرانیکی آواز کان میں آئی ـــــ یقیناً وہ غصہ کی حالت میں تھی۔ اور اُسکی کبیدہ خاطری کا سبب میں ہی تھا۔ مینے تہیہ کیا کہ اُسکے پاس جاؤں اور دلدہی سے اُسے اپنے کمرے میں بُلاکر اُسکا خط لکھدوں۔ خواہ وہ بروسلا کو لکھوائے یا زائرہ کو۔

چنانچہ میں فوراً اُسکے کمرے میں پہونچا۔ چاروں طرف نظر ڈالی اور دیکھا کہ وہ ایک کونے میں میز کے پاس اپنی کہنیوں کا

سہارا لئے ہوئے منہ چھپائے بیٹھی ہے :-

"سنو خاتون!" میں نے ذرا نرم لہجہ میں اُس سے کہا:-

(اب یہ جگہ ہے جہاں آکر میں اکثر اپنے فسانوں یا قصّوں میں ذرا مضحکہ خیز اور مہمل بن جایا کرتا ہوں۔ بہر حال............)

"سنو خاتون.........!" میں نے پھر دُہرایا۔

وہ اپنی جگہ سے اُچھل کر میری طرف تیز تیز نگاہوں سے دیکھتی ہوئی بڑھی۔ اور میرے دونوں شانوں پہ ہاتھ رکھ کر آہستہ آہستہ اپنی مخصوص آواز میں کہنا شروع کیا:-

"ادھر دیکھو ---- میں تمہیں سب کچھ بتائے دیتی ہوں۔ واقعہ وہی ہے۔ جو تم نے سمجھا ہے۔ یعنی نہ دنیا میں کسی بروسلا کا وجود ہے نہ زائرہ کا۔ لیکن تمہیں اس سے کیا سروکار؟ کیا تمہیں اپنے پڑھے لکھے ہونے پر اسقدر ناز ہے کہ کسی غریب کے لئے کاغذ پر قلم کو جنبش دینے میں بھی تکلف ہوتا ہے! ---- کیوں؟ تم ایسی اچھی صورت شکل کے لڑکے ہو کر اتنے بیدرد ہو ---- ! یہ سچ ہے کہ نہ بروسلا ہے نہ زائرہ۔ صرف میں ہوں اور جس قابل بھی ہوں تمہاری خدمت کے لئے حاضر ہوں!"

"میں معافی چاہتا ہوں!" میں نے ذرا پشیمان ہو کر کہا:-

"میری سمجھ میں نہیں آتا ---- تم کہتی ہو کہ بروسلا واقعی کوئی شخص نہیں ہے"

"ہاں یہ صحیح ہے!"

"اور نہ زائرہ کی کوئی ہستی ہے"

"نہ زائرہ کی کوئی ہستی ہے۔ زائرہ میں خود کو سمجھ لیتی ہوں"

کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آخر یہ معمہ کیا ہے؟ میں اُسکے چہرہ پر نظریں جمائے ہوئے یہ سوچ رہا تھا کہ ہم میں سے کسکی عقل میں فتور آگیا ہے۔ میری یا اُس کی؟ وہ اس عرصہ میں پھر میز کی طرف بڑھی اور ادھر اُدھر درازوں میں کوئی چیز ڈھونڈنے لگی۔ پھر میرے پاس آئی اور ایک طنزیہ لہجہ میں کہنے لگی:-

"اگر تمہیں بروسلا کو خط لکھنا اتنا گراں گذرتا ہے تو ادھر دیکھو ---- یہ لو اپنا خط! ---- میں کسی اور سے لکھوا لوں گی"

میں نے دیکھا ---- اُسکے ہاتھ میں واقعی میرا گذشتہ ہفتہ کا لکھا ہوا خط موجود تھا!!

"سنو زائرہ آخر اس سب کا کیا مطلب ہے؟ تمہیں دوسروں سے خط لکھوانے کی کیا ضرورت ہے جب میرا لکھا ہوا خط تمہارے پاس اتنے دنوں سے موجود ہے اور تم نے اُسے آج تک نہیں بھیجا"

"بھیجتی کہاں؟"

"اسی مسٹر بروسلا کے پاس۔"

"اس نام کا کوئی آدمی ہی نہیں ہے۔"

میں بالکل بیوقوفوں کی طرح منہ پھاڑے ہوئے خاموش کھڑا تھا۔ میری عقل اس معمہ کو سمجھنے سے صاف جواب دے چکی تھی۔ اب سوائے اس کے میرے لئے کوئی چارہ کار نہ تھا کہ منہ پھیر کر اپنے کمرہ کی طرف چل دیتا۔ مگر اُس نے اپنے مخصوص انداز میں پھر تشریح کی:۔

"تمہیں اس سے کیا؟ میں پھر کہتی ہوں کہ اس نام کا واقعی کوئی شخص نہیں ہے۔" اور یہ کہکر اُس نے کچھ ایسے تعجب سے ہاتھ پھیلائے گویا اُسے خود بھی اس پر تعجب تھا کہ اس نام کا کوئی شخص کیوں نہیں ہے؟

"لیکن یہ خواہش ہے کہ کوئی ہو! .... کیا میں اور انسانوں کی طرح انسان نہیں ہوں؟ ـــــ اس میں شک نہیں ـــــ یہ درست ہے کہ یہ میری خام خیالی ہے۔ تاہم میں یہ سمجھتی ہوں کہ اُسے خط لکھوانے میں نہ میں کسی کا کچھ بگاڑتی ہوں نہ کوئی گناہ کرتی ہوں۔"

"کسے خط لکھوانے میں؟"

"بروسلا کو ـــــ اور کسے؟"

"لیکن اس کا تو تم کوئی وجود ہی نہیں بتلاتی ہو!"

"افسوس! یہ واقعہ سہی، لیکن کیا ہرج ہے۔ اگر اُسکا کوئی وجود نہیں۔ میرا تو کوئی بھی اپنا یا عزیز دُنیا میں نہیں۔ بروسلا کا بھی اسی طرح کوئی وجود نہیں لیکن ہو تو سکتا تھا۔ میں اُسے لکھواتی ہوں اور یہ محسوس کرتی ہوں گویا واقعی وہ کوئی شخص ہے اور میرا محبوب ہے ـــــ مجھ پر گرویدہ ہے ـــــ پھر زائرہ میں خود کو سمجھتی ہوں، اُسے وہ جواب دیتا ہے، اور تب پھر میں اُسے لکھتی ہوں ...."

آخرکار میری سمجھ میں آگیا۔ اور میں اس قدر رنجیدہ، دل شکستہ اور پشیمان ہوا کہ میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے ...... آہ میرے قریب مجھ سے صرف چار پانچ گز کے فاصلہ پر ایک ایسی عورت بھی رہتی تھی۔ جس کا اس دُنیا میں نہ کوئی اپنا تھا نہ عزیز اور جس نے محبت، ہمدردی اور مروت کے لئے ترس ترس کر اپنے واسطے ایک خیالی دوست بنالیا تھا۔

"سنو ادھر دیکھو! ...." اُس نے میری ہمدردی کا اندازہ لگاتے ہوئے پھر اپنے خیالات کی تشریح کی:۔

"تم نے مجھے بروسلا کے لئے خط لکھ کر دیا، میں نے اُسے مختلف آدمیوں سے پڑھوا کر سُنا اور اپنے ذہن

میں یہ خیال قائم کرلیا کہ بروسلا واقعی کوئی شخص ہے۔ پھر میں نے تم سے بروسلا کی طرف سے زائرہ کو ایک خط لکھنے کی فرمائش کی۔ جب میں ایسا خط لکھوا لیتی ہوں، اور لوگوں سے اُسے پڑھوا تی ہوں تو مجھے کامل یقین ہوتا ہے کہ بروسلا کی اس دُنیا میں ضرور کوئی ہستی ہے۔ جو میرا عاشق ہے۔ اور اس طرح سے نتیجۃً مجھے اپنی زندگی زیادہ آسان پُرکیف اور خوشگوار معلوم ہونے لگتی ہے"

میں نے خود کو بڑی ملامت کی جب مجھے اُس کی دل آزاری کا خیال آیا۔

اُس روز سے ہمیشہ بلا تامل میں اُسے ہفتہ میں دو خطوط لکھ کر دینے لگا ایک بروسلا کو اور دوسرا اُس کے جواب میں زائرہ کو۔ میں اُن خطوط میں خوب دل لگا کر عبارت آرائی کرتا اور وہ اُنھیں سُن سُن کر اکثر رونے لگتی۔ اس خدمت کا صلہ کہ اُسے خیالی بروسلا کی طرف سے رُلا دینے والے خطوط موصول ہوتے ہیں مجھے یہ ملا کرتا کہ میرے قمیص پاجامے یا کوٹ کبھی درزی کے پاس درستی کے لئے نہ جاتے۔ زائرہ بلا کہے از خود اُنھیں لیجاتی اور جہاں کہیں سے وہ پھٹ جاتے یا کمزور ہو جاتے وہاں نہایت ہوشیاری سے اُنھیں درست کر دیتی۔

ان واقعات کے تقریباً تین ماہ بعد پولیس نے کسی نہ کسی سلسلے میں اُسے جیل خانہ بھیجدیا۔ سنتے ہیں کہ وہاں وہ مر گئی۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان جس قدر زیادہ مصائب و آلام کی تلخیاں برداشت کرتا ہے اُسی قدر وہ زندگی کی لذتوں کیلئے بیتاب ہوتا ہے۔ اور ہم جو زندگی میں کامیاب ہیں اپنی تہذیب، تعلیم یا دولت کے لباس میں ملفوف، دوسروں کو اپنے سراپا فریب نقطۂ نظر سے دیکھتے ہوئے، یہ نہیں سمجھ سکتے کہ "تلخ زندگی" حقیقت میں کیا ہے؟ ہم اس کا کوئی بھی اندازہ نہیں، لگا سکتے!

دنیاوی کاروبار اسی طرح چلتے رہے ہیں اور اسی طرح چلتے رہینگے۔ رنج مسرت کا خمیازہ ہے اور مسرت رنج کا انعام، لیکن ہم جس مسرت کو حاصل کرتے ہیں وہ فی الواقع ہمیں اپنے رنج کا انعام بنکر نہیں ملتی بلکہ وہ ہم سے کمزور اور کمتر درجہ کے آدمیوں کی آہوں اور آنسوؤں سے پرورش کیا ہوا پھل ہوتا ہے۔ جسے ہم زبردستی توڑ لیتے ہیں۔

دنیا کی موجودہ قومیں، اگر غور سے دیکھئے تو، دولت تعلیم اور تہذیب ہیں۔ لیکن ہم اسے نہیں مانتے، ہم بنی نوعِ انسان میں قومیں بناتے ہیں اور اُنمیں ایسا فرق سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ جیسا غیر جنس نفوس میں ہونا چاہیئے۔ ورنہ اچھوت اقوام اور چھوتی ذات کے لوگ کیا ہیں؟

کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ وہ سب سے اول اُسی قسم کے انسان ہیں جس قسم کے وہ لوگ ہیں جو خود کو بلند مرتبہ سمجھتے ہیں، اُن کے وہی ہڈیاں، وہی گوشت، وہی خون اور وہی رگ و ریشے ہیں جو اونچی ذات کے لوگوں میں پائے جاتے ہیں۔ اس کا علم ہمیں آج سے نہیں بلکہ اُس وقت سے ہے۔ جس وقت سے مخلوق معرضِ وجود میں آئی ہو۔

ہم اسے سنتے بھی ہیں اور اس سے انکار بھی نہیں کرسکتے۔ ہمیں احساس نہیں ہوتا کہ جو شے ہمارے لئے باعثِ فخر ہے اُس پر انسانیت شرم کرتی ہے۔ اب صرف شیطان ہی کو معلوم ہوسکتا ہے کہ اس تفوق اور تفاوت کی کیا وجہ ہے؟ —— غالباً وہ احساس جس سے ہم از خود اشرف المخلوقات بن گئے ہیں؟

مجھ سے پوچھئے تو ہم ہی جو خود کو بلند مرتبہ والا سمجھتے ہیں۔ دراصل سب سے نیچی اور رذیل قوم ہیں اس لئے کہ ہماری خودستائی، خودغرضی اور خودپسندی نے ہمیں ایسے قعرِ ذلت میں ڈھکیل دیا ہے۔ جہاں ہم اپنے انسانی فرائض اور فطرتی حقوق کو بُھلا بیٹھے ہیں۔

مگر یہ پُرانی باتیں ہیں —— اتنی پرانی کہ اب انھیں بار بار دہراتے ہوئے شرم محسوس ہوتی ہے۔

(ٹیگور کی) **طالب باغپتی**

کاجل - سرمہ - چورن - منجن

(اڈیٹر صاحب نگار نے خود ان دواؤں کا اطمینان کرکے اپنی رائے انکی مفید ہونے پر اکتوبر کے ملاحظات میں ظاہر کی ہے)

صرف یہ چار چیزیں میرے پاس ہیں۔ اور اگر آپ اعتبار کریں تو میں کہوں کہ انمیں سے ہر ایک چیز پورے بیس سال سے میرے خاندان کی تجربہ میں آرہی ہیں

کاجل جو آنکھوں کے تمام امراض کیلئے بیحد مفید ہے۔ سلائی لگاتے ہی ٹھنڈ سے نیند سی آنے لگتی ہے۔ جنکی آنکھیں آشوب کرتی رہتی ہیں۔ یا میلی ہوجاتی ہیں۔ یا سُرخی پیدا ہوجاتی ہے یا نزلہ کا پانی آتا رہتا ہے یا ضعف بصارت پیدا ہوچلا ہے۔ اُنکے لئے ہر روز رات کو ایک سلائی لگالینا چند دنمیں تمام شکایتیں دور کردیتا ہے۔ ایک ڈبیہ جو ایک شخص کیلئے سال بھر کو کافی ہے۔ قیمت (عمہ) علاوہ محصول۔

سرمہ یہ بیش بہا سُرمہ ۴۰ دن میں تیار ہوتا ہے۔ اسمیں نہ ممیرہ ہے نہ کوئی جواہر بلکہ معمولی سرمہ ہے جسکو جڑی بوٹیوں کے عرق میں پیسکر طیار کیا جاتا ہے۔ اسکے فوائد کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ جالا، دھند، موتیا بند اور ضعف بصارت صرف ایک ماہ کے استعمال سے جاتا رہتا ہے۔ اور بارہا آزمایا ہوا ہے۔ قیمت فی پڑیا (عمہ) علاوہ محصول۔

چورن یہ وہ اکسیری چیز ہے جس کا ہر گھر میں رہنا ضروری ہے۔ پیٹ کا درد، قبض، نفخ۔ ریاح کا پیدا ہونا۔ سوء ہضم دستوں کا آنا سب یکلخت اسکے استعمال سے جاتا رہتا ہے۔ کیسا ہی شدید درد پیٹ میں ہو فوراً ایک چٹکی کھانے سے جاتا رہتا ہے۔ قیمت فی ڈبہ ۲ تولہ عہ علاوہ محصول۔

منجن۔ اسکی ادنےٰ خوبی یہ ہے کہ ہلتے ہوئے دانت جم جاتے ہیں۔ قیمت فی ڈبہ ۸ تولہ (عمہ) علاوہ محصول۔

نوٹ۔ سب چیزیں منگانیوالوں کو محصول ڈاک معاف۔

م بیگم، نمبر ۲۴ - نظیر آباد - لکھنؤ،

رُباعیات باباطاہر عُریاں

فارسی شاعری کے آغاز کے متعلق مختلف روایات مشہور ہیں۔ جن میں سے ایک یہ ہے کہ حکومت صفاریہ کے بانی یعقوب بن لیث کا بچہ ایک دن اپنے ہمعمر بچوں کے ساتھ گولیاں کھیل رہا تھا۔ ایک گولی جو سوراخ سے دور جا پڑی تھی لڑھک کر آہستہ آہستہ سوراخ کی طرف جانے لگی۔ لڑکا بے اختیار چلّا اُٹھا

غلطاں غلطاں ہمی رود تالبِ گو

یعقوب کو خبر ہوئی تو وہ اس مصرع کو سنکر بہت خوش ہوا اور ماہران فن سے اس کا وزن دریافت کیا۔ اور تین مصرعے اس پر چسپاں کرنے کی فرمائش کی۔ چار مصرعے پورے ہوگئے تو دوبیتی اس کا نام رکھا۔ جو بعد کو رباعی مشہور ہوا۔ یہ واقعہ ۸۶۵ء کا ہے[۱]۔

اگر یہ واقعہ صحیح ہے تو رباعی کو اولین نظم فارسی ہونے کا فخر حاصل ہے۔ بہرحال رباعی کے ان امتیازات میں کوئی شک نہیں کہ۔

(۱) رباعی چھوٹی سی چھوٹی مستقل نظم ہے۔ اگرچہ قطعہ بھی دو بیت کا ہوتا ہے لیکن لازمی طور پر نہیں۔ دس بیس شعر کا بھی ہو سکتا اور ہوتا ہے۔

(۲) رباعی اپنے مخصوص وزن کے سبب سے تمام اصناف شاعری سے ممتاز ہے۔ غزل یا قصیدے کے دو قطعہ بند شعروں پر رباعی کا دھوکا نہیں ہوسکتا۔ جبکہ قطعہ کا ہوسکتا ہے۔

(۳) رباعی چونکہ مختصر سی مستقل نظم ہوتی ہے۔ اس لئے اسکے چار مصرعوں کی ترتیب میں خاص اہتمام کرنا پڑتا ہے۔ کوئی نادر خیال یا لطیف نکتہ رباعی میں بیان کیا جاتا ہے۔ اس طرح کہ پہلا شعر اسکے مناسب کہا جاتا ہے۔ اور دوسرے شعر میں وہ خیال یا نکتہ اس ترتیب سے ادا کیا جاتا ہے کہ اس کا نادر و لطیف حصہ

---

[۱] ماخوذ از کتاب انگریزی (AN OUTLINE HISTORY OF PERSIAN LITERATURE) (مختصر تاریخ ادبیات فارسی) مولفہ مولوی عابد حسن صاحب فریدی ایم۔ اے۔ ایل۔ ٹی۔ ایم۔ آر۔ اے۔ ایس پروفیسر فارسی سینٹ جانس کالج آگرہ۔

چوتھے مصرع میں ہوتا ہے اور تیسرا مصرع سامع کے ذہن کو اس کی طرف متوجہ و مشتاق کردیتا ہے۔ اگر رباعی میں یہ حسنِ ترتیب نہیں ہے تو صرف چار مصرعے ماہرانِ فن کے نزدیک رباعی کہلانے کے مستحق نہیں ہیں۔ مولوی سید مہدی حسین صاحب ناصری ایم اے اپنی کتاب مخزن الفوائد میں اس رائے کی تائید میں صائب کا یہ شعر پیش کرتے ہیں۔

از رباعی بیت آخر می زند ناخن بدل　　خط پشت لب چشم ما ز ابرو خوشتر است

اور کسی شاعر کی یہ رباعی بھی نقل کرتے ہیں۔

اے اختر فیض را ضمیرت مطلع　　طبع تو عروسان سخن را مجمع
از بسکہ رباعی تو افتاد بلند　　ہر مصرع او بود چہارم مصرع

اسی خیال کو پیش نظر رکھ کر خاکسار راقم نے یہ نعتیہ رباعی کہی ہے۔

دنیا میں رسولؐ اور بھی لاکھ سہی　　زیبا ہے مگر حضورؐ کو تاج شہی
ہے خاتمۂ حسن عناصر ان پر　　ہیں مصرعِ آخر اس رباعی کو وہی

(۴) رباعی کو ایک یہ بھی شرف حاصل ہے کہ مضامین تصوف سب سے پہلے رباعی کے ذریعہ سے ادا کئے گئے۔ اور حضرت مولانا ابو سعید ابو الخیر نے اس کی ابتدا کی۔ انکی رباعیوں میں مضامین تصوف دیکھکر بعد کے شعراء نے غزل و قصیدہ و مثنوی میں بھی تصوف کو داخل کیا۔ اور جب تک تصوف شاعری میں شامل نہ ہوا تھا فارسی شاعری سوز و گداز اور درد و اثر سے خالی تھی۔ تو گویا رباعی کا فارسی شاعری پر یہ احسان ہے کہ اس نے فارسی شاعری کو زیادہ دلکش اور موثر بنا دیا۔

رباعی پر تقریبًا تمام اساتذہ قدیم و جدید نے طبع آزمائی کی ہے۔ لیکن حضرت ابو سعید ابو الخیر اور حکیم عمر خیام صنفت رباعی کے مشاہیر گزرے ہیں کہ انھوں نے اپنے اظہار کمال کیلئے رباعی کو مخصوص کرلیا ہے۔ اور اس تنگنائے سخن میں وہ وہ جولانیاں دکھائی ہیں کہ عقل حیران ہے۔ ان ناموران رباعی کے ساتھ تیسرا نام باباطاہر ھمدانی کا لیا جاسکتا ہے جو زمانے کے لحاظ سے تیسرے نہیں بلکہ دوسرے ہیں۔ حضرت ابو سعید نے ۴۴۰ھ میں انتقال کیا اور باباطاہر نے ۴۱۰ھ میں یہ دونوں بزرگ ہمعصر تھے۔

باباطاہر کی رباعیاں رباعی کے مخصوص وزن (بحر ہزج اخرب یا اخرم) میں نہیں ہیں بلکہ بحر ہزج مسدس محذوف (مفاعیلن مفاعیلن فعولن) میں ہیں۔ اس لئے اصطلاحً رباعی سے خارج ہونی چاہئیں۔ لیکن رباعی کی اور تمام خصوصیات ان میں موجود ہیں۔ قوافی بھی قاعدہ رباعی کے مطابق ہیں۔ یعنی پہلے دوسرے اور چوتھے مصرعے میں قافئے ہیں۔ اس لئے قطعہ کی بھی صورت نہیں رہی۔ تو اب ان کو کیا نام دیا جائے؟ رائے عام

تے بجائے قطعہ کے ان کو بھی رباعی کہا۔ ایران میں بھی اسی نام سے مشہور ہیں۔

ان رباعیوں کی زبان بھی عام فہم و متعارف فارسی نہیں ہے محققین و مستشرقین کی رائیں اسکے متعلق بہت مختلف ہیں۔ قرین قیاس یہ ہے کہ ایران کے کسی صوبہ (غالباً رے) کی دیہاتی یا قدیم زبان میں ہیں۔ چنانچہ آتشکدۂ آذر کی یہی رائے ہے۔ لکھتا ہے:-

"عریان اسمش باباطاہر۔ دیوانہ ایست از ہمدان۔ فرزانہ ایست ہمدان۔ احوالش در پارۂ کتب مذکور۔ واخلاقش بین العرفا مشہور۔ عاشقے شیدا و سوزش جان از اشعارش ہویدا۔ بر زبان راجی بوزن خاصی دوبیتی بسیار گفتہ کہ اکثر از آن امتیاز کلی دارد۔"

راجی کی جیم زے کا بدل ہے۔ یعنی رازی (رے کی زبان) بعض کی رائے ہے کہ یہ رباعیاں ایران کی قدیم زبان میں ہیں۔ لیکن "قدیم زبان" کہنے سے اشتباہ پیدا ہوتا ہے۔ رباعیات کی زبان پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قصبات و دیہات کے غیر تربیت یافتہ لوگ الفاظ و تلفظ میں جس قسم کا تغیر اپنے لب و لہجہ اور آسانی کے مطابق پیدا کر لیتے ہیں۔ اسی نوع کا تغیر ان رباعیوں میں بھی ہے جس طرح ہندوستان کے دیہاتی بولتے ہیں ہمرے سنگ (ہمارے ساتھ) بھور بھئی (صبح ہوئی)۔ کرت ہیں (کرتے ہیں) وغیرہ۔ اسی طرح باباطاہر نے اپنے ملک کے دیہاتوں کی زبان میں لکھا ہے:- دیرم (دارم) سوجہ (سوزد) نمونہ (نماند) ونیم (بنیم)

باباطاہر کا ذکر بعض تذکروں میں نظر آتا ہے۔ مثلاً آتشکدۂ آذر۔ ریاض العارفین۔ مجمع الفصحا۔ لیکن سوانح حیات سے سب خاموش ہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ بتاتے ہیں کہ ہمدان کا رہنے والا تھا۔ مجذوب تھا۔ اور برہنہ رہتا تھا۔ اس لئے عریاں کہلاتا ہے۔ شیوخ و صوفیائے کرام میں اس کا شمار تھا۔ فردوسی کا ہمعصر تھا۔ سنہ ۴۱۰ ہجری میں وفات پائی۔

مستشرقین مغرب نے جو داد تحقیق دی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ باباطاہر فرقہ نصیری میں تھا جو (معاذ اللہ) حضرت علیؑ کو خدا مانتے ہیں۔ قبیلۂ لردن سے تعلق رکھتا تھا۔ اس لئے لری کہلاتا ہے۔ ہیرن ایلن نے باباطاہر کی رباعیات کا مترجم ایڈیشن شائع کیا ہے۔ اس کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ باباطاہر لکڑہارے کا لڑکا تھا۔ مدرسہ میں پڑھتا تھا۔ لیکن ذہن اچھا نہ تھا۔ استاد کی تقریر سمجھ میں نہ آتی تھی۔ ایک دن ہم جماعت لڑکوں سے کہا کہ تم سبق کو کسطرح سمجھ لیتے ہو۔ ہماری تو سمجھ میں آتا نہیں۔ لڑکے ہنسنے لگے۔ ایک بولا کہ ہم تو رات کو تالاب میں غوطہ لگا آتے ہیں۔ اور چالیس مرتبہ سر کو دھوتے ہیں۔ طاہر کو اس مذاق کا یقین آ گیا۔ رات کو وہ بھی تالاب پر پہنچا اور وہی عمل کیا۔ اسی وقت ایک شعلہ پیدا ہوا اور طاہر کے منھ میں داخل ہو گیا۔ اگلے روز جو مدرسہ میں آیا تو ذہن روشن تھا اور دماغ حکمت و فلسفہ کا گنجینہ۔ سب اس قلب ماہیت سے متحیر ہو گئے اس کے بعد سے

باباطاہر کے جسم میں اس قدر گرمی پیدا ہوگئی کہ کوئی شخص اس کے پاس نہ بیٹھ سکتا تھا۔ اب باباطاہر میں جذب کی کیفیت پیدا ہوگئی اور برہنہ پھرنے لگا۔

میں نے رباعیات ابوسعید ابوالخیر کے ترجمہ منظوم کے دیباچہ میں باباطاہر کے متعلق یہ رباعی لکھی تھی۔

ہمعصر ابوسعید باباطاہر　　مجذوب ہے لیکن ہی عجب کاشف سر

حیران ہیں دیکھکر کلام اہل نظر　　کیں فاتر عقل نے بھی عقلیں فاتر

واقعہ یہ ہے کہ باباطاہر کا کلام سادگی وسلاست کے ساتھ نہایت دلکش و موثر اسلوب بیان کا حامل ہے۔ معمولی بات کہتا ہے۔ لیکن کہیں طرز ادا سے کہیں خوبی تمثیل سے ایک ندرت اور جدت پیدا کردیتا ہے۔ اکثر رباعیوں سے شیفتگی و وارفتگی مترشح ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ شاعری کے شوق میں نہیں کہتا بلکہ دل کے جوش سے کہتا ہے۔ اور واردات بیان کرتا ہے۔ اسی لئے اصول قافیہ کی پروا نہیں کرتا۔ ایک قافیہ دو جگہ لے آتا ہے۔ تقریباً تمام رباعیاں غیر متعارف دہقانی یا قدیم زبان میں ہیں۔ لیکن ایک دو رباعیاں عام و معروف زبان میں بھی موجود ہیں۔ مثلاً

اگر دردم یکے بودے چہ بودے　　وگر غم اندکے بودے چہ بودے

بہ بالینم حبیبم یا طبیبم　　ازیں او گر یکے بودے چہ بودے

بعض رباعیاں ایسی ہیں کہ قدیم کی جگہ جدید الفاظ لکھدئے جائیں تو معمولی زبان کی رباعیاں بنجائینگی۔ مثلاً

نگارینا دل و جانم تہ داری　　ہمہ پیدا و پنہانم تہ داری

نذونم مو کہ ایں دردازکہ دیرم　　ہمی دونم کہ درمانم تہ داری

اس کو اس طرح پڑھ سکتے ہیں:۔

نگارینا دل و جانم تو داری　　ہمہ پیدا و پنہانم تو داری

ندانم من کہ ایں درد از کہ دارم　　ہمی دانم کہ درمانم تو داری

میں نے چند رباعیوں کا ترجمہ اردو رباعیوں میں کیا ہے۔ باباطاہر کی رباعیاں رباعی کے وزن میں نہیں ہیں۔ میں نے ترجمہ میں رباعی کی بحر قائم رکھی ہے۔ ان کے درج کرنیسے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ باباطاہر کے لغات کا حل لکھدوں تاکہ ناظرین کو اصل رباعیوں کے سمجھنے میں آسانی ہوجائے۔

لسوجہ	لسوزد	لسوجم	لسوزم
لسوجونم	لسوزانم	غمینہ (ہ)	غمین است (است)
مو	من	تہ	ترا

ویرم	دارم	ورلنشی	دورلنشو
ریژه	ریزد	بتیہ	بے تو
نمونہ	نماند	ویئم	ابنیم
نموین	نمایند	گیژه ویژه	پریشان
خیژه	خیزد	بے	بود۔ باشد
سوجه	سوزد	موآں ویرم	من آں دار درخت استم
شو وروز	شب وروز	زمولبتوں	زمین لبتاند
وینند	بنید	کنہ	کند
گرده	گردد	زاماں	زماں
وینن	بنیند	سخون	سخن
داتہ	باتو	کرن	کنند
نشینن	نشینند	پائے نہ بے	پائے نیست
نشیم	نشوم	آنوں	آناں

بوئیم۔ ۔ ۔ بہ بنیم

اب چند رباعیاں مع ترجمہ ملاحظہ ہوں :-

رباعیات باباطاہر

(۱)

دولت اے سنگدل بر ما نسوجہ
عجب نہ بود اگر خارا نسوجہ
نسوجم تا بسوجونم دلت را
در آتش چوب تر تنہا نسوجہ

(۲)

دلم از درد تو دائم غمینہ
ببالیں خشتم و بستر زمینہ

ترجمہ از حامد حسن قادری

(۱)

حالت پہ مری تجھے ترس آتا کیا
پتھر ہے تو پھر جلے گا دل تیرا کیا
جلتا ہوں کہ تیرے دل میں بھی آگ لگے
ظاہر ہے جلیگی چوب تر تنہا کیا!

(۲)

دائم ترے درد سے ہوں رنجور و حزیں
تکیہ مرا خشت اور بستر ہے زمیں

ہمیں جرمم کہ مو تہ دوست دیرم
نہ ہر کت دوست دارد حالش اینہ

یہ جرم سہی کہ میں ترا عاشق ہوں
لیکن سب عاشقوں کا یہ حال نہیں

(۳)

ز دل نقش جمالت در نشی یار
خیال خط و خالت در نشی یار
مژہ سازم بگرد دیدہ بر چیں
کہ خوں ریژہ ۔ خیالت در نشی یار

دل سے نہیں مٹتی تری تصویر جمال
ہٹتا نہیں اک دم کو خیال خط و خال
پلکوں سے یہ روک ہو کہ جب خون بہے
ایسا نہ ہو آنکھوں سے نکل جائے خیال

(۴)

بنہ یکدم دلم خرم نمو نہ
دگر روئے تو دیئم غم نمو نہ
اگر درد دلم قسمت نموین
دلے بے درد در عالم نمو نہ

دل تیرے بغیر شاد و خرم نہ رہے
جب دیکھ لوں تجھکو تو کوئی غم نہ رہے
کردیں مرا درد سب کو تقسیم اگر
بے درد کے کوئی فرد عالم نہ رہے

(۵)

دلے دیرم زعشقت گیشزہ ویژہ
مژہ بر ہم زنم سیلا بہ خیژہ
دل عاشق مثال چوب تر بے
سرے سوجہ سرے خونابہ ریژہ

دل عشق میں تیرے کیا الم سہتا ہے
دریا مری آنکھ سے رواں رہتا ہے
عاشق کا بھی دل ہے چوب تر کی مانند
جلتا ہے ادھر ۔ خون ادھر بہتا ہے

(۶)

دلے نازک لبساں شیشہ ام بے
اگر آہے کشم اندیشہ ام بے
سرشکم گر بوہ خونیں عجب نیست
موآہ دیرم کہ در خون ریشہ ام بے

شیشے کی طرح دل ہو نزاکت پیشہ
اک آہ میں ہے شکست کا اندیشہ
خونیں نہوں اشک کیوں کہ ہونیں و شجر
ہے خون میں غرق جس کا ریشہ ریشہ

(۷)

ز شور انگیزی چرخ فلک مبے
کہ دائم چشم زخمم پر نمک بے

مجھ پر ستم و جور فلک رہتے ہیں
دائم مرے زخم پر نمک رہتے ہیں

دمادم دود آہم تا سماوات
دلم نالان و اشکم تا سمک بے

یا آہ رسا تا بہ سما رہتی ہے
یا اشک رواں تا بہ سمک رہتے ہیں

(۸)

خداوندا زبس زارم ازیں دل
شو و روزاں در آزارم ازیں دل
زلبس نالیدم از نالیدنم کس
زمولستوں کہ بیزارم ازیں دل

اس دل کے سبب خستہ و زار ہوں میں
آزار میں دن رات گرفتار ہوں میں
نالاں ہوں میں۔ نالہ و فغاں سے اپنے
لیلے کوئی دل کہ دل سے بیزار ہوں میں

(۹)

ز دست دیدہ و دل ہر دو فریاد
کہ ہر چہ دیدہ دینہ دل کنہ یاد
لبسازم خنجرے نیشش ز پولاد
زنم بر دیدہ تا دل گروہ آزاد

فریاد دل و دیدہ سے یارب فریاد
دیکھے جو نہ آنکھ۔ دل کرے پھر کیوں یاد
فولاد کی نوک کا بناؤں خنجر
اور بھونک لوں آنکھ میں کہ دل ہو آزاد

(۱۰)

خرم آناں کہ ہر زاماں تہ وینن
سخون وا تہ کرن وا تہ نشینن
گرم پائے نہ بے کایم تہ دینم
لبشم آنوں بونیم کہ تہ وینن

خوش ہیں جنھیں دیدار میسر ہے ترا
باتیں کریں۔ پاس بیٹھیں۔ تو کیا کہنا!
دیدار ترا جو میری قسمت میں نہیں
جو دیکھتے ہیں تجھے۔ انھیں دیکھوں گا

حامد حسن قادری

تذکرۂ خندۂ گل

مولفہٗ مولوی عبدالباری آسی جس میں ۳۰۰ سے زائد اردو فارسی کے ظریف شاعروں کے حالات مع اُنکے لطائف و ظرائف و انتخابات کلام کے درج ہیں۔ اردو میں اپنے موضوع کے لحاظ سے بالکل اچھوتی چیز ہے۔ حجم ۵۰۰ صفحات۔ قیمت چار روپیئے۔ علاوہ محصول۔

امینجر "نگار" لکھنؤ

شجاع حیدری

فارسی زبانکی ایک عجیب کتاب

"شجاع حیدری" اغلباً ابھی تک غیر مطبوعہ کتاب کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس عجیب و غریب کتاب کا ایک قلمی نسخہ ہمارے پیش نظر ہے۔ اور کیا عجب کہ یہ ایک "واحد" نسخہ کی حیثیت رکھتا ہو۔

میرے ایک ہم وطن بزرگ غلام نجف مرحوم نے، جو غدر ۵۷ء سے پہلے داروغۂ جیل کے عہدہ پر ممتاز تھے، اور کتب بدیعہ کے جمع کرنیکے خاص طور پر شائق (گو اُن کی علمیت کی سطح اور علمی مذاق کا معیار ان کے شوق کے ہم پلہ نہ تھے) بدشواری تمام ۱۲۶۹ھ (۱۸۵۳ء) میں اسکی نقل اپنے ضلع کے رئیس محمد غلام غوث صاحب تعلقہ دار جھاجھر ضلع بلند شہر کے کتبخانہ سے حاصل کی تھی اور چمڑے کی ایک خوشنما جلد میں جس کے سیدھی طرف سونے کے جلی حروف میں کتاب کا نام درج ہے اُسے مجلد کرایا تھا۔ ظاہر ہے کہ وہ اس کتاب کو عزیز رکھتے اور خاص دلچسپی کی نظر سے دیکھتے ہوں گے۔

کتاب کے خاتمہ پر مرحوم نے اس کتاب کے متعلق جو روئداد لکھی ہے وہ بجنبہ نقل کرتا ہوں:۔

"تمت تمام شد کتاب "عجائب البلدان"۔ کاتب الحروف احقر العباد خاکپائے اُستادان والاتبار بندہ درگاہ رحمانی غلام نجف عثمانی (عثمانی) عفی اللہ عنہ ساکن برن شہریست بلند طال اللہ طولہ و بسط اللہ عرضہ امن المکان با المکینہ کہ شوق اجتماع کتب ہائے بدیعہ داشت و کتابے چند غریبہ فارسی در سائلات (مسایل) دفقہ و حکمت وغیرہ از جائے کہ بہ قیمت خواہ برائے نقل کہ بہم رسید دستیاب نمودم۔

بسمع خاکسار رسیدہ کہ کتابے موسومہ شجاع حیدری من تصنیف محمد حیدر خلد اللہ ملکہ کہ عجائبات و غرائبات ممالک انتخاب نمودہ انداز سمت ولایت بکتبخانہ سرکار فیض آثار میاں محمد غلام غوث صاحب تعلقہ دار قصبہ جھاجھر دام اللہ اقبالہ در آمدہ است۔ مشتاق مطالعہ اش بودہ ہزار حسبت وجوے از سرکار موصوف طلب داشتہ۔ معاینہ حال مندرجہ اش حض (حظ) وافی برداشتہ نقلش بعرصہ

قلیل نمودہ شد کہ بعون الہی بتاریخ پنجم شہر ربیع الثانی ۱۲۶۹ھ ہجری نبوی در روز دوشنبہ پس از الفراغ نماز عصر بمقام اٹہ جیلخانہ ضلع بلندشہر کہ بعہدہ داروغگی محبس ممتاز است صورت اختتام پذیرفت۔ اللہ بس باقی ہوس۔ فقط بپاس خاطر برخورداران محمد عبدالعزیز و عبدالواحد طال اللہ عمرہ و قدرہ وعلمہ وعزتہ قلم بند گردید۔

ہر کہ خواند دعا طمع دارم
زانکہ من بندۂ گنہگارم
من نوشتم صرف کردم روزگار
می نمانم پس بماند یادگار

تمت تمام شد۔ کار من نظام شد

تم تم تم تم تم

تمام شد

خدا مرحوم کو غریق رحمت کرے۔ وہ عرصہ ہوا وفات پا چکے۔ بلکہ اُن کے فرزندان دلبند بھی جنکے بپاس خاطر اپنا قیمتی وقت صرف کرکے اُنھوں نے اس کتاب کو نقل کیا تھا۔ اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں۔ البتہ انکی یہ قلمی یادگار، جو خود بھی نہایت آسانی سے فنا ہو جانیوالی چیز ہے۔ محض حسن اتفاق سے باوجود غدر کی دستبرد کے اس وقت تک محفوظ رہ گئی ہے۔

خاتمہ کی عبارت کے (جس میں کاتب نے فی الواقع اُسکے اختتام کو ظاہر کرنے کیلئے غیر معمولی اہتمام دکھایا ہے،) پڑھنے سے ناظرین کو خیال ہوگا کہ اس کتاب کا مصنف محمد حیدر راجہ خلد اللہ ملکہ کی دعا سے یاد کیا گیا ہے، اُس زمانہ میں کوئی تاجدار حکمراں تھا۔ لیکن ناظرین کے استعجاب کی کوئی حد نہ رہے گی۔ جب وہ یہ سنیں گے کہ اس کتاب کے مصنف کی ذات کو فی الواقع نہ حکومت سے تعلق تھا، نہ اُس عہد سے، بلکہ وہ اُس وقت سے کم از کم دو سو برس پہلے وفات پا چکا تھا!

یہ مصنف کون تھا؟ کس زمانہ میں تھا؟ کتاب کب لکھی؟ اور کس فن میں لکھی؟ ان سوالوں کا جواب حسب معمول اس کتاب کے دیباچہ میں ملجاتا ہے۔ جہاں مصنف بعد حمد و نعت کے لکھتا ہے:۔

"ہزاراں ہزار آفرین و تحسین بذات پادشاہ مقدس جم جاہ ملائک سپاہ ظل اللہ نورالدین و محمد جہانگیر پادشاہ غازی خلد اللہ ملکہ کہ از میامن قدوم سعادت لزوم آں ہمہ ہندوستان دارالامام (دارالسلام) گردیدہ، رعایا از دست تعدی ایام در مساکن خود با آرام گذرندہ

بدعائے ازدیاد عز و دولت بندگان آنحضرت مشغول اند - خدیو گیہان بر سر بندگان او سبحانہ تعالےٰ ابد الدہر ظل گستر داراد -

بعد ازاں بندہ احقر العباد محمد حیدر کہ بعد تحصیل علوم مشغول مطالعہ تواریخ اسلام گردید پارہ چند از استادان معتبر بدست آوردہ ترتیب نمودہ کہ او سبحانہ تعالےٰ بید قدرت خود آں قسم عجائبات و غرائبات آفریدہ کہ عشر عشیر آں بقیہ قلم نیاوردہ و دفاتر می باید کہ عجائبات ہر ولایت را بیان نماید - لاچار بحسب ضرورت شمہ از اں از خوارق ایشاں از ہر ولایت بعضے عجائبات الٰہی بہ تحریر آوردہ تا پادشاہان صاحب عزم را از حقائق ممالک اطلاعی بودہ باشد - چوں نسخہ بانجام رسید بہ نظر ہمایوں صاحب عالم و عالمیان و شاہزادہ عالی تبار بلند اقبال جواں بخت والا جاہ محمد شجاع بہادر گزرانیدہ - از محفل قدس آئین سلطان بہ شغل تواریخ نویسی بادشاہ سابق موصوف و مدام جناب انور الیشاں در تردد و تلاش عجائبات قدرت الٰہی معروف بود - چوں ایں نسخہ بہ نظر مبارک شاہزادہ والا تبار گذشت - از مطالعہ آں خیلے مزاج مبارک خورسند گردیدہ ، فی الجملہ اثباتاً بعضے عجائبات و غرائبات کہ در ولایت ہندوستان و دیگر ولایت کہ مذکور خواہد شد مردم معتبر را از مردمان و خاصان خود بولایت قریب و دور رخصت فرمودند کہ عجائبات ہر ولایت را تحقیق کردہ باشند - چنانچہ ایں بندہ احقر را باسیادت پناہ فضائل و کرامات دستگاہ سید علاء الدین بجانب ولایت کشمیر و تاشقند و ایران و توران رخصت فرمودند ، و فرصت دو سالہ عنایت کردند کہ در عرصہ دو سالہ آنچہ عجائبات ولایتہا معلوم شود ہمہ را ملاحظہ کردہ بیایند - بفضل الٰہی بہ اقبال شاہنشاہی زیادہ از مرقومہ صنعت الٰہی را ملاحظہ کردہ - صورت حال بہ مہر سکنائے آں دیار برآں عجائبات کردہ - بہ نظر اقدس آنحضرت خدیو دولت گزرانیدم - و بہ ہمیں عنوان دیگر کساں معتبر را شاہزادہ کشورستاں برائے تعیین عجائبات ولایت را رخصت فرمودہ بودند - آں ہمہ نیز عجائبات آں ولایت را ملاحظہ کردہ - صورت حال بہ مہر رؤسائے آں دیار گردیدہ آوردند بہ نظر اقدس ہمایوں گزرانیدند - ہر یکے ازاں جملہ بمدت سہ سال و چہار سال بدولت ملازمت سعادت حاصل کردند - چوں ایں ہمہ ولایتہائے قریب بودند بہ ملاحظہ ایں معلوم شدہ آں ولایت کہ دور بودند کوائف آں از روئے سیر و تواریخ ہا داخل ایں نسخہ فرمودہ ایں نسخہ را شجاع حیدری نام نہادند ، و داخل کتبخانہ خاص فرمودند"

اس سولھویں صدی عیسوی کی ہندوستانی رنگ کی منشیانہ فارسی عبارت کے پڑھنے سے جس میں کہیں کہیں نقل کی عام دستبرد نے بھی تھوڑا سا انتشار پیدا کر دیا ہے - معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کا مصنف

محمد حیدر، تاریخ کا خاص طور پر شیفتہ و دلدادہ تھا، اور اُس نے اس فن میں بہت سی کتابیں دیکھی تھیں۔ وہ شاہزادہ محمد شجاع کے دربار میں ملازم تھا۔ نوجوان تیموری شاہزادہ اپنے آباؤ اجداد کے قدم بقدم علوم و فنون کا خاص طور پر دلدادہ و سرپرست تھا۔ اُسی کے لئے مصنف نے یہ کتاب لکھی۔ نوجوان شاہزادہ نے اس کتاب کے مصنف اور ایک اور اپنے ملازم سید علاء الدین کو دو برس کی رخصت دے کر کاشمیر، طاشقند و ایران و توران اور بعض دیگر اشخاص کو تین تین چار چار برس کے لئے دیگر ولایات کی سیر کے لئے بھیجا۔ ان بزرگوں نے ان ملکوں کی سیریں کر کے عجائبات قلمبند کئے۔ اور مصنف کا بیان ہے کہ اُن ملکوں کے رہنے والوں کی مہریں لگا کر حالات پیش کئے۔ یہ کتاب اُن تمام معلومات پر مبنی کی گئی ہے۔ البتہ دور دور دراز ممالک کے حالات دوسری کتابوں سے نقل کئے گئے ہیں۔

نوجوان شاہزادہ کی علمی شیفتگی بلاشبہ قابل ستائش ہے۔ ان بزرگوں نے براہ راست دبالواسطہ جو کچھ مواد پیش کیا، اُس کے ذمہ دار وہ ہیں۔ نتیجہ بہر حال ایک ایسی انوکھی کتاب ہے، جس میں ہر قسم کی عجائبات و غرائبات درج ہیں، جن کی تصدیق و تردید سے اس وقت ہمیں مطلب نہیں ہے یہ کتاب خود بھی عجائبات کے کتب خانہ میں رکھی جانیکے قابل ہے۔ اور اُس کے اکثر بیانات الف لیلہ اور داستان امیر حمزہ کے بعض غرائب کے ہم پلہ ہیں۔

یہ امر البتہ صحیح نہیں کہ یہ کتاب جہانگیر کے عہد میں لکھی گئی۔ ہندوستان کے حالات میں شاہجہاں آباد (دہلی) کا تذکرہ موجود ہے۔ اس کتاب کا زمانہ شاہجہاں کا آخیر عہد سلطنت معلوم ہوتا ہے۔ نقل کرنے میں کاتب سے شاہجہاں کا نام نظر انداز ہو گیا ہے اور صرف اُس کی ولدیت جو مصنف نے لکھی تھی باقی رہ گئی ہے۔

یہ دشوار ہے کہ اس کتاب پر جو پیش نظر قلمی نسخہ میں ۴۰۰ صفحات میں ختم ہوئی ہے، اور جس کے ہر صفحہ میں ۱۴ سطریں ہیں، کوئی مفصل تبصرہ لکھا جا سکے۔ اس کا مطالعہ ہمارے اُن بزرگوں کو جن کی نظر سے یہ کتاب گذری ہو گی۔ اپنا وقت لطف اور حیرت و استعجاب سے گذارنے میں بہت کچھ مدد دیتا ہو گا۔ آج ہم گو اس نظر اور اعتبار و اعتقاد سے اُس کے مضامین کو نہ دیکھ سکیں جو شاید اُس کتاب کو بعض قدیم ناظرین کو حاصل تھے۔ لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ آج بھی اُس کا مطالعہ خالی از لطف نہیں۔ البتہ موجودہ حالات اس کے مساعد نظر نہیں آتے کہ ہمیں یا ہمارے ناظرین کی اس قسم کی سیر و سیاحت نصیب ہو سکے جس میں تین چار برس صرف کرنے کے بعد ایک ایسی کتاب پیش کر کے خوش آمدید حاصل کر سکیں۔ جو شاید اس کتاب کے مصنف و اُس کے ساتھیوں کو حاصل ہو گئے تھے۔ زمانہ نہایت تیزی سے ہمارے تخیل و اعتقاد کے پیر شکست و [illegible]

اور اُس کے ساتھ مسرت و یقین کی بعض نہایت خوشگوار کیفیات نفسی سے ہم محروم ہوتے جارہے ہیں۔ یہ علم و حکمت کا تلخ مگر ناگزیر ثمرہ ہے، جس کی تلافی کے لئے روز بروز انسانی تخیل دوسرے قسم کے میدانوں میں سرگرداں ہے، لیکن یہ بحد مشتبہ ہے کہ ان چیزوں سے حقیقی لطف اندوزی کے لحاظ سے ہم اپنے نیکدل و پاک طینت بزرگوں کے کہاں تک ہم پلہ ہو سکتے ہیں۔

کتاب کا آغاز حسب معمول حمد و نعت سے ہوتا ہے۔ جس میں عجائبات کی نسبت ملحوظ کی گئی ہے چند فقرات ذیل میں نقل کئے جاتے ہیں:۔

"سپاس بیقیاس مرخالقے را کہ طبقات زمین و آسمان را در ہوا معلق داشتہ و افلاک را بر ترتیب کواکب آرائش داده، زمین را باستواری کوہ ہا پیرائش بخشیدہ۔ خدائے کہ انسان را بیک خاک آفریدہ چہ خلعت و عنایات و تفضلات فرمودہ، بر طبقۂ زمین از صفات و قدرت خود چہ عجائبات بظہور آوردہ کو چشم کہ قدرت او را تواند دید۔ کو عقلے کہ بہ صنعت او تواند رسید"

سب سے پہلے ولایت توران کا ذکر ہے۔ یہ تقدم شاید اس وجہ سے دیا گیا ہے کہ اُس عہد کے شاہی خاندان کا قدیم مرز بوم و آبائی وطن یہی ملک تھا۔ جس طرح آج انگلستان کا ملک ہماری زبان ولایت کے نام سے موسوم ہے۔ اسی طرح اُس زمانہ میں یہ ملک جہاں سے ہندوستان کی حکمراں قومیں آئیں ولایت کہلاتی تھی۔

توران سے اس مصنف کا مطلب ممالک ماوراء النہر ہیں۔ جنھیں آج کل ترکستان شرقی و غربی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس ملک کی صفت اس طرح لکھی ہے:۔

"ولایتے است بسیار وسیع و عالی بسیار دشت و کوہ کمتر آبادی در آں ولایت بسیار شہر عالی اند چنانچہ سمرقند و بخارا و اندرجان وغیرہ مواضعات و پرگنات اند کہ پہلو شہر ہا می زنند ..... زمینے است سبز و سیراب از فواکہ در آں ولایت اقسام پیدا می شوند و مردمانش سرخ و سفید رنگ می باشند۔ اکثرے ازاں قوم نسبت بولایت دیگر صاحب شمشیر و مبارز و دلیر می باشند، در موسم بارش برف اکثر جا ہا باراں می بارد۔ و مردم شہر ہا بسیار بکشت و کار آغشتہ اند، در تحصیل علم سرگرداں۔ الخ"

اب اس ملک کے دو ایک عجائبات سنیئے۔

(۱) آخر حدود صحرائے قلماق میں ایک کنواں ہے۔ جو پارہ سے بھرا ہوا ہے، حسین عورتیں اُس کنوئیں پر سوار ہو کر جاتی اور آواز دیتی ہیں تو پارہ کنوئیں سے آنے لگتا ہے۔ یہ عورتیں گھوڑے دوڑا دیتی ہیں ایک ایک کوس تک پارہ اُن کا پیچھا کرتا ہے اور گڑھوں میں جو پہلے سے کھدے ہوئے طیار رہتے ہیں بھر کر رہ جاتا ہے وہیں سے نکال کر بیچا جاتا ہے۔

(۲) اس ملک میں ایک حصار ہے، جس کے قریب ایک پہاڑ ہے اُس پہاڑ کے اندر ایک غار ہے اُس غار میں سے ظلمات کو راستہ جاتا ہے۔

توران کے بعد ایران کا نمبر ہے۔ وہاں کے چند عجائبات حسب ذیل بیان کئے گئے ہیں:-

(۱) ملک خراسان میں ایک پہاڑ ہے جسے سفان کہتے ہیں۔ اُس میں ایک غار تنگ و تاریک ہے جو بیمار صدق دل سے وہاں جاتا ہے اچھا ہو جاتا ہے۔

(۲) نواحی بلخ میں ایک موضع ہے۔ جسے دمہ فرعون کہتے ہیں۔ وہاں ایک پتھر ہے۔ اس موضع کی یہ خاصیت ہے کہ اگر سو آدمی بھی زور سے چلائیں تو ایک دوسرے کی آواز نہ سُن سکے۔ اس پتھر کو سنگ کر کہتے ہیں۔

(۳) ایک کنواں ہے جس میں اگر کوئی چیز ڈالدی جائے تو فوراً باہر پھینکدی جاتی ہے۔

(۴) ولایت ایران کے آخر حدود میں ایک پہاڑ ہے۔ جہاں ہر روز بلاناغہ بارش ہوتی ہے۔ برف کے اندر سے سبز رنگ کے مرغ پیدا ہوتے ہیں۔ جب برف پانی ہو کر پگھل جاتا ہے تو پھر مرغ برف سے نکل کر پرواز کرتے ہیں، اور کسی دوسری جگہ اپنا آشیانہ جا بناتے ہیں۔

توران و ایران کے بعد ہندوستان کا بیان ہے۔ پہلے اس ملک کی صفت و ثنا اسطرح لکھی ہے:-

"ولایت ہندوستان جنت نشان سر سبز و سیراب، و انبوہ خلائق در آں ولایت بسیار است۔ ممالک دیگر بممالک ہندوستان پیوستہ۔ ہر ولایت شہرہائے عالی و بزرگ (دارد) چنانچہ کابل و کاشمیر و پنجاب و ملتان و ٹھٹہ و سرہند و لاہور و شاہجہاں آباد و لکھنؤ و الہ آباد و بیجا پور، و ولایت ملک دکھن و حیدر آباد و ممالک دیگر گجرات و ٹٹہ و مقصود آباد و برہان پور وغیرہ داخل ہندوستان مقرر اند۔ جلال عظیم الشان پادشاہ مقابل جلال صنعت الٰہی است کہ در آں ہفتاد و دو ملت ہمہ مطیع و فرمانبردار اند۔ پادشاہ آنجا با ہر ملت چوں ملت خود نگہباں۔ لشکر بیکراں از سوار و پیادہ ہمراہ خود دارد۔ مخارج جمع لشکر از خزانہ خاص مقرر است، سوائے ممالک را تقسیم نمودہ بقدر ہر ایک از امرایان عظام و مردم انام سائر عوام با لہا دادہ کہ تا مداخل انجا را در مخارج خود ہا صرف می نمودہ باشند۔"

مصنف نے سلاطین مغلیہ کی طریق رواداری پر خاص طور پر زور دیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ اس ملک میں بہت سے مذاہب آباد ہیں۔ لیکن بادشاہ سب کے مذاہب کی نگہداشت مثل اپنے مذہب کے کرتا ہے چونکہ یہ ایک معاصر مسلمان مصنف کا بیان ہے، جس کی پیش نظر ہمارے زمانہ کے سیاسی مصنفوں یا مورخوں کی

طرح کوئی مصلحت یا صرا بدید پیش نظر نہ تھی۔ جس کی وجہ سے وہ صداقت سے انحراف کر کے خلاف واقعہ لکھتا، اُس کا بیان اس بارہ میں کہ اُس عہد میں تمام مذاہب کے ساتھ انتہائی رُواداری برتی جاتی تھی اور تمام مذاہب کے ساتھ صلح و امن کا برتاؤ سلطنت کی ایک مسلمہ اور بیّن پالیسی تھی۔ قطعاً ناقابل تردید و بلا پس و پیش قابل تسلیم ہے۔

کچھ جغرافیائی نوٹ بھی ملاحظہ ہوں:۔

"پنجاب زمینے است سبز و سیراب۔ مردم آنہا زرد رنگ و سفید و خوش عبارت و کاسب می باشند۔
کشتکاری آں ولایت بسیاری از آب چاہ و ہم از بارش باراں می شود"

ملتان شہریست در زمین سند در ولایت ہندوستان ہوائش گرم و سرد مردم آنجا زرد رو بسیار می باشند
صحرا بسیار، و حدود پیوستہ بدریائے شور"

کاشمیر جنت نظیر کے متعلق:۔

"کشمیر ولایتے است در ممالک ہندوستان سبز و سیراب کم حاصل۔ گلہائے رنگارنگ، تمام زمین
او از گلہا و فواکہ لبریز در ہر جا و کوچہ و شہر جو بہائے آب رواں جاریست۔ گل زعفران بسیار.....
مرداں آں ولایت سرخ و سفید۔ زناں پریچہرہ مردم دیو سیر۔ در آں ولایت بارش برف می شود"

اب ہندوستان کے کچھ عجائبات بھی سن لیجئے:۔

(۱) کوہستان ہمالیہ میں جسے مصنف نے ملک پروح (؟) "یا کوہستان" سے نامزد کیا ہے تبت کے قریب (جسے کاتب نے غلطی سے شاسب لکھا ہے) ایک دریا کا نام دریائے سنگیں ہے۔ انسان و حیوان جو کوئی اُس میں جا پڑے فوراً پتھر ہو کر رہ جاتا ہے۔

(۲) اسی کوہستان میں ایک تالاب ہے۔ نہایت گہرا اور بڑا، جہاں ہر سال لوگ جمع ہوتے ہیں بیچ تالاب میں ایک غار ہے، اُس غار میں ایک نہایت بلند درخت اُگا ہوا ہے، نہانے کے بعد لوگ اُس غار پر جاتے ہیں، وہاں ایک فقیر بصورت انسان نظر آتا ہے، جسے لوگ سجدہ کرتے ہیں اور وہ فقیر وہیں غائب ہو کر رہجاتا ہے۔

(۳) اُسی کوہستان میں ایک حیوان بہ شکل انسان رہتا ہے۔ جسے سمور کہتے ہیں۔

(۴) ملک دکھن میں ایک صحرا ہے جس کے حدود بجز ذات الٰہی کسی کو معلوم نہیں ہیں اُس صحرا میں انسان ورانہ گوش اور آدم بچھا اور دیگر حیوانات لنگور و میمون مشابہ انسان بکثرت ہیں:۔

"آفرینش ایں ہر چہار قوم مقابل بہ خلقت آفرینش مورد شد کہ تعداد و شمار آنہا بجز ذات الٰہی

دیگر را معلوم نیست"

ہر قوم نے اپنا پادشاہ مقرر کر رکھا ہے۔ اور حدود ملک متعین کرلئے ہیں۔ یہ سب مکھیوں سے بہت ڈرتے ہیں۔ موسم بہار میں جب میوہ پک جاتا ہے تو یہ مکھیاں اُڑ کر میووُں پر حملہ آور ہوتی ہیں۔ اُس وقت یہ سب اپنا گھر بار چھوڑ دیتے ہیں اور اپنے ممالک کی حدود پر آجاتے ہیں۔ چاروں قوموں کے سردار یکجا ہو کر باتفاق آگ جلاکر مکھیوں کو شکست دیتے اور اپنے گھر از سر نو آباد کرتے ہیں۔ ان اقوام کے باقی ایام باہمی جنگ وجدل میں گزرتے ہیں۔

(۵) ہندوستان میں ہندوؤں کے ایک معبد میں ایک آرہ ہے، جس سے لوگ منتیں پوری کرنے کے لئے اپنی گردنیں کاٹ ڈالتے ہیں۔

اکبر بادشاہ نے اس آرہ کو توڑوا دیا تھا۔ لیکن وہ اب بھی بنارس میں ہے۔

(۶) ایک معبد میں ایک پتھر کا بُت ہوا میں معلق ہے۔ جس شہر میں یہ معبد واقع ہے۔ وہاں ایک عجیب رسم ہے کہ کفر واسلام کی تفریق نہیں ہوتی۔ بازار میں دودھ چاول پکا کر جتنے آدمی ہیں اتنے ہی برتن رکھ دیئے جاتے ہیں۔ ہر شخص اپنا اپنا حصہ لے لیتا ہے۔ اگر کوئی بدنیتی کرے تو بیمار ہو کر مر جاتا ہے۔

(۷) ایک درخت ہے جس کا پھل انسان کی شکل کا ہوتا ہے۔

(۸) دکھن کے ایک غار میں ایک اژدہا ہے۔ جس کا سر گائے کی شکل کا ہے۔ اس غار سے پانی اُبل کر کنارہ تک آجاتا ہے۔ اُس کی سطح پر کف ہوتے ہیں جنھیں ظروف آہنی میں جمع کرنے اور دھوپ میں خشک کرنے سے سنگ مرمر بن جاتا ہے اور اُسے زہر مہرہ کہتے ہیں۔

(۹) ایک چشمہ ہے جو کاشتکاری کے زمانہ میں لوگوں کی استدعا پر اُبلتا ہے۔ اور قدرت الہی سے ایکدم تمام گردو نواح کی زراعت کو سیراب کردیتا ہے۔

(۱۰) کامرودیش میں پہاڑوں کے اندر سیمرغ پیدا ہوتا ہے، جو اُس ملک کے صحراؤں میں ہاتھیوں کا شکار کرتا ہے۔

(۱۱) ایک چشمہ ہے (جسے اگر چشمۂ حیات سے تعبیر کیا جائے تو بیجا نہ ہوگا) جہاں کوہستان سے عقاب اپنے بچوں کے ساتھ آکر چاندنی راتوں میں غسل کرتے ہیں۔ اُس میں نہانے سے بچوں کے پر نکل آتے ہیں۔ بوڑھا آدمی اگر اُس میں نہائے تو جوان ہو جائے۔

ہندوستان کے بعد فرنگستان اور پرتگال کا ذکر ہے۔ فرنگستان سے مصنف کی مراد یورپ ہے۔ وہاں کے حالات بھی سن لیجئے، جو میرے خیال میں اپنے طرز کی ایک ہی چیز ہے :۔

یہ ایک بڑا ملک ہے جہاں آٹھ پادشاہ ہیں، جن کے پایہ ہائے تخت بڑے بڑے شہروں میں قائم ہیں۔ انگریزوں کے شہر کا نام لاروہے، اور شہروں کے نام ژیان، علیلی بلوان، نسیع، برتکال (جسے کاتب نے ترتکال لکھا ہے)، اور فرانسیس۔ ایک شہر سے دوسرے شہر تک دو ماہ مقرر ہیں اور ہر مقام کی مسافت بہت دور دراز ہے۔ اور بہت سے دریا اور جزیرے اور حصار و بیاباں ہیں۔

(۱) ایک پہاڑ کوہ غلص نامی ہے، جہاں ایک دریا "نارموصلی" نام جاری ہے، جس میں حضرت عیسےٰؑ نے غسل فرمایا تھا، جو بیمار اُس دریا میں نہائے شفایاب ہوجائے، جو لوہا اُس میں ڈال دیا جائے اُس میں جوہر پیدا ہوجائیں۔ اُس ولایت کے لوگ سرخ رنگ "میش چشم" میگوں ہوتے ہیں گھوڑا کم ہوتا ہے، اونٹ کی سواری ہے۔ نمد پہنتے اور زرلفت کی ٹوپیاں اوڑھتے ہیں۔ وہاں پانی نہیں ہوتا۔ برسات میں پانی جمع کرلیتے ہیں زراعت کم ہوتی ہے۔ لوگ تجارت پیشہ ہیں۔ ایک ملک کے لوگ زرد رنگ سیاہ مو گربہ چشم کوتاہ قامت بے ریش ہوتے ہیں۔ مرد و زن میں تمیز نہیں ہوتی۔ البتہ لباس میں فرق رہتا ہے وہاں ریگ سے سونا پیدا ہوتا ہے، اور اُس ملک کے حدود ہندوستان میں جانب بنگالہ و ایران و روم و روس سے ملے ہوئے ہیں۔ بعض جگہ خشکی سے اور اکثر تری سے۔

فراسیسی نام کا جو شہر ہے وہ نہایت سرسبز و سیراب ہے اور طرح طرح کے فواکہ پیدا ہوتے ہیں۔ ہر گھر اور ہر گلی میں پانی کے چشمے جاری ہیں۔ کشمیر کی طرح وہاں طرح طرح کے پھول ہر گلی اور ہر صحرا میں پیدا ہوتے ہیں۔ اُس ولایت کی آمدنی فرنگ کے تمام دیگر ممالک سے زیادہ ہے، ہمیشہ موسم بہار رہتا ہے، ہر طرف سبزہ اور لوگ خوش و خرم۔ اکثر سیاح جو اُس ملک میں پہونچ گئے اُس کی بہار دیکھکر وہیں رہ پڑے، اور خدائے تعالےٰ کی یاد میں مشغول ہیں۔

پرتگال میں غلہ بہت پیدا ہوتا ہے اور دوسرے اور ملکوں میں جاتا ہے۔ یہاں کنیزان حسن صفا جمال و پریچہرہ ہوتی ہیں۔ جو بڑی بڑی قیمتوں پر بکتی ہیں۔ تمام ملک فرنگ میں پردہ نہیں، جو شخص چاہے دوسرے کے یہاں بے تکلف مثل اپنے گھر کے جاسکتا ہے۔ ایک پہاڑ میں سنگ سبز فام مثل زمرد پیدا ہوتے ہیں جنھیں سرماس کہتے ہیں، اُن کے استعمال سے چالیس دن میں پیر صد سالہ جوان اور ایک ہفتہ میں مایوس مریض شفایاب ہوجاتے ہیں، ایک اور پہاڑ ہے جسے "کوہ عدیم المثال" کہتے ہیں۔ وہاں الماس و لعل و فیروزہ و طلا پیدا ہوتے ہیں۔ اور صحرائے فرنگ میں ایک حیوان مثل ہاتھی کے ہوتا ہے جسکے پیر گائے کی دم گھوڑے کی گردن اونٹ کی ہے اسے "خرقہ الوت" کہتے ہیں۔

اخیر میں مصنف لکھتا ہے کہ اس ولایت کے عجائبات کہاں تک لکھے جائیں۔ دفتر چاہیئے

بہ نظر اختصار و بپاس خاطر ناظرین ان چند ہی پر اکتفا کیا گیا۔

افسوس ہے کہ مصنف کی کوتاہ قلمی سے ہم خدا جانے یورپ کے کن کن عجائبات کے بیان سے محروم رہ گئے۔ جو مصنف کے دماغ میں محفوظ تھے۔

یورپ کا یہ بیان اس قدر دلچسپ ہے کہ جتنی مرتبہ پڑھیئے نیا لطف حاصل ہوتا ہے۔

اس باب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانہ میں انگریزوں کو کوئی امتیاز حاصل نہیں ہوا تھا۔ بلکہ اُنھیں اچھی طرح جانتے بھی نہ تھے۔ برخلاف اس کے فرانسیسی اور پرتگیز وقعت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے اور خاص امتیاز رکھتے۔ بالخصوص فرانسیسیوں کی تعریف تو حد سے گذار دی ہے۔

شجاع حیدری کے دیگر ابواب حصص پر بھی اسی طرح قیاس کر لیجئے ہیں اس انوکھی کتاب کے عجیب غریب مضامین پر خندہ زن نہ ہونا چاہیئے۔ نہ خدانخواستہ ہمارے سنجیدہ جغرافیائی و علمی لٹریچر کو، جس کے بہترین وبیش بہا خزانے ہمارے بزرگوں نے چھوڑے ہیں اور آج بھی دُنیا کی حیرت کا موجب ہیں، اس معیار پر سمجھنا چاہیئے۔

ایسے عجائبات و غرائبات کا بیان جو افسانہ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے کچھ ہمارے لٹریچر ہی سے مخصوص نہیں ہے۔ انسان کی ادبی تاریخ میں اس قسم کا لٹریچر شاید سب سے پہلے پیدا ہوا۔ وہ انسان کے عجائب پرستی و غرائب پسندی و سریع الاعتقادی کے فطری رجحانات پر مبنی ہے۔ اُس کا آغاز اسی وقت سے ہو گیا جبکہ خوفناک جنگلوں اور بادیوں میں ہمارے قدیم ترین آباؤ اجداد یکجا جمع ہو کر بیٹھتے اور اسی قسم کے افسانے بیان کر کے اپنے کچھ لمحے دلچسپی و خوش دلی سے گذار دیتے تھے۔ اُس کے بعد بھی تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ یہ چیزیں ہماری مجلسوں کی گرمی کا موجب ہوتی رہیں۔ پچھلے زمانے ان چیزوں کے لئے خاص طور پر موزوں تھے۔ جبکہ آمد و رفت کی دشواریاں بہت بڑھی ہوئی تھیں۔ اور سفر نہایت دشوار تھا۔ اُس وقت ایسی باتیں خوب بنجھ جاتی تھیں۔ اور اُن سے پورا لطف حاصل ہو جاتا تھا۔ اور افسانہ نگار اپنے پُر سحر طریق پہ جو قدیم سے جاری ہے جو چاہتا تھا بلا خوف و تردید کہہ دیتا تھا۔

"فلاں ملک میں ایک پہاڑ ہے، جسکی کھو میں ایک چشمہ ہے۔ فلاں ملک میں ایک دریا ہے۔ فلاں ملک میں ایک صحرا ہے وغیرہ وغیرہ۔

اب جہاں چاہیئے۔ آپ تلاش کر لیجئے۔ عجائبات کے مصنف کی ذمہ داری ختم ہو گئی۔ یعنی آپ کی حیرانی و سرگردانی، یا اگر آپ ان میں مبتلا نہیں ہو سکتے تو آپ کی تھوڑی سی تفریح!

سید حسن برنی

آخری زار روس کا حشر

کہتے ہیں کہ خدا کی لاٹھی میں آواز نہیں ہوتی۔ مگر حضرت یہ لاٹھی زار روس کی سر پر ایسی شائیں سے پڑی کہ ساری دنیا اچھل پڑی۔ کیا کسی کو خیال بھی آسکتا تھا کہ جو ہستی "تعز من تشاء" کی فہرست میں اول نمبر پر ہے۔ وہ ایکدم "تذل من تشاء" کی صف نعلین میں آجائے گی۔ کیا کسی کو وہم بھی ہو سکتا تھا کہ جو اسٹیم رولر دنیا کو کچلنے کے لئے چلا تھا اس کا بوائلر اس طرح دھوں کر کے پھٹ جائے گا۔ کیا کوئی یہ سوچ بھی سکتا تھا کہ روس کے یہ "چھوٹے ابا"[۵] یوں ایکا ایکی اپنے بچوں کے ہاتھوں جنت نصیب ہو جائیں گے۔ اور کیا یہ امید ہو سکتی تھی کہ جو شاہان وقت ان سے فرضی رشتے قائم کرکے چچا۔ بھتیجے۔ ماموں۔ بھانجے۔ اور خدا معلوم کیا کیا بنے بیٹھے تھے دنیا کو اس طرح "ٹکر ٹکر دیدم دم نکشیدم" کا نقشہ دکھائیں گے۔ مگر جناب۔

غرض میں کیا کہوں دنیا بھی اک تماشہ ہے۔

زار روس مارے گئے اور اس طرح مارے گئے کہ کسی کو یہ بھی معلوم نہیں ہوا کہ کہاں مارے گئے۔ کس نے مارا۔ کن کن کو مارا۔ کیونکر مارا۔ اور ان کا مزار مقدس کس جگہ ہے۔ سنہ ۱۹۱۸ء کے واقعہ پر سے اب کچھ کچھ پردہ ہٹ رہا ہے۔ ادھر ادھر کے لوگ شہادتیں بہم پہنچا رہے ہیں۔ کاغذات کو دیکھکر پتہ چلا رہے ہیں۔ مگر اس پر بھی یہ حالت ہے کہ ایک یہاں کل وہاں کوئی اللہ کی بندی یا اللہ کا بندہ پیدا ہو جاتا ہے اور کہتا ہے کہ میں زار کا بھائی۔ میں زار روس کی بہن ہوں لوگ پوچھتے ہیں کہ حضرت اب تک آپ کہاں تھے۔ تو کوئی صاحب تو اپنا چین میں ہونا بیان کرتے ہیں۔ کوئی ترکستان کی دشت نوردی کے قصے سناتے ہیں۔ لیکن آخر کو سب جھوٹے ثابت ہوتے ہیں۔ ابھی تھوڑے دنوں کی بات ہے کہ ایک بیگم اسپتال میں یہی کہتے کہتے مرگئیں کہ میں زار کی بہن ہوں۔ دنیا بھر نے جھٹلایا مگر اسکو "نہیں" نہ کرنی تھی اور نہ مرتے دم تک کی۔ کہتے ہیں کہ آدمی مرتے وقت ذرا سچ بولنے لگتا ہے۔ اور اسی وجہ سے قانون نے ایسے بیان کو قابل اوخال شہادت قرار دیا ہے۔ مگر شاباش ہے اس مرنے والی پر کہ اس نے قانون کے اس مسلمہ اصول کو غلط ٹھہرا دیا

---

[۵] عیسائیوں میں عام طور سے حضرت عیسیٰ کو (FATHER) باپ کہتے ہیں۔ اور روس والوں کی جدت قابل داد ہے کہ انھوں نے اپنے بادشاہ کو پیغمبر سے کچھ ہی گھٹا کر (LITTLE FATHER) (چھوٹے ابا) کا خطاب دیا تھا۔

ہاں صحیح تو ہے جب خدا کا ڈر نکل گیا تو پھر بجائے بندے کس شمار و قطار میں ہیں۔

تو خیر۔ زار روس مرگئے۔ مگر یار لوگوں کو قصے کہانیاں بنانے۔ مورخوں کو اس معمہ کے حل کرنے اور دنیا بھر کو اس کے متعلق تو تو۔ میں۔ میں کرنے کے لئے کافی مواد چھوڑ گئے۔ غرض اب خدا خدا کرکے ان کے اس جہان فانی سے رخصت ہونے کا کچھ کچھ پتہ چلا ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ بانس پر چڑھ کر گرتے ہیں ان کا کیا حال ہوتا ہے۔ آپ بھی سن لیجئے۔ اور ممکن ہو تو عبرت حاصل کیجئے۔ گو مجھے کیا سب کو معلوم ہے کہ کوئی بھلا آدمی کسی مضمون یا کتاب کو اس لئے نہیں پڑھتا کہ اس سے کچھ سیکھے۔ بلکہ اس لئے پڑھتا ہے کہ کسی طرح وقت کٹ جائے اور پھر یہ کہہ کر کتاب بند کر دیتا ہے کہ

مرگئے مردود جن کی فاتحہ نہ درود،

زار یوں تو بظاہر ہٹا کٹا۔ موٹا تازہ آدمی تھا۔ مگر دنیا بیگم کے شوق نے اسکی طبیعت میں ذرا ضرورت سے زیادہ نرمی اور حد سے زیادہ کاہلی پیدا کر دی تھی۔ اسکی بیوی پہلے جرمنی کی ایک چھوٹی سی ریاست ہیسی کی شہزادی تھی قسمت کے زور سے روس جیسی سلطنت کی ملکہ ہو گئی۔ ہے یہ کہ جب کوئی چھوٹے درجہ سے ایک دم بڑے درجہ پر پہنچ جاتا ہے تو چھوٹا اپنے برابر والوں کو حقارت سے دیکھنے لگتا ہے۔ اسکی یہ حالت۔ زار کی یہ کیفیت۔ یہ ناؤ اب نہ ڈوبتی تو کب ڈوبتی اس پر یہ طرہ ہوا کہ بیگم نے لڑکیوں پہ لڑکیاں جننی شروع کیں۔ ملک کہتا کہ بادشاہت کے لئے لڑکا لاؤ۔ یہ لڑکی جن کر کتیں۔ ابکی لڑکا دونگی۔ خیر ہوتے ہوتے ایک لڑکا ہو ہی گیا۔ ملک میں بڑی خوشی ہوئی۔ لیکن رعایا کے صدمہ کی کوئی انتہا نہ رہی۔ جب انکو یہ معلوم ہوا کہ ولیعہد سلطنت کو ایسا لاعلاج[1] مرض ہے کہ اس سے اس بیچارے کا جانبر ہونا ممکن نہیں۔ ولیعہد ہوئے تو اس رنگ کے۔ اور اس پر یہ غضب ہوا کہ زارینہ اس خیال سے کہ یہ اولاد نرینہ پادری ریسپوٹین کی دعا سے ہوئی ہے۔ ان پادری صاحب کی ایسی معتقد ہو گئی کہ بغیر انکی صلاح کے قدم اٹھانا حرام سمجھتی۔ ریسپوٹین نے زارینہ کی اس کمزوری سے وہ فائدے اٹھائے کہ خدا کی پناہ۔ ہزاروں شریفوں کے گھرانے اسکی حرامکاری سے تباہ ہو گئے۔ ہزاروں شریف آدمی اسکی چالوں کا شکار ہوئے۔ غرض تمام روس میں ایک تہلکہ مچ گیا۔ ادھر یہ گڑبڑ مچ رہی تھی۔ اور ادھر یورپ کی جنگ عظیم شروع ہو گئی۔ ریسپوٹین کو اس سے بہتر ہاتھ لگنے کا اور کون سا موقعہ مل سکتا تھا وہ جرمنی سے مل گیا۔ اور زارینہ کے ذریعہ سے زار روس سے ایسے ایسے احکام نکلوائے کہ تھوڑے ہی دنوں میں بہی خواہان

---

[1] اس مرض کو ہیمو فیلیا (HAEMOPHILIA) کہتے ہیں۔ اور اس میں ہوتا یہ ہے کہ مریض کو اگر ذرا سا زخم بھی لگ جائے تو پھر خون کسی طرح نہیں تھمتا۔ بعض وقت ایسا ہوتا کہ خود بخود جلد پھٹ کر خون بہنے لگتا ہے۔ اور مریض خون بہتے بہتے ختم ہو جاتا ہے۔

سلطنت بڑے بڑے عہدوں سے علحدہ کردئے گئے اور ان کی جگہ رسپوٹین کے حواریوں کو مل گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فوج کو شکست پر شکست ہونی شروع ہوئی۔ راشن اور سامانِ جنگ کی کمی نے فوجوں کو بددل کر دیا۔ جنگ کے نقشے کھل جانے سے لڑائی کا رنگ بدل گیا۔ جب نوبت یہاں تک پہنچی تو روس کے ایک شہزادے پرنس فیلکس یوسوپونے اپنے چند دوستوں کی مدد سے رسپوٹین کا خاتمہ کر دیا۔ زارینہ کو بڑا صدمہ ہوا۔ اور رسپوٹین کے یہ الفاظ اس کے کانوں میں گونجنے لگے کہ "میرے مرنے کے تھوڑے ہی دن بعد تمہارے سارے خاندان کا خاتمہ ہے"۔

۱۹۱۷ء میں خاندان شاہی میں یہ کھچڑی پکنی شروع ہوئی کہ زار نکولاس کو تخت سے اتار کر کسی اور کو بادشاہ بنانا چاہیئے۔ اسی زمانہ میں دارالسلطنت میں خوراک کی کمی اور جاڑے کی زیادتی نے تمام ملک میں بدامنی پھیلادی۔ زارینہ نے رسپوٹین کا بدلہ لینے کے لئے زار روس سے الٹے سیدھے احکام نکلوانے شروع کئے۔ ان احکام نے آگ پر تیل کا کام کیا۔ رعایا بددل تو تھی ہی۔ اب بغاوت پر آمادہ ہو گئی۔ ۹ر مارچ کو خاص دارالسلطنت میں بغاوت ہوئی۔ زار روس اس زمانہ میں محاذ جنگ پر تھا۔ زارینہ نے اپنے اختیارات سے اس شورش کو دبانے کے لئے پولیس بھیجی۔ اور جب وہ انتظام نہ کرسکی تو رعایا پر فیر کا حکم دیدیا۔ اس جلد بازی نے تو رنگ ہی بدل دیا جو فوج پہلے سلطنت کے ساتھ تھی وہ بھی رعایا سے مل گئی۔ دوسرے دن شہر میں کامل ہڑتال ہوئی۔ لوگوں کے گروہ کے گروہ شہر میں چکر لگا رہے تھے۔ انکو منتشر کرنے کے لئے فوج بھیجی گئی۔ وہ جاتے ہی رعایا سے مل گئی۔ روس کی سب سے بہادر اور وفادار فوج پریہوبرازہنسکی (PREHOBRAZHENSKY) تھی۔ وہ بھی اس عام اثر سے نہ بچ سکی۔ اور زارینہ کے محل کا پہرہ چھوڑ کر باغیوں سے جا ملی اور اس طرح ایک ہی دن میں بغاوت مکمل ہو گئی۔

دارالسلطنت میں جو آگ لگی تھی۔ اس کے شعلوں سے چند ہی دن میں سارا ملک بھڑک اٹھا۔ ہر حصہ ملک میں عارضی حکومتیں قائم ہوگئیں۔ زار روس نے جرنیل "آئی ون ہو" کے تحت اس فساد کو رفع کرنے کے لئے فوج روانہ کی۔ لیکن وہ اس طوفان بے تمیزی میں سے نہ گزرسکی اور آخر اس کو واپس ہونا پڑا۔ جب رعایا نے اپنے انتظامات پورے کرلئے تو زار سے مطالبہ کیا کہ تخت سے دستبردار ہو جائے۔ بھلا ایک افیمی کو تخت سے کیا دلچسپی ہوسکتی تھی۔ اس کو تو روزانہ ۲ تولہ افیم اور سیر بھر مٹھاس چاہیئے تھی۔ وہ بچارا راضی ہو گیا۔ لیکن اپنے بیٹے کو بادشاہ بنانے کی سفارش کی۔ یہ سفارش اس لئے مسترد ہو گئی کہ ولیعہد اپنی بیماری کی وجہ سے یہ بار عظیم اٹھانے کے ناقابل تھا۔ اس کے بعد رعایا کی نظر زار کے بھائی گرانڈ ڈیوک نکولاس پر پڑی۔ لیکن اس نے یہ شرط پیش کی کہ میں بادشاہ اس وقت بنوں گا۔ جب ساری رعایا مجھے بادشاہ بنائے۔ بھلا اس گڑبڑ میں ووٹ لئے جانے کا کیا موقعہ تھا۔ لوگوں نے سوچا کہ یہ بادشاہ نہیں بنتا تو چلو کیا ہرج ہے۔ ہم جمہوری سلطنت ہی کیوں نہ قائم کردیں۔

" تو کو نہ موکو۔ لے چولھے میں جھونکو" کی صورت پیش آئی۔شخصی حکومت کا خاتمہ اور جمہوری سلطنت کا آغاز ہوا۔
اور لینن نے پریسیڈنٹ بنکر زمام حکومت ہاتھ میں لی۔ سلطنت سے دستبرداری کے بعد زار کو زارسکوسیلو کے محل
میں نظر بند کر دیا گیا لیکن اس کے آرام و آسائش میں ذرا فرق نہیں آیا۔ کھانا پینا تو درکنار انکی افیم روزانہ ان کو
پہنچ جاتی۔ یہ اسنٹے چڑھاتے اور مزے کرتے گویا تخت سے دستبرداری ان کے حق میں اور راحت کا باعث ہو گئی۔
اگست میں اس سارے خاندان کو سائبریا کے شہر ٹوبالسک میں منتقل کر دیا گیا۔ گورنر جنرل کا محل ان کے ٹھہرنے کو
ملا۔ اور وہاں بھی ان کی عظمت و شان کا پورا احترام کیا گیا۔ چنانچہ روانگی کے وقت ان کے محافظ کرنیل کو بے
لنسکی (Col. KOBYLINSKY) کو ہدایت کی گئی کہ جہاں تک ممکن ہو کوئی ایسی بات نہ کی جائے۔
جو زار یا اس کے کسی ساتھی کی دلشکنی کا باعث ہو۔ اس جلاوطنی میں سات باورچی ایک ساقی۔ ایک متیرزنک
ایک ایڈیکانگ۔ ایک ڈاکٹر۔ دو بہرے۔ ایک ولیعہد کا استاد۔ ملکہ کی خواصین اور خدمتگار غرض اس طرح مل
ملا کر ۳۳ آدمی ان کے ساتھ تھے۔ تھوڑے دنوں تک ٹوبالسک میں نہایت آرام سے ان کی گزرتی رہی۔ ان کو شہر
میں جانے اور شہر والوں کو ان کے پاس آنیکی اجازت تھی۔ زار کی ڈاک بلا کھولے پوری کی پوری اس کو پہونچ
جاتی تھی۔ لوگ سوغاتیں اور نذرانے لاتے اور یہ نہایت بےفکری سے اپنی زندگی گزارتے۔ لیکن آخر کہاں تک۔ مثل
مشہور ہے" اتر اشخنہ مردک نام"۔ تھوڑے ہی دنوں بعد ان کی قسمت پھر چکر میں آئی۔ پین کراٹو (PANKRATOV)
اس خاندان کا محافظ اعلےٰ مقرر ہوا۔ یہ وہ شخص تھا جو زار کے حکم سے ۲۷ سال سائبریا میں اور ۱۵ سال شلوسل برگ
کے خوفناک قیدخانہ میں اپنی عمر گذار چکا تھا۔ اُس نے آتے ہی بدلے لینے شروع کئے۔ سب سے پہلے یہ کیا کہ جو جیب خرچ زار
کو دیا جاتا تھا وہ بالکل بند کر دیا۔ اس کے بعد نوکروں پر سختی شروع کی۔ آخر یہ ہوا کہ ایک ایک کرکے سارے نوکر
نکل گئے۔ اور یہ نوبت پہنچ گئی کہ گھر کا کام خود زارینہ اور اس کی لڑکیوں کو کرنا پڑا۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ مشرقی روس میں کیمونسٹ پارٹی کا زور تھا۔ مگر یہ لوگ ادھر ادھر کی بغاوتوں کی وجہ سے
خود اپنی مصیبت میں گرفتار تھے۔ جب بغاوتوں کی طرف سے اطمینان ہو گیا تو انھوں نے زار کی طرف نظر ڈالی۔ کیمونسٹ
پارٹی کا مستقر اس زمانہ میں ایکٹرنگ برگ (EKATERING BURG) تھا۔ یہاں کی مجلس اعلےٰ نے یہ تصفیہ کیا
کہ زار کو ہماری نگرانی میں رہنا چاہئے۔ کیونکہ جس طرح اب اس کو رکھا گیا ہے اُس سے اندیشہ ہے کہ کسی وقت وہ بھاگ
جائے گا۔ یہ فیصلہ کرکے انھوں نے ماسکو کی پارلیمنٹ (Z I K) سے خط و کتابت شروع کی۔ لیکن لینن ان لوگوں
کی جابرانہ طبیعت سے واقف تھا اس نے زار کو حوالہ کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ جب اس طرح کام نہ چلا تو انھوں
نے دوسرا راستہ اختیار کیا۔ یعنی ٹوبالسک میں اپنے جاسوس روانہ کئے۔ اور انکی جھوٹی سچی رپورٹوں کی بنا پر سارے
ملک میں ایک قیامت بپا کر دی۔ ٹوبالسک سے ایکٹرنگ برگ صرف ۵۰ میل تھا۔ لینن کو خیال ہوا کہ کہیں ایسا نہ

ہو کہ یہ لوگ زبردستی زار کو نکال لیجائیں۔ اس لئے اس نے حکم دیا کہ خاندان شاہی کو بحفاظت تمام فوراً اوفا بھیج دیا جائے "یاکولیو" اس کام پر مقرر ہوا۔ اُس نے آتے ہی پہروں کا انتظام مضبوط کیا۔ روانگی کے لئے اسپیشل ٹرین کا بندوبست کیا۔ اور زار کو اطلاع دی کہ اسی وقت روانگی کے لئے تیار ہو جاؤ۔ بھلا ایک افیمی پر ایسی باتوں کا کیا اثر ہوتا وہ تو کچھ نہ بولا۔ ہاں زارینہ بڑے غیل لائی۔ قسمت پر اس کو بھروسہ نہ تھا۔ زبان پر اس کو قابو نہ تھا۔ جو منھ میں آیا وہ کہا۔ اور ایسی گڑبڑ مچائی کہ باہر والوں کو بھی اطلاع ہو گئی۔ کہ یہ لوگ کہیں دوسری جگہ بھیجے جا رہے ہیں۔ یہاں مخالفوں کے جاسوس تو لگے ہوئے ہی تھے۔ اُنھوں نے فوراً اپنے لوگوں کو اطلاع کر دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ادھر یہ خاندان روانگی پر تیار ہوا اور ادھر ان کے مخالفین نے ان کو محافظوں سے چھین لینے کا بندوبست کر لیا۔

خدا کا کرنا کیا ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں زار کا لڑکا بیمار ہو گیا۔ اور بیمار بھی ایسا ہوا کہ اس کا بستر سے ہلانا جلانا گویا اسکو مار ڈالنا تھا۔ "یاکولیو" کا تقاضا تھا کہ چلو اور ابھی چلو۔ سب نے آنسو بہائے۔ ہاتھ جوڑے۔ خوشامدیں کیں۔ مگر اس پر رتی برابر اثر نہیں ہوا۔ وہ جانتا تھا کہ موسم خراب ہونیوالا ہے۔ اور اگر ذرا بھی تعویق ہوئی تو پھر سفر کرنا دشوار ہی نہیں ناممکن ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی ڈر لگا ہوا تھا کہ کچھ دنوں اور اگر یہاں رہے تو کہیں زار کو مخالفین چھین نہ لیجائیں۔ آخر یہ قرار پایا کہ زار اور اُس کے خاندان کے کچھ لوگ اب چلیں اور باقی اس لڑکے کی تیارداری کے لئے ٹھر جائیں۔

ان تیاریوں کی اطلاع ایکیٹرنگ برگ کے جاسوسوں کو بھی ہو گئی۔ اُنھوں نے ادھر ادھر سے کچھ مزدوروں کو جمع کر کے یہ کوشش کی کہ زار کو اس کے محافظین کے ہاتھوں سے نکال لیویں۔ لیکن شوبالسک کے کاشتکاروں کو یہ منظور نہ تھا کہ زار ایسے ظالموں کے قبضہ میں جائے۔ اُنھوں نے ان مزدوروں کا مقابلہ کر کے انکی جمعیت کو پریشان کر دیا۔ اب مشکل یہ آئی کہ شوبالسک سے ریل کا اسٹیشن ۶۰ میل ہے۔ روانگی کے وقت تک زارینہ اس تذبذب میں رہی کہ زار کے ساتھ جائے یا لڑکے کی تیمارداری کے لئے ٹھرے۔ عین وقت پر آخر یہ قرار پایا کہ وہ خود اپنی ایک لڑکی میری کو لیکر زار کے ساتھ جائے اور باقی تین لڑکیوں کو شوبالسک ہی میں چھوڑ جائے۔ یہ لوگ چھکڑوں میں بیٹھ کر ریلوے اسٹیشن کی جانب روانہ ہوئے۔ اب شاہی ہمراہیوں میں چندہی آدمی رہ گئے تھے۔ یعنی ڈاکٹر بوٹکن۔ ایک بہادر چیموڈراد) ایک (سڈلو) ملازم خانگی۔ اور "اینا ڈیمن ڈوا" ملکہ کی خواص۔ بڑی مشکل سے اجازت لیکر ایک بڑے میاں بھی اس جماعت کے ساتھ ہو گئے۔ ان کا نام پرنس ڈول گوروکو تھا۔ اور یہ کسی زمانہ میں زار کے اڈیکانگ تھے۔ اینا نے عجیب طبیعت پائی تھی۔ بس یہ سمجھ لو کہ جس طرح کوئی شخص ادنٰے درجہ سے بڑھ کر اعلٰے درجہ میں پہونچ جاتا ہے اور اس ترقی سے اسکا دماغ خراب ہو جاتا ہے۔ بعینہ یہی حالت اینا کی تھی۔ وہ کبھی غریب تھی۔ لیکن زارینہ کی خواص ہو کر وہ اب کسی کو خاطر میں نہیں لاتی تھی۔ کوئی بتیس برس کی موٹی اور بھنگم عورت تھی۔ مگر بنی ٹھنی ایسی رہتی تھی کہ کوئی جوان عورت بھی کیا

رہے گی۔ تمام عمر تنگ دست رہی۔ لیکن اب اسکی یہ حالت تھی کہ لباس۔ چال ڈھال اور اینٹھن میں وہ کسی طرح زارینہ سے کم نہ تھی۔ اس کی ان حرکتوں سے لوگ سمجھنے لگے کہ یہ بھی خاندان شاہی میں سے ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ "ایں ہمہ بچۂ شتر است" کے دھوکے میں دشمنوں نے سب کے ساتھ اس کو بار کر ٹھکانے لگا دیا۔

بہرحال یہ قافلہ چھکڑوں کے جھٹکے سہتا۔ راستہ کی مصیبتیں اٹھاتا۔ تومان پہنچ ہی گیا۔ یہاں اسپیشل ٹرین تیار کھڑی تھی۔ یاکولیو نے جاتے ہی اسٹیشن پر قبضہ کیا۔ اور زار میں ماسکو کو تار دیا کہ اب کیا کیا جائے وہاں سے اطلاع ملی کہ "ایکیٹرنگ برگ" جانا ٹھیک نہیں ہے۔ وہاں سب لوگ تلے بیٹھے ہیں کہ زار کو چھین لیں۔ اس لئے مناسب یہ ہے کہ ذرا چکر سے اوماسک ہوتے ہوئے اوفا جاؤ" یہ حکم پاکر یاکولیو نے سب لوگوں کو ریل پر سوار کیا۔ اور اوماسک کا راستہ لیا۔ جاسوس تو ان لوگوں کے پیچھے لگے ہی ہوئے تھے۔ جب انھوں نے دیکھا کہ یہ ریل اوماسک کی طرف جا رہی ہے تو انھوں نے فوراً ہی اپنے اوماسک کے ساتھیوں کو تار کھٹکھٹائے کہ "زار تمہاری طرف سے اوفا جا رہا ہے" یہ سننا تھا کہ ان لوگوں نے یاکولیو کو تار دیا کہ "اگر اپنی خیر چاہتے ہو تو ادھر نہ آنا" بچارا یاکولیو پریشان تھا کہ آخر کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ اس نے پھر ماسکو کو واقعہ کی اطلاع دی۔ وہاں سے ہدایت ہوئی کہ "ایسی صورت میں ایکیٹرنگ برگ ہی کا راستہ اختیار کیا جائے" آخر پھر اسی راستہ کو دہرانا پڑا۔ شام کا وقت تھا کہ ریل ایکیٹرنگ برگ پہنچی۔ اسٹیشن پر یہاں والے پہلے سے مسلح ہو کر تیار کھڑے تھے۔ ایک نے انجن پر چڑھ کر ڈرائیور کو نیچے ڈھکیل دیا۔ اور ریل کو اسٹیشن نمبر ۲ پر لیجا کھڑا کیا۔ یاکولیو بھی پہلے سے ان مصیبتوں کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار تھا۔ اس نے زار کے درجہ کے سامنے اپنے سپاہیوں کا دستہ کھڑا کر دیا۔ اور مرنے مارنے پر تیار ہو گیا۔ ایکیٹرنگ برگ کی کونسل کے پریسیڈنٹ بیلڈورو نے یاکولیو سے آکر کہا کہ "تمہاری خیر اسی میں ہے کہ خاندان شاہی کو ہمارے حوالہ کر دو" یاکولیو نے صاف انکار کیا۔ ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ لوگوں نے ہجوم کر کے سپاہیوں کو تتر بتر کر دیا۔ اور زار کی گاڑی پر قبضہ کر لیا۔

دو موٹریں پہلے سے ان لوگوں کے لیجانے کے لئے تیار کھڑی تھیں۔ ان دونوں میں زار اور اس کے ساتھیوں کو اوپر تلے بھر گیا۔ گاڑیاں چلیں۔ اور گویا اس طرح زار کی قسمت کا فیصلہ ہو گیا۔ ان لوگوں کو لیجا کر وہاں کے ایک امیر سوداگر اپاٹیو کے دو منزلہ مکان میں ٹھہرایا گیا۔ پانچ کمرے ان کے رہنے کو دئے گئے اور بقیہ سب میں نگرانی کے لئے آدمی ٹھہرا دیئے گئے۔ جو کمرے ان بیچاروں کو ملے تھے۔ ان کی بھی یہ حالت تھی۔ کہ کونہ کونہ میں نگہبان کھڑے تھے۔ اور کوئی جگہ ایسی نہ تھی۔ جہاں دلجمعی سے بیٹھ کر یہ ایک دوسرے سے اپنا دلی راز کہہ سکیں یا کم سے کم آنسو بہا کر دل کی بھڑاس نکال سکیں۔ اس مکان کے سامنے جو عمارت تھی اس پر مشین گن لگا دی گئی کہ ذرا کوئی بھاگنے کا ارادہ کرے اور توپ سے اڑا دیا جائے۔ زار کے رہنے کے لئے جو کمرے دئے گئے تھے ان کی سب کھڑکیاں بند کر کے

کر کے بتا دیا گیا تھا کہ اگر کسی نے ذرا کھول کر جھانکا تو باہر سے فوراً گولی پڑے گی۔

پرنس ڈول گورو کو جیلخانہ پہنچا دیا گیا اور وہیں چند روز میں اس کا خاتمہ ہوگیا۔ یاکولیو نے کونسل میں جاکر اس بیجا سلوک کی شکایت کی۔ لیکن کوئی شنوائی ہونیکے بجائے اس کے ساتھیوں کے ہتیار چھین کر ان کو جیل خانہ میں ڈال دیا گیا اور خود اس کو حکم ملا کہ فوراً یہاں سے نکل جاؤ۔ ورنہ تمہاری بھی بُری طرح خبر لیجائیگی ماسکو میں جب یہ خبر پہنچی تو وہاں بھی چپ سادھ لی گئی۔ اور اس طرح اکیٹرنگ برگ والے اور شیر ہوگئے۔

جو لوگ ان کی نگرانی پر مقرر ہوئے تھے۔ وہ سب کے سب ایسے تھے کہ زار اور اسکی گورمنٹ کے ہاتھوں مصیبتیں اُٹھا چکے تھے۔ کوئی برسوں تک جیل خانوں کی سیر دیکھ چکا تھا اور کوئی سائبریا کی آفتوں کا مزا اُٹھا چکا تھا۔ ان سب کا افسر یول آف ڈیو تھا۔ یہ اول تو خود ہی اجڈ تھا اور اس پر شراب نوشی نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا تھا۔ کبھی تو ایسا غریب بن جاتا تھا کہ ہاتھ جوڑ کر باتیں کرتا۔ اور کبھی ایسا ہو جاتا کہ شیطان بھی اس سے پناہ مانگتا ایک دن بیٹھے بیٹھے کہنے لگا کہ میں تو تم سب کی تلاشی لونگا۔ زار تو کچھ نہ بولا۔ مگر زارینہ نے قیامت بپا کر دی۔ لیکن اس بدمعاش پر نہ گالیوں نے اثر کیا اور نہ خوشامدوں نے۔ زار کو بھی ان باتوں سے ذرا غصہ آگیا اور اس نے کہا "ابتک تم لوگوں نے شریفوں کا سا برتاؤ کیا۔ مگر اب کچھ رنگ بدل رہا ہے۔ تم سے تو پہلے ہی والے اچھے تھے۔ آخر یہ یہ ناش اول ...... ابھی زار کی بات ختم نہ ہوئی تھی کہ آبڈیو نے بگڑ کر کہا " بس چپ رہ" کیا اب بھی تو سمجھتا ہے کہ زار سکو سیلو کے محل میں بیٹھا ہے۔ اگر اب کی زبان ہلائی تو اس طرح خبر لونگا کہ تمام عمر یاد کرے گا۔ غرض تلاشی شروع ہوئی اور اس خاندان کی ایسی بیعزتی کی گئی کہ سننے سے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ ان بیچاروں کے پاس رکھا ہی کیا تھا جو تلاشی میں برآمد ہوتا۔ شاہزادی میری کے پاس چند روبل نکلے۔ جن کی قیمت کوئی بارہ تیرہ روپلے ہوگی۔ یہ بھی ضبط کر لئے گئے اس واقعہ کو شاہزادی میری نے اپنی بہن کو اسطرح لکھا ہے۔

"آج ہمیں ایسی قلبی تکلیف ہوئی کہ بیان نہیں ہو سکتی۔ دیکھئیے ابھی قسمت میں کیا کچھ لکھا ہے۔ چودہ مہینے قید رکھنے کے بعد اسطرح کا سلوک گویا زخموں پہ نمک چھڑکنا تھا۔ اماں اور ابا کے پاس تو کچھ نہیں نکلا۔ ہاں ٹوبالسک میں مجھے ایک بیچارے نے جو ۱۷ روبل اور ۵۰ کوپک دئے تھے۔ وہ بھی ان لوگوں نے چھین لئے۔

کل سے ہمارے محافظوں میں ایک دستہ کا اور اضافہ کر دیا گیا ہے۔ کل بڑی سردی تھی۔ بڑی مشکل سے تھوڑی بہت لکڑیاں مانگ کر آتشدان میں آگ جلائی۔ میں کیا کہوں کہ اسوقت مجھے ٹوبالسک والا مکان اور وہاں والوں کی مہمان نوازی کتنی یاد آئی۔ جب آنے لگو تو میرے لئے پاوڈر ضرور لیتی آنا۔ یہاں بھلا پاوڈر کہاں مل سکتا ہے۔ انیا بیچاری ہمارے کپڑے دھوتی ہے۔ اور اچھی خاصی دھوبن بن گئی ہے۔ شاید یہ خط روانگی کے دن تم کو ملے خدا کرے کہ تمہارا سفر آرام سے گزرے اور خداوند تعالےٰ تم کو اپنے حفظ وامان میں رکھے۔ امید ہے کہ تم سب بخیریت ہوگے۔"

مئی ۱۹۱۸ء میں زار کا لڑکا اور اُسکی لڑکیاں بھی ٹوبالسک سے آکر ان کے شریک حال ہو گئے۔ لڑکے کے ساتھ اس کی نرس ڈیڈ کا اور اس کا ایک فرانسیسی آتالیق۔ اور انگریزی کا ایک ماسٹر اسٹینلن گبز بھی آئے۔ ان سب میں سے کسی کو بھی باہر والوں سے ملنے کی اجازت نہ تھی۔ البتہ انکے سامنے والے مکان کا ایک لڑکا آکر زار وچ (ولیعہد سلطنت) کے ساتھ کھیلا کرتا تھا۔ غرض اسی طرح کچھ دن گزر گئے۔ گرمی شروع ہوئی۔ ہوا بند تھی۔ ایک دن کسی شاہزادی نے ایک کھڑکی کھولی۔ کھڑکی کھولنا تھا کہ باہر سے بندوق چلی اور گولی بچاری کے سر پر سے نکل گئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ زار اور اس کے خاندان کو ساری دنیا نے بھلا دیا تھا خیال تھا کہ کوئی نہ کوئی سلطنت زار کی رہائی کا مطالبہ کرے گی۔ لیکن کسی نے کروٹ تک نہ لی۔ شاہ انگلستان نے خط لکھے کرڈالے مگر ان کے مشیروں نے ان خطوں کو راستہ ہی سے اڑا دیا۔

رفتہ رفتہ ان بیچاروں کی حالت زار قابل رحم ہو گئی۔ سامنے کے ہوٹل سے دونوں وقت کھانا آجاتا۔ اور یہ کسی نہ کسی طرح زہر مار کر کے اپنی زندگی کے دن پورے کرتے۔ ایکیٹرنگ برگ کی گرجا سے پادری انکے کھانے کو مکھن اور روٹی بھیجتے۔ مگر وہ راستہ ہی میں فوج والے چٹ کر جاتے۔ کھانا گرم کرنے کو ایک پرانا وہرانا تیل کا چولھا ان کو دیا گیا تھا۔ لیکن دونوں تک تیل نہ ملنے کی وجہ سے ان کو جما ہوا سالن اور ٹھنڈا گوشت کھانا پڑتا۔ زار کی یہ حالت تھی کہ گویا ان باتوں کا اس پر کوئی اثر ہی نہیں۔ لوگ اس کا مذاق اڑاتے اور وہ ہنس کر ٹال دیتا۔ وہ باتیں کرنی چاہتا اور اس کے محافظ جواب تک نہ دیتے۔ آخر یہ ہوا کہ اس کا دماغ کچھ خراب ہو گیا۔ چنانچہ اسی وقت کی جو اسکی ایک قلمی تحریر ملی ہے۔ اس سے بھی اس بات کی تصدیق ہوتی ہے۔ وہ لکھتا ہے" یہ سب لوگ خزانہ لوٹ رہے ہیں۔ تمام غیر ملکی ان سب سے آگے ہیں۔ ملک تباہ ہو رہا ہے اور ان لوگوں کو اپنی اپنی پڑی ہے۔ امن و آسائش کا ایکدن ضرور دور دورہ ہوگا۔ خانقاہ میں بند رہنا...... اور پھر موت۔ سچوں کی کوئی قدر نہیں۔ مجرموں کا کوئی انجام نہیں۔ کیا سخت زمانہ ہے۔ ہر شخص جو چاہتا ہے کر گزرتا ہے۔ یہ ہمارے زمانہ کا نقشہ ہے۔ ملک والوں کو باہر والوں نے بگاڑ دیا۔ زار کا تخت متزلزل ہے۔ اور جب یہ گرے گا تو روس کی ساری شوکت و عظمت خاک میں ملجائے گی۔ سامنے کی کھڑکی پر تصویریں نہیں ہیں۔ برف کے ٹکڑے جمع ہوئے ہیں"۔ زار کی تو یہ حالت تھی اور زارینہ کی یہ کیفیت کہ ہر بات پر بگڑتی۔ ہر ایک پر خفا ہوتی۔ کبھی روتی۔ کبھی ہنستی۔ کبھی ناچتی اور کبھی گھنٹوں عبادت میں مشغول رہتی۔ زار وچ کی حالت پھر بگڑی۔ مگر باپ کی موجودگی اس کی تسکین کا باعث تھی۔ زار بھی اسے گھنٹوں گود میں لئے بیٹھا رہتا۔ کبھی اُس کمرے سے اس کمرے میں لاتا۔ اور کبھی اس کمرے سے اس کمرے میں لیجاتا۔ زار[1] کی لڑکیوں پر یہ قید

[1] زار کی چار لڑکیاں تھیں۔ سب سے بڑی اولگا (۲۲ سالہ) اس سے چھوٹی تیتانا (۲۰) سالہ۔ اس سے چھوٹی میری (۱۸) سالہ اور سب سے چھوٹی اینستاسیا (۱۶) سالہ۔ زار وچ یعنی ولیعہد سلطنت کی عمر اس زمانہ میں ۱۳ سال کی تھی۔

بہت گراں تھی۔ وہ محافظوں سے باتیں کرنا چاہتیں۔ مگر یہ گنوار ایسے بے تکے جواب دیتے کہ وہ شرمندہ ہوکر رہ جاتیں ان لڑکیوں کے اس طرح آنے اور باتیں کرنے سے ایک خرابی یہ پیدا ہوئی کہ لوگوں میں انکی بے عصمتی کے قصے پھیل گئے۔ پہلے آدمی تو ان باتوں پر کیوں یقین کرتے۔ ہاں جن لوگوں کو زار اور اس کے خاندان سے نفرت تھی۔ اُنھوں نے بات کا تبنگڑ بناکر ان قصوں کو دنیا میں خوب پھیلایا۔ یہ خبریں سُن کر اکیٹرنگ برگ کی کونسل والوں کو ڈر ہوا کہ اس طریقہ سے کہیں ان لڑکیوں نے زار کو بھگا دینے کا جال تو نہیں پھیلایا۔ چنانچہ اسی خیال سے انھوں نے آبڈیو کو بدلکر اسکی جگہ جیکیب یروسکی کو مقرر کیا۔ اس نے آکر نگرانی میں پہلے سے زیادہ سختی شروع کی۔ اب خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ جیکیب کی رپورٹیں تھیں یا کوئی اور وجہ کہ کونسل میں زار کے قتل کرنے کا مسئلہ پیش ہوگیا۔ بہت سے ممبر تو اس پر زور دیتے تھے کہ اسکو مار کر قصہ ہی تمام کیا جائے۔ اور بہت سے ایسے تھے کہ وہ ذرا اطمینان ہونے کے لیے اس کارروائی میں ہاتھ ڈالنا چاہتے تھے۔ پہلا گروہ کہتا تھا کہ "زار نے ہزاروں بیگناہوں کے خون سے ہاتھ رنگے ہیں۔ اور جب کبھی ہم اس سے مدد مانگنے گئے اس نے ہمیشہ ہماری بات کا جواب گولیوں سے دیا۔ وہ اس کا زمانہ تھا۔ اب ہمارا زمانہ ہے۔ پھر کیوں ہم بھی وہی راستہ اختیار نہ کریں" دوسرا گروہ کہتا تھا کہ جلدی ہی کیا ہے۔ زار ہمارے قبضہ میں ہے۔ ہم جب چاہیں اس کو ٹھکانے لگا سکتے ہیں۔ ابھی سلطنت کی چولیں پوری طرح نہیں بیٹھی ہیں۔ ممکن ہے کہ اس کے مارنے سے سارا یورپ ہم پر پل پڑے۔ پہلے اپنے گھر کا انتظام کر لو۔ اس کے بعد زار کا ختم کر دینا کیا بڑا کام ہے۔ جب یہاں کوئی فیصلہ نہ ہوسکا تو اس معاملہ کو ماسکو کی سنٹرل کمیٹی میں پیش کیا گیا۔ کمیٹی کے پریسیڈنٹ سورڈلو کی یہ رائے تھی کہ زار کو مار ہی ڈالنا اچھا ہے۔ لینن اور ٹراسکی کا یہ کہنا تھا کہ اس کو عدالت میں پیش کرکے فیصلہ کرایا جائے۔ لینن سمجھتا تھا کہ زار سلطنت کی ایک بڑی یرغمال ہے۔ اور ٹراسکی جانتا تھا کہ اگر زار کو ملزم کی حیثیت سے عدالت میں پیش کرکے اس کی زیادتیوں کو ثابت کردیا گیا تو دنیا اس کے قتل کو بھی جرم نہ سمجھے گی۔ کمیٹی کے اکثر ممبر ایسے تھے کہ وہ گورنمنٹ کے معمولی معاملات کو بھی زار کی قسمت کے فیصلہ سے زیادہ اہم سمجھتے تھے۔ ان سب متضاد آرا کا یہ نتیجہ ہوا کہ کمیٹی کسی نتیجہ پر نہ پہنچ سکی۔

جب اکیٹرنگ برگ والوں نے دیکھا کہ ماسکو سے کوئی موافق یا مخالف حکم ہی نہیں آتا۔ تو انھوں نے معاملہ کو پھر خود اپنے ہاتھ میں لیا۔ ماسکو کی خاموشی کی وجہ سے ان لوگوں نے جو اس قتل کے مخالف تھے اپنی رائے بدل دی۔ اور آخر کونسل نے یہ تصفیہ کردیا کہ "نکولاس دوم سابق زار روس کو معہ اُسکے تمام خاندان کے قتل کردیا جائے" یہ کام کونسل کے پریسیڈنٹ کے سپرد ہوا اور اس نے اس قتل کی تیاریاں کرنے کے لئے پیٹر زہاروچ کو مقرر کیا۔ اس نے بہ خوشی اس خدمت کو قبول کیا۔ تین پیپوں میں گندھک کا تیزاب۔ اور مٹی کے تیل کے بہت سے ٹین مقتل میں لائے گئے۔ تاکہ نعشوں کو جلاکر ساری راکھ کو گندھک کے

تیزاب میں حل کر دیا جائے۔

جون کی آخری تاریخوں میں زار کو قتل کرنے کا تصفیہ ہوا۔ اور شروع جولائی میں قتل کی ساری تیاریاں ہو گئیں۔ جلدی کرنے کا یہ باعث ہوا کہ ایک طرف تو روسی فوج کے کاسکوں نے بغاوت برپا کر دی تھی اور دوسری طرف زیکوسلاویکیا کی فوجیں اس طرف بڑھ رہی تھیں۔ جو لڑکا زار کے بیٹے کے ساتھ کھیلنے آیا کرتا تھا۔ اس کا ۱۵ر جولائی سے وہاں آنا موقوف ہوا۔ ۱۶ر جولائی کو آدھی رات کے وقت بروسکی ان شاہی قیدیوں کے پاس آیا۔ اور کہا کہ تمہیں دوسری جگہ منتقل کیا جا رہا ہے۔ فوراً تیار ہو جاؤ۔ اور اپنے نوکروں کو بھی تیاری کے لئے کہدو۔ ایک گھنٹہ کے بعد یہ لوگ نیچے کی منزل میں آئے۔ آگے آگے خود زار تھا۔ اور اسکی گود میں زارزِچ تھا۔ زار کے جسم پر اس وقت ایک پھٹی پرانی فوجی وردی اور پھٹے ہوئے جوتے تھے۔ اور چہرہ پر اداسی برس رہی تھی۔ اس کے پیچھے زارینہ اور اسکی لڑکیاں اور آخر میں ڈاکٹر بوٹکن اور اینا۔ اینا اپنے ہاتھ میں زارینہ کے لئے ایک تکیہ اور پہننے کے کچھ کپڑے لئے ہوئے تھی۔ باہر ایک پرانی موٹر کار کھڑی تھی۔ اور اس کا انجن برابر چل رہا تھا۔ یہ اسلئے تھا کہ مقتولوں کی چیخیں اور بندوقوں کی آوازیں باہر نہ جانے پائیں۔ نیچے کی منزل سے ایک زمین دوز راستہ باہر جاتا ہے۔ جب یہ لوگ یہاں پہونچے تو ان کو حکم دیا گیا کہ سب کے سب دیوار سے کمر لگا کر کھڑے ہو جاؤ۔ اُنھوں نے اس حکم کی تعمیل کی۔ زار نے زاروِچ کو ایک ٹوٹی سی کرسی پر بٹھا دیا۔ اور آپ زارینہ کے برابر جا کھڑا ہوا۔ اتنی دیر میں بروسکی اور اس کے چار ساتھی ہاتھوں میں ریوالور لئے اندر آئے۔ ان کے پیچھے پیچھے مسلح سپاہیوں کا ایک دستہ تھا۔ بروسکی نے ان لوگوں کے سامنے اپنے سپاہیوں کا پرا جمایا۔ خود آگے بڑھا۔ اور کہا "اے زار کے خاندان والوں اور ساتھیوں ہماری کونسل نے فیصلہ کیا ہے کہ تم سب کا خاتمہ کر دیا جائے۔ اب تمہارے بچنے کی کوئی امید نہیں ہے۔ اس لئے مرنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔" زارینہ اور اُسکی لڑکیوں نے یہ سُن کر دعا مانگنے کے لئے گھٹنے ٹیک دئیے۔ زار نے صرف اتنا کہا کہ "ہم تو کہیں اور جا رہے تھے"۔ ابھی یہ الفاظ اس کے منھ سے پورے نکلے بھی نہ تھے کہ چار ریوالور ایک دم چلے اور وہ وہیں گر کر ٹھنڈا ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی بندوقوں کی باڑھ پڑی اور سوائے اینا کے زار کا سارا خاندان اور اسکے ساتھی گر کر ختم ہو گئے۔ اینا یہ رنگ دیکھکر ایک طرف کو ہٹ گئی اور بچاؤ کے لئے اسنے اپنے سامنے تکیہ کر لیا۔ بھلا گولیوں کی مار سے تکیہ اس کو کیا بچا سکتا تھا۔ ایک گولی اور چلی۔ یہ گری اور ابھی پوری طرح اس کا دم بھی نہیں نکلا تھا کہ سپاہیوں نے بندوقوں کے کندے مار مار اس کا بھیجا نکال دیا۔ زارینہ کی چھوٹی لڑکی انسٹاسیا نے گر کر دم سادھ لیا تھا۔ مگر سپاہیوں نے ٹھوکریں مار کر اس کا بھی خاتمہ کر دیا۔ ابھی یہ سب پڑے سسک رہے تھے کہ سپاہیوں نے ٹھوکریں مار کر ان کے لباس پھاڑ ڈالے کیونکہ ان کو خیال تھا کہ یہ سب لوگ جواہرات

چھپائے ہوئے ہیں۔ مگر کہا جاتا ہے کہ ڈھونڈھنے پر خاک بھی کسی کے ہاتھ کچھ نہ آیا۔
یہ کام ختم کرکے اُنھوں نے لاشوں کو گھسیٹ کر باہر نکالا۔ اور جو موٹر باہر کھڑی تھی اس میں اوپر تلے بھر کر جنگل کی طرف روانہ کردیا۔ یہاں پہلے سے پہرے لگا دئے گئے تھے کہ تماشائی جمع نہ ہوجائیں تمام نعشوں کو ایک جگہ ڈال۔ اوپر سے مٹی کا تیل چھڑک آگ لگا دی گئی۔ جلنے سے جو کچھ بچ رہ گیا اس کو گندھک کے تیزاب میں ڈال کر اس خاندان شاہی کے ذرات فنا کردئے گئے جب اس سے فراغت ہوئی تو بچی بچائی راکھ اور تیزاب ایک گڑھے میں ڈال مٹی برابر کردی۔
لیجئے وہ شخص جس کے نام کا کبھی تمام دنیا میں ڈنکہ بجتا تھا۔ جسکی ایک "ہوں" پر ہزاروں سر کٹوانے کو تیار ہوجاتے تھے اور جسکی آنکھ کا ایک اشارہ غریب کو امیر اور امیر کو فقیر بنا دیتا تھا۔ وہ اس طرح دنیا سے گیا کہ نہ اسکا کوئی رونیوالا ہے اور نہ اسکی قبر کا کوئی نام ونشان۔ یہانتک کہ نہ اب اسکی کوئی زندہ یادگار ہے اور نہ کوئی نام لیوا۔
چندہی روز کے بعد زار کو سلاریکا کی فوج ایکٹرانگ برگ کی سرحد میں داخل ہوگئی۔ یہاں والوں نے مقابلہ کیا۔ مگر بری طرح شکست اُٹھائی۔ فوج والوں نے اس خاندان کے لوگوں کی تلاش کی۔ مگر وہاں سوائے خون کی دھبوں اور گولیوں کے نشانوں کے اور کیا رکھا تھا کسی نے سچ کہا ہے ہمیشہ رہے نام اللہ کا۔

مرزا فرحت اللہ بیگ

فراست الید

مولفۂ نیاز فتحپوری جس کے مطالعہ سے ایک شخص بآسانی ہاتھ کی شناخت اور اسکی لکیروں کو دیکھکر اپنے یا دوسرے شخص کی مستقبل سیرت، عروج وزوال، موت وحیات صحت وبیماری، شہرت ونیکنامی وغیرہ کی متعلق صحیح طور سے پیشنگوئی کرسکتا ہے۔ قیمت علاوہ محصول (عہ) منیجر نگار لکھنؤ

صحابیات

جس میں عہد سعادت کی ۵۰ خواتین کے مستند حالات یکجا کردئے گئے ہیں۔ اس کا مقدمہ مولانا نیاز نے خاص اپنی انشاء میں اس قدر جوش وقوت کے ساتھ لکھا ہے کہ مسئلہ نسائیات کے بہت سے نکات اس سے حل ہوجاتے ہیں۔ قیمت علاوہ محصول (عہ)
منیجر "نگار" لکھنؤ

سید سلیمان ندوی سے

آشفتہ گشت طرۂ دستار مولوی؟

علامہ سید سلیمان ندوی میرے نادیدہ مگر دیرینہ مکرم ہیں۔ دیرینہ میں اسلئے کہتا ہوں کہ میں انکو اسوقت سے جانتا ہوں کہ جب میں پہلی بار ان کے تصانیف سے ذوق آشنا ہوا۔ اور یہ واقعہ میرے زمانۂ طالب علمی کا ہے جسکو تقریبًا سات آٹھ برس ہو گئے۔ لہذا سب سے پہلے میں اپنے اور نگار کی طرف سے اس احسان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ جو علامہ موصوف نے بے منت و بے طلب حقیقتًا جولائی و اگست ۱۹۳۰ء کے نگار کے ذریعہ سے ایک کو اپنا گرانمایہ مقالات کا حامل اور دوسرے کو اپنے ارشادات دربار کی مخاطبت سے سرفراز کرکے ارزانی فرمایا۔

مولانا کے اس برق صاعقہ کو میں نے "دفعتًا" صرف قارئین نگار کی نظر سے کہا ہے۔ ورنہ جہاں تک خاکسار کا تعلق ہے میں عرصہ سے دھڑکتے ہوئے دل سے اسکے لئے تیار بلکہ منتظر بیٹھا تھا کیونکہ سروش "اعظم" نے میرے کان میں اس کیفیت کا اظہار پہلے ہی کر دیا تھا جسکے زیر اثر مولانا کا قلم چل رہا تھا۔ راوی کا بیان ہے کہ قلم میں وہ حدت پیدا ہو گئی تھی کہ جواب کئی بار لکھا گیا۔ اور پھاڑا گیا۔ آخر کار قلم کے مزاج میں برودت اور قلم پکڑنے والے کے قلب میں رافت کی کیفیت پیدا ہوئی۔ اور مضمون جو نگار میں بھیجا گیا وہ اپنی اصلی تپش سے ستر ہزار درجہ کم تھا۔ اس پر بھی کہیں کہیں اسکی آنچ ظاہر ہو گئی۔ آپ نے غور کیا کہ یہ کیوں؟ کیا وہ کسی غیر معمولی مذہبی جوش وللہیت کا نتیجہ تھی نہیں۔ بلکہ صرف اس حقیقت کا کہ میرے مضمون کے بعض کانٹے علامہ کے ذاتی قبائے علم کے دامن میں الجھ گئے تھے۔ اور اسکی خلش سے وہ چیں بہ جبیں۔ بلکہ مضطرو بے قرار تھے۔

بہر حال سردست مجھے مولانا کا قرض حسنہ ادا کرنا ہے۔ رہ گیا اصل مدعا اور بحث۔ سو نہ مولانا نے اسکی طرف توجہ کی اور نہ مجھے اس پر مزید روشنی ڈالنے کی ضرورت ہے۔ میں اس کو وہیں چھوڑتا ہوں۔

مولانائے موصوف نے تمہید میں لکھا ہے کہ:۔

"رسالۂ نگار میں ایک سال سے فلسفہ مذہب کے عنوان سے ڈپٹی سید مقبول احمد صاحب کے متعدد مضامین شائع ہوئے۔

جس میں خودساختہ اصول اور ذاتی اجتہادات کے ساتھ مفسرین۔ محدثین۔ فقہا۔ علمائے امت اور عام مولویوں پر اس بیباکی سے الزام قائم کئے گئے اور انکی تحقیر و توہین کی گئی کہ بہتوں کے دل مجروح ہو گئے" وغیرہ

معلوم نہیں کہ یہ تمہید محض مولویانہ ذہنیت کا نتیجہ ہے جس سے کوئی مولوی خالی نہیں ہو سکتا۔ یا وہ اپنے لئے ایک حصار کھینچ رہے ہیں کہ اس کے اندر ان کو محفوظ جگہ ملجائیگی۔ یا وہ ایک حقیقت ہے جسکا علم صرف علامہ کو ہے یا ان کے دائرۃ المعارف کو۔ اگر آخری صورت ہو تو کیا وہ اس کے ثبوت میں میری کتاب سے وہی تین سطر نقل کر کے آپ اس مغالطہ اور مکابرہ کی کسی مجلس علم سے داد لے سکتے ہیں۔ فلسفۂ مذہب کی اشاعت کافی سے زیادہ ہو چکی ہے۔ اور اسکے پڑھنے والے صرف مولانا ہی نہیں۔ بلکہ بہت سے مجروح دل ہوں گے۔ لیکن میں مولانا کو معذور سمجھ کر اس زنانہ حربہ سے اپنے کو بچاتے ہوئے قرآن کو مخاطب کر کے یہ شعر پڑھوں گا۔

بہ جرم عشق توام می کشند و غوغائے ست تو نیز بر سر بام آ کہ خوش تماشائے ست

البتہ فلسفۂ مذہب نے قرآن کے ساتھ وہ سلوک روا نہیں رکھا ہے جو آپ کے رہبر کامل شیخ و استاد مکرم نے اپنی کتاب تاریخ علم کلام میں۔ کہ ملاحدہ کے باطل (اور غالباً خود ساختہ) قرآن پر اعتراضات کو لکھ کر اس کے جواب سے قصداً اگریز کیا۔ اور مسلمانوں کو حیرت و اضطراب کے سمندر میں غوطے مارنے کے لئے چھوڑ دیا۔ ملاحظہ ہو فرماتے ہیں کہ:-

"قرآن مجید پر ان کے جو اعتراضات ہیں۔ امام رازی تفسیر کبیر میں جا بجا ان کے نام سے نقل کرتے ہیں۔ مثلاً قرآن مجید میں حضرت سلیمان وہدہد و بلقیس کا جو واقعہ مذکور ہے اسکی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ ملاحدہ نے اس پر متعدد اعتراض کئے ہیں (۱) ہدہد اور چیونٹی کیونکر عاقلانہ باتیں کر سکتی ہیں (۲) حضرت سلیمان شام میں تھے وہاں سے ہدہد دم بھر میں کیونکر یمن پہونچا اور پھر واپس آگیا (۳) حضرت سلیمان کی نسبت بیان کیا جاتا ہے کہ وہ تمام دنیا کے بلکہ جنات کے بھی بادشاہ تھے۔ باوجود اس کے ان کو بلقیس جیسے حکمران کا نام و نشان تک معلوم نہ تھا (۴) ہدہد کو یہ کیونکر معلوم ہوا کہ آفتاب کو سجدہ کرنا نا جائز ہے اور موجب کفر ہے" (علم کلام صفحہ ۱۱۰،۱۱۱۔ میں نے صرف ایک جگہ سے کچھ حصہ منتقل کر دیا ہے۔)

مگر علامہ مرحوم کے جانشین کو اتنی توفیق نہ ہوئی کہ علامہ کی اس فروگذاشت کو پورا ہی کر دیتے اور اگر رازی کی تاویل نقل نہ کر سکتے تو خود ہی اسکا جواب ہم حامیوں کی راہ ہدایت کے لئے حاشیہ میں دیدیتے۔ آگے چلکر آپ فرماتے ہیں کہ:-

"اگر میرے دلائل کی سخت گرفت سے انکو تکلیف محسوس ہو تو معذوری ہے باایں ہمہ عرض ہے کہ تنہا انگریزی دانی ہی علامہ اور فاضل ہونے کے لئے کافی نہیں ورنہ ہر انگریزی ہوٹل کا خانساماں اور ویٹر یقیناً اتنا ہی فضیلت پر ناز کر سکتا ہے۔ جتنا ہندوستان کا بڑے سے بڑا اگریجویٹ اور ڈپٹی کلکٹر" معلوم نہیں وہ دلائل کون ہیں اور انکی سخت گرفت کہاں ہے۔ ممکن ہے مولانا کے معیار سے یہ جواب معقول اور ترکی بہ ترکی کہلائے۔ لیکن میرے نزدیک یہ جواب اس جاٹ

کے جواب سے زاید نہیں جس سے مولانا موصوف بھی اچھی طرح آگاہ ہونگے۔

کیا اسی سوقیانہ جواب سے مولانا اپنی فضیلت کو منوانا چاہتے ہیں۔ اور آپ نے ایسا غضب کیوں کیا کہ اپنی انگریزی دانی کا اعتراف کر بیٹھے یہ تو میں جانتا ہوں، کہ آپ ریاضی سائنس و فلسفہ کے ادق انگریزی مضامین کو خود سمجھ سکتے ہیں اور دوسروں کو بھی سمجھا سکتے ہیں۔ مگر اس پر آپ نے غور نہ کیا کہ آپ کے اس اعتراف کے بعد کیا آپ مولویت سے معزول نہ کر دئے جائیں گے۔ اور آپ کی وہ اصل حقیقت جو عبارت ہے درس نظامی کی چند بوسیدہ و کرم خوردہ دستاویزات سے مجروح نہ ہو جائے گی۔

مگر اللہ اللہ! ارض القرآن کیا لکھ لیا ہے کہ زمین پر قدم ہی نہیں ٹکتے۔ بیشک میرے سرقہ کا اعتراف خاکساری کی راہ سے نہیں بلکہ واقعتًا کیا گیا ہے۔ مگر کیا میں سوال کر سکتا ہوں کہ وہ مال مسروقہ جناب کی حاصل کردہ ملکیت ہے۔ اگر میں اس کا اس قدر مجرم ہوں کہ آپ نے مجھے اصل ماخذ کی تلاش میں وقت ضائع کرنے سے بچایا تو کیا وہ سرقہ ہے۔ پھر رسول اللہ کا یہ قول جو حالی نے نظم کیا ہے۔ کیا معنی رکھتا ہے۔

کہ حکمت کو اک گم شدہ مال سمجھو　　جہاں پاؤ اپنا اسے مال سمجھو

مگر آپ کو غالبًا اپنی آنکھ کا شہتیر نظر نہیں آتا۔ کلیڈ لسٹڈل مسیحی نے فارسی میں جو کتاب ینابیع القرآن لکھی تھی۔ وہ آپکے ہاتھ لگ گئی اور ترگوم استر میں سے اس اعتراض کو نقل کر دیا جو حضرت سلیمان و ہدہد کے قصے پر کیا گیا ہے۔ اسکا جواب تو کیا آپ دیتے۔ اس کتاب کا حوالہ دئے بغیر آپ نے ارض القرآن میں اسطرح لکھا کہ گویا آپ نے ترگوم استر کو ارامی زبان میں خود ہی پڑھا ہے۔ اور یہ آپکی تحقیق ہے۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ ترگوم استر میں ہدہد و سلیمان کا قصہ قرآن سے لیا گیا ہے اور ترگوم سترھنویں صدی عیسوی کی کتاب ہے۔

مولانا کو میں پھر یاد دلاتا ہوں کہ اگر میری وہ تحریر صداقت سے خالی ہے۔ یعنی معارف میں فلسفہ مذہب کے بعض ٹکڑے اشاعت کے لئے بھیجے گئے تھے اور وہ اس سوال کے بعد واپس کئے گئے تھے، جو میں نے واقدی کے متعلق کیا تھا۔ تو قبل اسکے کہ میں وہ خطوط پبلک میں لاؤں میں لعان کیلئے بھی تیار ہوں اور مباہلہ کیلئے بھی۔

آمدم بر سر مطلب۔

سناۃ اور سنت

میں نہ عبرانی کا عالم ہوں اور نہ غالبًا علامہ۔ لیکن طرفہ تماشا ہے کہ دو آدمی عبرانی سے نابلد عبرانی لفظ کے ماخذ و مصدر پر ایسا گرم مباحثہ کر رہے ہیں گویا دونوں اسکے ماہر ہیں۔ پھر اگر میں کہوں۔ تیں مولانا اب بھی آپ غلطی پر ہیں تو تیسرا کون شخص ہے جو یہ کہہ سکے کہ ہم دونوں میں سے کسکی غلطی ہے۔ مولانا اس کو فراموش کر جاتے ہیں کہ اگر میں نے سنت کو سناۃ سے ماخذ بنایا ہے، تو وہ محض میرا قیاس ہے اور ممکن ہے کہ وہ غلط ہو۔ پھر اس پر یہ معرکہ آرائی کیا معنی۔ مجھے یہ اشتباہ ان وجوہ سے ہوا تھا

(۱) توریت کی کتاب مثنی بالیوٹیکس اور مشنا توریت اگر دونوں ہم معنے ہیں تو دونوں ناموں کے اشتباہ سے جو خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ وہ کسطرح رفع کیجائیں۔

(۲) سنت یقیناً راستے کے معنی میں عربی میں آیا ہے۔ چنانچہ "سنن ابل" اونٹ کی راہ کو اب بھی عرب میں بولتے ہیں۔ عبرانی میں بھی سنا کے معنی اگر راستے کے نہیں ہیں تو مشنا چلنے کے معنی میں ضرور آیا ہے۔ اور مشنا اگر اس سے نکلا ہے تو کیا بعید ہے۔ جبکہ س اور ش کے تلفظ میں عبرانی نہایت لاپرواہ ہیں۔

(۳) سلیمان کے قصے میں ایک لفظ آیا ہے "مسناۃ" عبرانی لفظ ہے۔ جسکے معنی عصا کے ہیں اور یہ مخصوص اصطلاح ہے۔ اور اسکے معنی عصا کے اسلئے ہیں کہ مسنا راستہ ہے اور مسناۃ اسم آلہ یعنی راستہ کے طے کرنیکا آلہ یعنی عصا کیا عجب کہ مشنا اسی لفظ کا بگاڑا ہوا ہو۔

(۴) سنن اسلام اور مشنا یہود دونوں کا مدعا ایک ہی ہے۔ یعنی فریسیت کا قیام اور اس مماثلت کے بعد دونوں کا ہم مخرج ہونا قرین قیاس ہے۔

مولانا نے بڑے شد و مد سے میری ایک غلطی اور پکڑی ہے۔ یعنی ابوالامداد ابراہیم کے حاشیہ و نخبۃ الفکر سے جو عبارت میں نے نقل کی ہے وہ اسطرح ہے:

"ؔ: اصحابہ بنی اسرائیل کے واقعات ماخوذ کرنیوالے ہیں۔ وہ حضرت ابوبکر۔ حضرت عمر۔ حضرت عثمان۔ حضرت علیؓ ہیں اور جو اصحاب ان سے لیا کرتے ہیں وہ عبداللہ بن سلام اور بعض نے کہا عبداللہ بن عمرو بن العاص ہیں۔ کہ جب شام کا ملک فتح ہوا وغیرہ۔"

کاتب نے "ماخوذ کرنیوالے کے بعد "ہیں" کو چھوڑ دیا ہے۔ لیکن اگر مولانا کے علاوہ کوئی اور شخص اس عبارت کو پڑھتا تو وہ یقیناً یہ ہی سمجھتا کہ اس میں "ہیں" چھوٹا ہوا ہے اور یہ محض کتابت کی غلطی ہے۔

اسی طرح مقدمہ ابن خلدون کی جو عبارت کاتب نے مجروح کی ہے وہ خود میری سمجھ میں بھی نہیں آرہی ہے اور یقیناً یہ بے معنی فقرے ہیں۔ لیکن مولانا اس کا جواب مجھ سے طلب نہ کریں۔

یہ عجیب بات ہے کہ ہمارے علامہ حدیث کے متعلق میرے ہم نوا بھی ہوتے ہیں۔ اور پھر مجھے صلواتیں بھی سناتے ہیں۔ فرماتے ہیں:۔

" یہ بھی صحیح ہے کہ حدیث کی کتابوں میں ضعیف روایتیں بھی موجود ہیں۔ مگر یہ بھی کوئی نیا انکشاف نہیں ہے۔"

اور پھر اسی سلسلہ میں فرماتے ہیں:۔ "کہ اسکا یہ نتیجہ تو نہیں ہوسکتا کہ سرے سے تمام کتابوں کو ساقط الاعتبار قرار دید یجئے۔"

/ کیا میں نے یہ کہا ہے میں تو یہ کہہ رہا ہوں۔ کہ غلط اور صحیح حدیثیں اس طرح مل گئی ہیں کہ ایک کو دوسرے سے جدا کرنا نہ ہمارا کام ہے نہ آپ کا۔ میں پوچھتا ہوں کہ کیا آپ اس لذیذ کھانے میں تامل نہ فرمائینگے

جس میں ایک تھوڑی سی مقدار سنکھیا کی ملا دی گئی ہو۔ کیا آپ کسی شخص سے اس بات کی توقع رکھتے ہیں۔ کہ وہ مسموم کھانے کو غیر مسموم بنانے کی طاقت رکھسکتا ہے آپ میں اگر یہ طاقت ہے تو آپ کو مبارک۔ مجھ میں تو یہ طاقت نہیں اور نہ میری طرح عام مسلمانوں میں۔

لیکن آئیے ہم اور آپ مصالحت کا راستہ نکالیں اور وہ صرف یہ ہے :-

"تعالوا الی کلمۃ سواء بیننا وبینکم الا نعبد والا اللہ ولا نشرک بہ شیئاً"

مگر آپ کی اس تحریر کے بعد مولانا روم کا وہ شعر بے اختیار زبان سے نکلتا ہے۔

تو حقیقت را چہ دانی جاہلی
تو گرفتار ابوبکر و علی

سید مقبول احمد

شہاب کی سرگزشت

(دوسرا اڈیشن) حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے۔ اس کی زبان، اسکی تخیل اسکی نزاکت بیان، اسکی بلندی مضمون اور اسکی انشاء عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچتی ہے۔ قیمت علاوہ محصول (عمر)

شاعر کا انجام

(دوسرا اڈیشن) جناب نیاز کے عنفوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ جس میں پاکیزگی بیان، اسلوب ادا، ندرت خیال، اور جدت اظہار کے ایسے ایسے نادر نمونے موجود کہ کسی ادبی تصنیف میں نہیں ملسکتے۔ حسن و عشق کی تمام نشہ بخش کیفیات اسکے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں۔ قیمت علاوہ محصول۔ (۱۰ار)

گہوارۂ تمدن

(دوسرا اڈیشن) مولانا نیاز کی وہ معرکۃ الآرا کتاب جسمیں تاریخ اور اساطیر سے ثابت کیا گیا ہے کہ ارتقاء تمدن میں عورت نے کتنا زبردست حصہ لیا ہے۔ اور دنیا کی تہذیب شائستگی اسکی کسقدر ممنون ہے۔ اردو میں بالکل پہلی کتاب ہے قیمت علاوہ محصول (عہ)

منیجر "نگار" لکھنؤ

ریاض آپ اپنے آئینہ میں

(بسلسلۂ گزشتہ)

میں یہ ظاہر کر چکا ہوں کہ دیوانِ ناظم کی کئی سے جلدیں جو خلد آشیاں نے مجھے مرحمت فرمائیں وہ شمس العلماء اور جناب داغ کی تحریک و تائید کا نتیجہ تھیں۔ ممکن ہے مجھے زیادہ فائدہ پہونچنے کے خیال سے یہ تحریک پیش کی گئی ہو۔ بذہن خود میں یہ سمجھتا تھا کہ شمس العلماء مجھ سے گونہ کشیدہ ہیں۔ داغ صاحب کو بہ اعتبار مراسم تائید کے سوا چارہ نہ تھا۔

شمس العلماء کی کشیدگی کا خیال مجھے اس بنا پر تھا کہ شمس العلماء کے عم بزرگ جناب مولوی مظفر حسین صاحب شوخی جو ترک وطن کرکے اجمیر شریف میں آستانۂ مبارک پر ہمیشہ کے لئے جاگزیں ہو چکے تھے۔ انکی دختر نیک اختر کی نسبت قبلہ حافظ عنایت احمد مرحوم خیرآبادی مشہور وکیل دہلی کے ساتھ انکی زوجہ مرحومہ نے کئی سال ہوئے کردی تھی شمس العلماء نے بحالت لاعلمی اپنے عم بزرگ سے فوری منظوری کی اپنے عقد کے لئے تحریک اُنکی صاحبزادی کے ساتھ کی۔ یہ تحریک منظور ہوکر عقد رہ دماں یہ یا کسی خاص مسئلے کے تحت میں بمقام اجمیر ہو گیا۔

لڑکی ماں کے پاس۔ خیرآباد یا۔ سولی ضلع بارہ بنکی میں مدت مدید سے تھی۔ ماں کو جب عقد صبیہ کا حال معلوم ہوا۔ تو وہ خاندانی مراسم کی بناء پہ فوراً فرنگی محل چلی گئیں۔ وہیں سے حافظ عنایت اللہ مرحوم وکیل دہلی کو طلب کیا اور خیرآباد سے دیگر اعزہ کو۔ یہاں سے مجھے۔ اور حافظ نظام اللہ مرحوم کو منشی نیاز احمد مرحوم نے بھیجا۔ ہم دونوں بھی بمقام فرنگی محل اسی مکان میں ٹھہرے۔ جہاں بزم عروسی برپا تھی۔ دوسرے روز شب کو مراسم عقد عمل میں آئے۔ مولانا عبدالرزاق قدس سرہ العزیز فرنگی محلی نے نکاح پڑھایا۔ مبارک سلامت کے ساتھ وقت گزر گیا۔

شمس العلماء بھی کسی ذریعے سے خبر پاتے ہی لکھنؤ آئے اور سٹی مجسٹریٹ کی عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا۔ ناکح اور گواہ وغیرہ بھی شوہر کے ساتھ مدعا علیہم قرار پائے۔ سمن جاری ہوئے۔ تاریخ مقرر ہوئی۔ ہر طرف یہی شور، یہی چرچا۔ علماء و عمائد لکھنؤ سب آتش زیر پا۔ مولانا عبدالرزاق فرنگی محلی اس پائے کے بزرگ کہ لکھنؤ کے سوا بیرونجات میں بھی شدید اثر تھا۔ وقت یہ تھی کہ شمس العلماء کا درجہ بھی بلاد ہند اور دیگر ممالک میں مسلمہ تھا۔

اس زمانے میں مولوی یعقوب صاحب فرنگی محلی کی ادارت و ملکیت میں لکھنؤ سے ہفتہ وار کارنامہ

شائع ہوتا تھا۔ جس میں اس مقدمہ کے متعلق کچھ مضامین شائع ہوئے جنکی سرخی تھی "ودو ملا میں مرغی حرام" صلح کی تمام کوششیں بے نتیجہ رہیں۔ تاریخ پر عدالت میں ہجوم تھا۔ مدعا علیہم کی جانب سے جماعت وکلا نے ایک محضر پیش کیا۔ جس پر تمام علماء نے حوالجات کتب کے ساتھ عقد کے ناجائز اور غیر صحیح ہونے پر دستخط کئے تھے۔ وکلاء نے زور دیا کہ استغاثہ خارج کیا جائے۔

شمس العلماء نے بجواب عدالت کے روبرو مختصر دلنشین تقریر کی اور عدالت کو یہ سمجھا دیا کہ جن علماء نے محضر میں استغاثے کے خلاف حوالے دئے ہیں۔ میں ان سے دو چار مختصر سوال کرونگا۔ عدالت جوابات کے ساتھ انھیں قلمبند کر کے فیصلہ فرمادے۔ مگر اتفاق کہ صرف محضر پر بہ امید آئندہ تاریخ اکتفا کی گئی تھی۔ کوئی حاضر نہیں ہوا تھا۔ وکلاء نے اسکے خلاف عدالت سے ہر طرح چاہا کہ علماء کو حاضری عدالت کی تکلیف نہ دیجائے مگر عذرات نامسموع ہو کر قطعی تاریخ بہ اجرائے سمن مقرر کردی گئی (عدالت علماء کی بحث کے لطف کو کب ہاتھ سے جانے دیتی تھی)

بلند پایہ علما عدالت میں جانا نہیں چاہتے تھے۔ خصوصًا مولانا عبد الرزاق فرنگی محلی جن کا عدالت میں جانا لکھنؤ کیا ہندوستان گوارا نہیں کر سکتا تھا۔ اس تاریخ کی شہرت تمام لکھنؤ میں بلکہ دور دور اضلاع غیر وبیرون نجات میں ہو گئی تھی۔ ہر شخص تاریخ پر عدالت میں وہ سماں دیکھنا چاہتا تھا جو پورب کے گنوار پچاس برس پہلے ہائی کورٹ الہ آباد کی شاندار عمارت وکلا و بیرسٹروں وغیرہ کے کرّو فر سے مرعوب و متاثر ہو کر دیہات کے گنواروں میں داد خوش بیانی دیا کرتے تھے۔ مثلاً شاندار بلبوس کے ذکر میں "اُدھر سے آئے ہار ڈبلو سر پر باندھو کنات" (قنات کنایہ از دستار) ڈبلو (وکیل) پھر عدالت کے روبرو انکی گرج اور کڑک۔ جو اشتیاق آلھا گانیوالوں کو نصیب نہیں مثلاً اسکا یہ آخری فقرہ۔

پھاٹے لاگ جڑی جوڑے لاگ انگار ٹپ۔ ٹپ۔ ٹپ
(بجلی) (ٹپکنے لگے)

الفاظ کا گھٹاؤ و بڑھاؤ اور موقع سے ٹھراؤ جس موثر انداز میں عظمت و جلال اور شان و شوکت پیدا کرتا تھا۔ اس کا بیان دشوار ہے۔

اس مقدمے کی وجہ سے سٹی مجسٹریٹ کی عدالت کو ہائی کورٹ اور چیف کورٹ کا درجہ حاصل ہونیوالا تھا اور کیوں نہ ہوتا۔ ایک طرف نہ صرف علمائے فرنگی محل بلکہ تمام علمائے لکھنؤ۔ پھر دہلی و لکھنؤ کے وکلاء کی ایک اثر انداز جماعت انکے علاوہ۔ دوسری طرف شمس العلماء علامۂ خیر آبادی جو ادر علوم کے علاوہ منطق میں خود اپنی نظیر ہو سکتے تھے۔ ذہانت۔ ذکاوت۔ حافظہ۔ ہر بات خداداد۔ خوش بیانی کا وہ عالم کہ سننے والا محو وسحر۔ ان کی تائید میں اور جو حضرات ہوں مجھے علم نہیں۔ معاملہ بھی نازک۔ مسئلہ بھی نازک سہ

وہ بھی نازک اور نازک وقت بھی کیا ہو صبحِ وصل دیکھا چاہیئے

شمس العلماء کو کچھ بھی علم ہوتا کہ مولوی حافظ عنایت اللہ وکیل سے لڑکی کئی سال سے منسوب ہے۔ تو باوصف اسکے کہ شمس العلماء کی اہلیہ کا انتقال ہو جانے سے عقد کی ضرورت تھی۔ مگر وہ کبھی ادھر ملتفت نہ ہوتے اسی طرح اہلیہ مولوی مظفر حسین شوختی کو اس کا علم ہوتا کہ شمس العلماء کا عقد صحیح و جائز طور پہ ہو چکا ہے تو وہ دختر نیک اختر کے عقد میں عجلت سے کام نہ لیتیں۔ اب فریقین کے لئے سنگ آمد و سخت آمد کا معاملہ تھا۔ سٹی مجسٹریٹ کی عدالت تاریخ پر۔ تھیٹر اور سینما کی اسٹیج بننے والی تھی۔

ہم کسی داستان گو کی طرح بقیہ داستان بہ فردائے شب کہنا نہیں چاہتے۔ اسٹیج کا نام آجانے سے کچھ دیر کے لئے پردہ کا گر جانا کافی ہے۔ بیرون پردہ قصہ سیکھی فرصت میں مشغلہ شعر و سخن سے زیادہ دلچسپ کون شے ہو سکتی ہے۔ تفریحی فرصت کے مکالمے اکثر کچھ نہ کچھ تعلق پردہ ہی سے رکھتے ہیں۔ اس اعتبار سے کسیقدر مناسبت کا پیدا ہو جانا خالی از لطف نہ ہوگا۔

بزم عروسی رچنے سے جو نیم رقیبانہ ہنگامہ کارزار گرم ہونے پر صف آرائیاں ہوئیں۔ ان کے فوٹو کے لئے یہ شعر بہت کم سرمایہ دار ہے ؎

آئینے کا تو رُخ صاف طرفدار ہوا، زلف نے باندھ لی شانہ کی حمایت پہ کمر

مزاجِ حسن میں آئینہ و شانہ سے زیادہ درخور کسے ہو سکتا ہے۔ یہ اتفاق ہے کہ دونوں میں فرضی رقابت کی صورت پیدا ہو گئی ہے۔

اب میں اسی زمین میں متعلق و غیر متعلق چند شعر سنانا چاہتا ہوں گھبرائیگا نہیں۔ یہ شعر بجائے خود آپ صنائع و بدائع کے ساتھ جس بیساختگی اور جدت سے ادا ہوئے ہیں۔ آپکے لئے کچھ کم نہیں ہیں ؎

ریاضؔ:- ہماری آنکھو نہیں آؤ تو ہم دکھائیں تمہیں ادا تمہاری جو تم بھی کہو کہ ہاں کچھ ہے

مژدہ اے اہل تماشا کہ ہے ہنگام نظر بزم عشرت میں ہوئے جمع حسیں رشک قمر

صرف آرائش زینت ہیں حسینانِ جہاں بدلے جاتے ہیں لباس اور مرصع زیور

بدھیاں پھولوں کی ہیں زیب فزائے بر و دوش دست و پا میں ہے حنا۔ سرمہ ہے منظور نظر

شانہ و آئینہ ہیں لیکہ مصاحب دونوں ایک سے ایک نے باندھی ہے رقابت پہ کمر

آئینہ۔ شانے سے کہتا ہے کہ سر چڑھ نہ بہت منہ کی کھائے نہ کہیں چاک ترا ہو جگر

دیکھ مجھکو کہ جگہ گو کہ ہے زانو پہ مری حیرت حسن سے چہرے کیطرح ہوں ششدر

مرتبہ جو ہے مرا تجھکو وہ حاصل ہے کہاں
کون سی بزم میں ہوتی نہیں حاجت میری

آبداری کا مرے سامنے دعوے جو کرے
یمن ہے اہلِ جہاں کو مرا نظارۂ رُخ

صافیٔ قلب سے پایا ہے جو رتبہ میں نے
آبِ شان تجھکو نہیں ہے کسی مہمان سی عزیز

نہیں رکھتا ہوں لگی حال بد و نیک میں کچھ
مجھ سے بھی عقدۂ نیرنگِ جہاں کھلتا ہے

بزمِ عالم میں فقط وجہ سے میرے ابتک
مجلسِ خاص بنی میں بھی رسائی میری

وہ صفائی مجھے حاصل ہے کہ ہر دل ہوں عزیز
ہاتھ سے دامنِ دولت نہ کسی دم چھوٹا

اہلِ تنجیم کی آنکھوں میں بھی ہے قدر مری
بولتا ہے مری تائید سے طوطی اُس کا

خاکساری ہے اِن اوصاف مجھ میں ایسی
ایک تو ہے کہ نہیں تجھ میں ذرا نام کو نور

پارۂ چوب جگر چاک دنی بے قیمت
بال بیکا ہو حسینوں کا تو توڑیں ترے دانت

قاعدہ بزمِ ادب کا تجھے بھولے جو کبھی
بخدا اس شل سے نکلتا نہیں ہرگز کوئی کام

بال یوں منھ میں ترے ٹوٹ کے رہجاتا ہے
کرکری تیزیٔ دنداں سے ہوئی اور تیری

کشمکش نے تری کانٹوں میں گھسیٹا ہے تجھے
سو زبانیں ہیں ترے منھ میں تو ساکت کیا ہے

اس لیاقت پہ یہ دعوے مجھے لیاں ہو تو

صاف طینت ہوں صفائی کا ہی مجھ میں جوہر
خانہ بردوش ہوں پر دلمیں امیروں کے ہے گھر

روبروِ صاحبِ انصاف کے جھوٹا ہو گہر
دیکھتے ہیں مجھے جب دیکھتے ہیں ماہ صفر

چاندی سونے کا دیا ہے مجھے اللہ نے گھر
دشمن و دوست کے منھ پر ہے کشادہ مرا در

صاف کہہ دیتا ہوں آتا ہے جو کچھ پیشِ نظر
جم کو دیتا تھا اگر جام زمانے کی خبر

نام روشن ہے چراغِ لحدِ اسکندر
ابتدا سے مرے طالع کا ہے روشن اختر

جتنے اصحاب تھے رکھتے تھے مجھے پیشِ نظر
اہلِ دولت ہی کے زانو پہ ہوئی عمر بسر

ہوں کبھی مشتری و زہرہ کبھی شمس و قمر
ورنہ طوطی میں کہاں ہے کوئی سرخاب کا پر

غازۂ چہرہ نہیں اور بجز خاکستر
زحل آسا ترے طالع کا سیہ ہے اختر

چار پیسے کو جسے مول نہ لیں اہلِ ہنر
دانت دینے لگیں ایذا تو شکستہ بہتر

پیش جائے نہ تری ایک کریں زیر و زبر
خشک ہو شاخ تو اس سے نہیں امید ثمر

جسطرح شانۂ ضحاک میں تھا سانپ کا گھر
جسمیں دندانے پڑیں تیغ وہ ہو بے جوہر

بیاد و منیں ہیں ترے غار ادھر اور ادھر
گنگ کی طرح سے خاموش ہو تو آٹھ پہر

کہ چڑھی اللہ خان سمن اندام ستم

کچھ بھی غیرت ہو تو پانی میں کمینے ڈوب مرے | ایسی ذلت سے تو ہے خاک میں ملنا بہتر

صاف صاف آئینے نے بڑھ کے کیا جب یہ کلام | غیر کے عیب سب اظہار کیے اپنے ہنر

کھسپ گیا شانہ ملامت کا نشانہ بن کر | موئے تن راست ہوئے تیر کی صورت یکسر

ہمہ تن ہو کے زباں کہنے لگا یوں سردست | منھ بنا چاہیے عاقل کو تعلی سے حذر

رتبہ میرا تجھے معلوم نہیں سن مجھ سے | منحصر ہے صفتِ عقدہ کشائی مجھ پر

ہے حسینوں میں رسائی تری گاہے گاہے | کوچۂ زلف میں ہے میری جگہ آٹھ پہر

رات دن خندۂ شادی سے عیاں ہیں مرے دانت | اپنی تقدیر کو روتا ہے تری آنکھ ہے تر

میری ہی شکل سے مقبولِ دلِ عالم ہے، | پنجۂ مرجان کا ہو یا پنجۂ خورشید سحر

کہتے ہیں پنجۂ مژگاں کو جو شانہ شاعر | اسکو آنکھوں پہ جگہ دیتے ہیں اربابِ نظر

ہے جو لبریز عسل شانۂ زنبورِ عسل | اس عداوت کا سبب نام کا میرے ہے اثر

کی ہے تشدید نے پیدا جو شباہت میری | لفظ اللہ میں شامل ہے وہ کر خوب نظر

شانۂ عاج کبھی شانۂ شمشاد کبھی | شانے میں دیکھتے ہیں فال تو پاتے ہیں ظفر

صاحبِ ریش نہ جبتک کہ کرے شانہ کشی | ہو نہ حاصل شرفِ پیروی پیغمبر

اُس میں بھی لفظ ہے شانے کا زہے عز و شرف | جل شانہ ہے جو توصیفِ خدائے اکبر

تو نہ مانے تو نہ مانے مجھے پروا کیا ہے | عیب بیں جو ہے اُسے کب نظر آتا ہے ہُنر

سوچ تو دلمیں ذرا عیب ہیں تجھ میں کتنے | سادہ و شوخ و دریدہ دہن و بد گوہر

سوجھتا خاک نہیں کوردلی سے تجھ کو | سخت جاں تیرہ دروں اصل ہے تیری پتھر

روبرو اور ترا حال ہے غیبت میں کچھ اور | صاف عالم کی دورنگی کا ہے تجھ میں بھی اثر

چشمۂ آب تو ظاہر میں ہے باطن میں سراب | دہوکے پیاسوں کو دیا کرتا ہے تو شام و سحر

خود نمائی کے سوا تجھ میں نہیں کوئی صفت | سادہ لوحی کے سوا تجھ میں نہیں کوئی ہُنر

صاف بیں ہے سن الا اس کہ شب کور ہی تو | شب تیرہ میں تجھے کچھ نہیں آتا ہے نظر

نہ جچے پر نہ جچے شکل جو ہو ذہن نشیں | نہ مٹے پر نہ مٹے بال پڑے دلمیں اگر

قصہ کوتاہ زیادہ ہوئی دونوں میں جو بحث | تھیں جو ان دونوں کی حامی انھیں پہونچی یہ خبر

آئینے کا تو رُخ صاف طرفدار ہوا! | زلف نے باندھ لی شانے کی حمایت پہ کمر

لشکرِ روز تو زیرِ علمِ خسروِ رُخ | فوجِ شب بادشہ گیسوئے پرچیں کی سپر

اک طرف ماہ ہوا ایک طرف پرتو مہر اک طرف شام ہوئی ایکطرف نور سحر
سپہ سنبل و شبو طرف زلف سیاہ لشکر لالہ و گل جانب روئے انور
پیر گردوں نے کہا طرفہ قیامت آئی اب کوئی آن میں ہوتا ہے جہاں زیر و زبر
بیچ میں پڑ کے کہا۔ خوب نہیں ہے یہ فساد صلح اس جنگ سے ہر ایک طرح ہے بہتر
حق میں دونوں کے یہ اولیٰ ہو کہ پاس سکے چلو صاحب حکم جو ہے مہر عدالت گستر

کون وہ کلب علیخان بہادر نامی
منبع جود و سخا زیب دہ علم و ہنر

پردہ اٹھا۔

علمائے فرنگی و عمائد شہر کی طرف سے چند با اثر مقتدر اکابر خاص شفقت اور متعدد گرامی نامے لیکر رامپور پہونچے اور نواب کلب علی خاں بہادر مرحوم کے حضور میں باریاب ہوئے۔ باوصف اس کے کہ خلد آشیاں اپنے استاد کے مرتبے اور نازک مزاجی کا بہت ہی لحاظ رکھتے تھے۔ مگر وعدہ فرما کر سب کو مطمئن کر دیا۔ اور شمس العلماء علامہ خیر آبادی کو بہ عجلت تمام خاص طریقے سے طلب فرما کر اپنی آرزو برآری کا وعدہ لیا پھر ارشاد فرمایا کہ رفیق زندگی جن شرائط کے ساتھ مطلوب ہو اس کا انتظام و اہتمام ریاست کے ذمہ ہے۔ تمام کارروائی صیغہ راز میں رہی۔ اور تاریخ پر صلحنامہ یا استغاثے سے دست برداری عدالت میں داخل ہو گئی۔

حوریاں رقص کناں ساغر مستانہ زدند

یہ اسباب تھے جنکی بناء پر میں شمس العلماء کی نسبت غلط فہمی میں مبتلا ہوا مجھے تسلیم ہے کہ شمس العلماء کی تحریک اور جناب داغ کی تائید نیک نیتی سے تھی۔ مگر مجھے بہ اعتبار تعداد زر نقصان پہونچا اور گو خلد آشیاں نے اپنے دست مبارک سے خلعت دوشالہ میرے زیب دوش فرما کر مجھے گراں دوش کیا اور زر نقد بھی شاندار طریقے سے بھیجا۔ مگر میں "برو کتا بے چند" کا ہر طرح مصداق رہا۔

کارنامہ لکھنؤ نے جس عنوان کے تحت میں مضامین شائع کئے یہ تو ہو سکتا ہے کہ اڈیٹر ریاض الاخبار و گلکدہ ریاض کا اُن سے لگاؤ نہ ہو۔ صرف بزم عقد لکھنؤ میں میری شرکت کم و بیش آزردگی کے لئے کافی سمجھی جا سکتی تھی۔ بہرحال آنچہ گذشت گذشت۔ یہ صحیح ہے کہ شمس العلماء اور جناب داغ کے تعلقات تاحیات مجھ سے کمال شگفتہ رہے اور دونوں مقتدر ہستیاں مجھے ہمیشہ اک شاگرد عزیز کا ہم مرتبہ سمجھتی رہیں۔ بلکہ ایک مرتبہ جب شمس العلماء حیدرآباد دکن سے وظیفہ یاب ہو کر خیرآباد واپس آئے تھے تو میری زبان سے برسبیل تذکرہ ایک واقعہ سُن کر دیر تک کف افسوس ملتے رہے اور بار بار یہ فرماتے تھے کہ داغ صاحب سے یہ غلطی کیونکر سرزد ہوئی۔

واقعہ یہ تھا کہ گلچیں جب لکھنؤ سے گورکھپور منتقل ہوا۔ اس کا تعلق مجھ سے اور ریاض الاخبار پریس سے ہوگیا۔ میں نے یہ التزام کیا کہ مصرع طرح ہر مرتبہ کسی استاد سے یا ایسے ممتاز شعراء سے لیا جائے جو وقیع ہوں اس التزام سے کئی نمبر گلچیں کے بہت کامیاب نکل چکے تھے۔ اسی سلسلے میں استاد مرحوم کو تکلیف دی گئی اور جناب امیر مینائی نے یہ مصرع لطف فرمایا۔

کنی ہیرے کی نیلم میں جڑی ہے

جب یہ مصرع شائع کیا گیا تو گلچیں میں مصرع طرح پر مصرع بہم پہنچانے کی بھی فرمائش کی گئی۔ ابھی اس طرح میں ناتمام دو تین نمبر نکلے تھے کہ اعلیٰ حضرت میر محبوب علیخاں مرحوم خسرو دکن بالقابہ کو توجہ اس طرف ہوئی۔ اعلیٰ حضرت کی غزل کا یہ مصرع اس قدر مقبول و شہرت پذیر ہوا کہ تمام ہندوستان پر چھا گیا۔ اور گویا وہی مصرع طرح قرار پا گیا۔

یہ چوٹی کس لئے پیچھے پڑی ہے

متعدد شعرائے نامی نے اس پر مصرع لگائے۔ شاید ہی کوئی ایسا شاعر ہو جس نے اس زمین میں پوری قوت سے فکر نہ کی ہو گلچیں کے نمبر ایک سال تک اسی طرح میں نکلتے رہے۔

جب خسرو دکن نے غزل کہی اور اس مصرع نے ہر طرف دور دور شہرت حاصل کی۔ تو دکن سے ابراہیم صاحب خانساماں کا خط انکے ایک پیش دست کا لکھا ہوا میرے نام آیا جس میں تحریر تھا میں تمہارے لئے کوئی موقعہ ہاتھ سے جانے نہ دوں گا تم یہاں آنیکے لئے تیار رہو۔ بہت جلد اعلیٰ حضرت تمہیں یاد فرمائیں گے اور تین مصرع طرح گلچیں کے لئے اعلیٰ حضرت نے مرحمت فرمائے ہیں۔ انکو نمبروار شائع کرتے رہنا۔

مجھے سطحی تحریر اور تم تم کی تکرار خط میں گراں گذری۔ میں ابراہیم صاحب خانساماں سے واقف نہ تھا نہ انکے پیش دست سے۔ میں نے جناب داغ کو نیازنامہ بھیجا اور اسی کے ساتھ ابراہیم صاحب کے خط کی نقل بھیجکر اعلیٰ حضرت کے عطیہ طرحی مصرعوں کی اشاعت کے لئے ممدوح کی رائے دریافت کی۔

ممدوح نے تحریر فرمایا۔ جواباً لکھہ دیجئے۔ جب تک استاد اعلیٰ حضرت کی وساطت سے مصرع نہ آئیں گے گلچیں اشاعت سے قاصر رہے گا۔

اس کا اثر جو کچھ ہونا چاہئے تھا ظاہر ہے۔

شمس العلماء دوست افسوس ملگرامی اس واقعہ کو جناب داغ کی غلطی اور میری انتہائی بدنصیبی پر محمول کرتے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ ابراہیم صاحب کے اقتدار و اختیارات کا بھی تفصیل کے ساتھ ذکر فرماتے۔ میں دل ہی دل میں کہتا۔ ع

چشم را بسیار ازیں خواب پریشاں دیدہ است

جناب شمس العلماء کی سابقہ نوازشوں اور اس برتاؤ سے میں کبھی گمان بھی نہیں کر سکتا کہ شمس العلماء کی طبع نازک پر میرے کسی فعل سے گرانی پیدا ہوئی ہو۔ لبفرض ایسا ہوا بھی ہو تو وقتی چند ساعت کے لئے خفیف اثر ممکن ہے۔ اسی طرح جناب داغ کی نسبت میں شمس العلماء کا ہم خیال نہکر ان کی غلطی بھی اپنے متعلق کبھی تسلیم نہیں کر سکتا جناب داغ تا حیات نہایت کشادہ دلی سے ریاض الاخبار کے پردہ میں میری امداد فرمانا اپنی وضع میں داخل سمجھتے تھے۔ ممدوح کے ہر نوازشنامے میں حرف حرف سے محبت ٹپکتی تھی۔ بلکہ سادہ بین السطور سے بھی محبت کے چشمے ابلتے تھے۔

اس سے پیشتر کہ میں۔ خواب پریشاں دیدہ ام کے سلسلے میں کچھ کہوں۔ یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس طرح میں۔ یہ چوٹی کس لئے پیچھے پڑی ہے۔ گلچیں کی کامیابی اس سے زیادہ کیا ہو سکتی تھی کہ اعلیٰ حضرت حضور دکن نظام نے توجہ فرما کر غزل کہی جس کا اثر یہ ہوا کہ ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں اس زمین کی دھوم مچ گئی۔ یہ زمین واقعی آسمان سے اتری ہوئی تھی۔ میر انیس صاحب نے صحیح فرمایا تھا ع ہم آسمان سے لاتے ہیں ان زمینوں کو۔ ہر چند طرح گلچیں کے لئے یہ نئی زمین نہ تھی مگر یہ انتخاب عجیب تھا جسمیں شاعر کے لئے کبھی قافیہ تنگ ہو ہی نہیں سکتا۔ پھر یہ قافیہ ایسا ہے کہ اس میں جتنے شعر چاہیئے زبان کے کہئے۔ مجھے پہلے بھی کبھی کبھی خیال آیا مگر اب پھر یہ خیال تازہ ہو گیا کہ طرح کے سب نمبر۔ کتابی صورت میں بغیر انتخاب شائع کئے جائیں۔ اور چونکہ اب شاعری نے انگریزی تعلیم کے زیر سایہ مضامین میں جدت اور زبان میں دقت پیدا کر دی ہے نیز قدیم مذاق صحیح سے چاہا گیا ہے کہ وہ بھی پرانی لکیر کا فقیر نہ ہو اب اس زمین میں تیس برس کے بعد دور حاضر کے شعراء کو فکر سخن کا موقع دینا چاہیئے۔ اگر موجودہ اعلےٰ حضرت نظام دشہر یار دکن خود بھی اسی زمین کو چار چاند لگا کر آسمان بنانا چاہیں تو پھر یہ زمین تمام ہندوستان پر چھا جائے اور کالجوں کے نکلے ہوئے پاس شدہ وغیرہ پاس شدہ جنہوں نے کافی طور پر مشق سخن بھی حاصل کر لی ہے اس امتحانی آسمان شگفتہ فیض رساں زمین میں فکر فرما کر عرش کے تارے توڑیں اور شکسپیر و ملٹن کی تشنہ روحوں کو اپنے شعر تر سے فاتحہ کا ثواب پہنچائیں تو کیا کہنا ہے

اک شے ہے بہر فاتحہ از قسم شہد و شیر اس فاتحہ کا بادہ کشوں کو ثواب ہو

دنیا کو اندازہ ہو جائے کہ تیس برس پہلے شاعری اپنے مذاق و زبان کے اعتبار سے کیا تھی اور اب ارتقاء کی حالت میں کیا ہے۔ کیا ایوان اشاعت گورکھپور ترجیحی حق کے لحاظ سے کتابی صورت میں طباعت و اشاعت کا انتظام کر سکتا ہے نہ صرف انتظام بلکہ انگریزی مذاق کے شعراء کو بھی اسی زمین میں فکر کرنے کے لئے تکلیف دے۔ مجنوں گورکھپوری سکریٹری ایوان اشاعت و جناب جگر گورکھپوری ممبر ایوان اشاعت اپنے مذاق فطری کے لحاظ سے ضرور اشاعت کے لئے توجہ فرمائیں گے۔ اس طرح کے دو چار شعر جو مجھے اس وقت یاد آئے لکھتا ہوں۔ بشرطیکہ امیر و داغ کے مطلع

ہمت شکن نہ سمجھے جائیں۔ اگر شعرائے حال کو۔موجودہ مذاق نے اجازت دی اور کتابی صورت میں طرحی کلام جدید و قدیم شائع ہوا۔ تو یہ کہنے کا موقع ملے گا ؎

سابق و حال کے جلوے کو مطابق کرلیں آئینۂ بھیجدے اے وادیٔ یمن کا

اسی طرح کے دو چار حسب وعدہ سنالوں تو گلکدہ ریاض کا ذکر چھیڑوں ؎

نغمے سے یوں ہوں بھرا راگ سے جیسے باجا اک ذرا چھیڑئیے پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے

امیر مینائی

نظر کس چشم فتاں سے لڑی ہے کہ آنکھوں کو لئے نرگس پڑی ہے

مطلع کا دوسرا مصرعہ پکارے کہہ رہا ہے۔ اس سے بہتر زبان کیا ہوسکتی ہے۔

داغ دہلوی

نگاہ شوخ جب اُس سے لڑی ہے تو بجلی تھرتھرا کر گر پڑی ہے

بجلی کی تصویر کھینچنا آسان کام نہ تھا۔ جناب داغ کا حصہ ہے۔

اور حضرات کے مطلع بھی بہت پاکیزہ ہیں جو مجھے یاد نہیں آتے۔ اپنا مطلع ضرور یاد ہے مگر وہ اس قابل کہاں۔ پھر بھی سنائے دیتا ہوں۔

ریاض

مزے لوٹو کلیم اب بن پڑی ہے بڑی اونچی جگہ قسمت لڑی ہے

میں اپنے نام کے ساتھ نہ خیرآبادی لکھ سکا نہ گورکھپوری۔ ہیں ہمیشہ اس کے لکھنے سے محترز اس لئے رہا ؎

داغ

کعبے کی ہے ہوس کبھی کوئے بتاں کی ہے مجھکو خبر نہیں مری مٹی کہاں کی ہے

ریاض

ہم بیکسوں کی لاش کو ملتی نہیں جگہ حسرت پکارتی ہے کہ مٹی کہاں کی ہے

طرح گلچیں میں پنکھڑی کا قافیہ یاد آگیا اور دو حضرات کے دو مطلع بھی۔ پہلے پنکھڑی کا قافیہ سنیئے۔

امیر مینائی

تمہارے لب ہیں باغ حسن کے پھول تبسم اُن کی نازک پنکھڑی ہے

نازک مقابلہ ہے۔ میں لب کھولنے کی جرأت نہ کرونگا۔

بسم اللہ

نگار

جلد ۱۹ فہرست مضامین ماہ اپریل ۱۹۳۱ء شمارہ (۴)

نگار

ایڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد ۱۹ اپریل سنہ ۱۹۳۱ء شمارہ (۴)

ملاحظات

معاصر معارف کے فاضل محرر نے فروری کے شذرات میں جو ابتدائی دو صفحے تحریر فرمائے ہیں خواہ وہ کتنے ہی عام مصلحانہ انداز میں کیوں نہ لکھے گئے ہوں، لیکن لکھنے والے کی تعمیم میں ایک ایسی تخصیص اور اسکی نگاہ غلط انداز میں ایسی "پرسشِ پنہاں" موجود ہے کہ اُس نے اپنی قدر اندازی سے کام لیا ہو یا نہ لیا ہو، لیکن یہ ہمیں ضرور معلوم ہے کہ اگر تیر "کجا می نماید کجا می زند" کی صنعت کو پیش نظر رکھ کر سر نہ کیا جاتا تو ہم کیا دنیا جان لیتی کہ کسکو بسمل کرنے کے لئے مولانا نے اپنے "دست و بازو" کو رنج پہونچانے کی زحمت گوارا کی تھی؟

قربان نگاہ تو شوم باز نگا ہے!

جنوری کے نگار میں اس مضمون کو دیکھ کر جس میں "علماء کرام" کے فتاوے اور اُن کے نظریۂ دینی" پر تنقید کی گئی تھی، سب سے زیادہ جس جس کو متوجہ ہونا چاہئیے تھا وہ ہمارے مولانا سید سلیمان ندوی ہی تھے کیونکہ انھیں کا فتوی ایسا تھا جو "صنعت تذبذب" میں لکھا گیا تھا اور اس لئے انھیں پر اُسکی شرح و تفسیر واجب تھی، لیکن ہمیں افسوس ہے کہ انھوں نے شذرات کے دو صفحات پر کفایت فرمائی جو حقیقتاً باندازۂ "نیم نگاہ" بہ قدرِ "ربع نگاہ" بھی تسکین بخش نہیں۔ پھر اس سے زیادہ ہماری نارسائی بخت اور کیا ہو سکتی ہے کہ ٹھیک اُس وقت جبکہ نگار (جنوری) کی

اشاعت کے بعد ہم اپنے آپ کو ساری دنیا کی طرف سے نوید "قتل وذبح" ہونچار ہے تھے، مذہب کی اُس آرمری (ARMOURY) سے جس کو اپنی تکمیل و آراستگی پر اتنا ہی ناز ہے جتنا غالب کے محبوب کو اپنی "برش تیغ جفا" پر تھا، ایک تیر صرف بھی کیا جاتا ہے تو شکستہ پر۔گستہ سوفار۔ نشانہ سے الگ اور مضمحل رفتار!

کیا یہی ہے جسے ناوک فگنی کہتے ہیں؟

ہم کو محترم مولانا سے جو دارالمصنفین ایسے خانوادہ علم و فضل کے چشم و چراغ اور جو شبلی اسکول کی ذہنیت کے سب سے بڑے علمبردار ہیں، یہ توقع تھی کہ وہ نگار کے فتاویٰ والے مضمون کو دیکھکر ہماری غلطیوں کی اصلاح فرمائیں گے، جو شکوک و اوہام ہم ایسے عامی و جاہل لوگوں کے دماغیں پیدا ہوتے ہیں، انھیں اپنے فاضلانہ طرز استدلال سے دور کرنے کی سعی کریں گے اور اگر یہ سب نہیں تو کم از کم وہ اس قدر عنایت تو ضرور روا رکھیں گے۔ آپ نے "ممکن" والے معمہ کو حل کرکے فتوے کے صحیح مفہوم سے دنیا کو آگاہ کردیں، لیکن افسوس ہے کہ نہ انھوں نے اپنے منصب دینی کے لحاظ سے اس مسئلہ پر کوئی توجہ کی اور نہ دوستانہ حیثیت سے ہم کو لائق اعتنا سمجھا حیف سے

ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں

تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا

مولانائے محترم نے اپنے شذرات میں جو کچھ اظہار خیال فرمایا ہے وہ ان کے نزدیک ایسے اصول راسخ سے متعلق ہے کہ اگر ان کو تسلیم کرلیا جائے (اور تسلیم نہ کرنیکی کوئی وجہ نہیں) تو پھر وہ اصول از خود باطل ہو جاتے ہیں جن پر فتاوے والے مضمون کی بنیاد قائم کی گئی تھی۔ اور اس طرح کسی تفصیلی گفتگو کی بھی ضرورت نہیں رہتی۔ اچھا آئیے تو ان اصول پر بھی ایک نگاہ ڈال لیں جو مولانا نے قائم کئے ہیں اور غور کریں کہ ان میں ہمارے اصول کے علاوہ کون سی نئی چیز پائی جاتی ہے۔

شذرات میں ابتدائی چار ٹکڑے اس موضوع کے لئے وقف کئے گئے ہیں۔ پہلے ٹکڑے میں ارشاد ہوتا ہے کہ:-

"ہر قسم کی کامیابی صرف دو چیزوں پر موقوف ہے ایک تو چند طے شدہ اصولوں کو دل سے تسلیم کرلینا اور دوسرے ان طے شدہ اصولوں کے مطابق سختی سے عمل کرنا۔ ان کو عام محاوروں میں اصول و عمل کہو یا مذہب کی زبان میں ایمان و عمل۔ بات ایک ہی ہے۔ سوال یہ ہے کہ پہلے اصول پھر عمل، یا پہلے عمل اور پھر اصول۔ ظاہر ہے کہ فلسفیانہ حیثیت سے یہی جواب ملے گا کہ پہلے اصول پھر عمل —— یہ کتنا کس قدر حماقت ہے کہ........ پہلے پابندی پھر

اصول یا پہلے عمل پھر ایمان"

ہمکو بھی اس سے حرف بہ حرف اتفاق ہے اور کون ہے جو اصول کی تعین سے پہلے پابندی اور ایمان کی تعین سے قبل عمل کا مطالبہ کرے گا۔ لیکن سوال یہی ہے کہ آج کل مسلمانوں نے جس چیز کو اصول یا ایمان قرار دے رکھا ہے وہ حقیقتاً اصول یا ایمان ہے بھی نہیں۔

مولانا معاف فرمائیں اگر میں یہ عرض کروں کہ وہ ابھی تک یہی نہیں سمجھے کہ میری اصل جنگ تو یہی ہے کہ اصول یا ایمان کی صحیح تعین ہی باقی نہیں رہی اور پابندی یا اعمال ہی کو اصول یا ایمان قرار دینے کی حماقت میں دنیا مبتلا ہے۔ میں کب کہتا ہوں کہ کسی منزل کی تعین نہ کیجئے، کوئی مقصود سامنے نہ رکھئے، کوئی غرض مشترک نہ پیدا کیجئے۔ کیونکہ بغیر اس کے جہد و عمل، سعی و اقدام کوئی معنی نہیں رکھتا بلکہ میں خود اس وقت ایک ایک مولوی سے، ہر اُس صاحب جبہ و دستار سے جو خود کو تنہا آلۂ رشد و ہدایت سمجھ کر عوام کی دسترس سے دور، قدیم رومہ و یونان کے غضب آلود دیوتا جیوپٹر کی طرح کبر و غرور کی شکنیں چہرہ پر ڈالے ہوئے ایک مرتفع مسند پر اپنے آپ کو اس قدر بلند کھینچے ہوئے ہے، میں یہی دریافت کرتا ہوں کہ خدا کے لئے اور اس رسول کے لئے جس کا تو جانشین بنا ہوا ہے، بتا اور صحیح صحیح بتا کہ ایمان کیا ہے، اصول مذہب کیا ہیں؟ وہ کہتا ہے "نماز و روزہ و تسبیح و توبہ استغفار" میں پوچھتا ہوں کہ کیا ایمان نام درستی اخلاق کا نہیں، اصول خیر و نجات تزکیۂ نفس و روح سے متعلق نہیں۔ وہ اس کے جواب میں "ہاں" تو کہہ دیتا ہے۔ لیکن اُس کا وعظ یہی ہوتا ہے کہ اصل چیز صرف نماز ہے، ایک مخصوص طریقۂ عبادت ہی کا نام ایمان ہے، اور اگر کوئی شخص اس طریق سے علٰحدہ ہو کر چلتا ہے تو وہ گمراہ رہے گا خواہ اس کے اخلاق کتنے ہی پاکیزہ کیوں نہ ہوں؟

پھر میں اب خود مولانا ندوی سے پوچھتا ہوں کہ اصول کی تعیین، ایمان کی تخصیص کو کس نے نظر انداز کیا۔ طریق کار اور راہِ عمل کو کسنے اصل ایمان قرار دیا، میں نے جو صرف نکوکاری کو اصول و ایمان قرار دیتا ہو یا اُس مولوی نے جو کہتا ہے کہ "اخلاق حسنہ سے نجات ممکن نہیں" جبتک ایک شخص خاص وضع خاص لباس خاص قسم کی ڈاڑھی اور متعین حرکات کے ساتھ نماز پڑھنے والا نہ ہو،

خدارا اب آپ ہی فیصلہ کیجئے، داوری آپ ہی کے ہاتھ ہے کہ وہ کون ہے جو ذریعہ کو صرف ذریعہ سمجھتا ہے اور وہ کون ہیں جنھوں نے ذریعہ کو اصل مقصود قرار دے لیا ہے۔

شذرات کا دوسرا ٹکڑا ملاحظہ ہو:-

"کسی سمجھدار انسان سے کوئی کام نتیجہ کے سمجھے بوجھے بغیر صادر نہیں ہوسکتا، وہی نتیجہ اس کام

کی غرض و غایت ہوتی ہے، اخلاق، محض اخلاق کا تصور غرض و غایت اور نتیجہ کے بغیر ممکن نہیں۔ اخلاق کا کمال اعمال میں نہیں بلکہ ان کی غرض و غایت کی بلندی اور ذاتی خواہشوں اور طلب معاوضہ سے انتہائی پاکی میں ہے۔ انسان کے اعمال کا پست و ذلیل جذبات، نفسانی ہوا و ہوس سے پاک ہونا اخلاق کی بلندی و طہارت کے لئے ضروری ہے۔ انسان کا کام صرف اس قدر نہیں ہے کہ کسی غریب آدمی کو چند پیسے دیدے بلکہ اس کے بعد یہ بھی ہے کہ یہ کام اس طرح کیا جائے کہ کرنے والے کا مقصود اپنی ناموری، نمائش، معاوضہ، فریب اور اس غریب کو ممنون احسان بنانا نہ ہو بلکہ صرف اخلاص قلب ہو۔ ان قلبی جذبات اور دل کے رجحانات کی اصلاح و پاکی سوا اس کے ممکن نہیں کہ ایک دانائے رموز و عالم الاسرار ہستی کا یقین کیا جائے جو دلوں کے ایک رگ رگ کی جنبش اور ایک ایک ریشہ کی حرکت کو دیکھتا اور سنتا اور جانتا ہے اسلئے خدا پر ایمان لائے بغیر حسنِ عمل اور حسنِ خلق کا تصور ممکن ہی نہیں کہ جوارح کے اعمال کی درستی۔ سراسر قلب کے اعمال کی درستی پر موقوف ہے"۔

مولانا کا مقصود اس تحریر سے غالباً یہ ہے کہ اخلاق کی بلندی کا معیار صرف اخلاص قلب ہے اور اخلاص قلب حاصل ہونا ممکن نہیں جبتک خدا پر ایمان نہ رکھا جائے۔ یقیناً مجھے بھی لفظ بہ لفظ اس سے اتفاق ہے، لیکن تھوڑے لفظی و معنوی اختلاف کے ساتھ اور وہ یہ کہ جس چیز کو وہ اخلاص قلب کہتے ہیں، میں اُسے "احساس فرض" کہتا ہوں اور یہ بھی صرف اس لئے کہ "نفسانی ہوا و ہوس" کا کوئی لگاؤ باقی ہی نہ رہے۔ اگر ایک شخص خدا پر ایمان رکھنے کے بعد اخلاص قلب سے کوئی اچھا کام کرتا ہے تو اس کے یہ معنے ہیں کہ وہ اس کا اجر خدا سے چاہتا ہے اور اس طرح گویا وہ بندے سے نہیں تو اس کے خدا سے ضرور بیع و شری کرنا چاہتا ہے اور یہ جذبہ کلیتہً ہوا و ہوس سے خالی نہیں ہو سکتا۔ ہاں اگر تعلیم یہ دیجائے کہ کسی کے ساتھ نیکی کرنا ہر انسان کا فرض ہے جو قدرت یا خدا کی طرف سے اس پر عائد کیا گیا ہے تو پھر کسی قسم کا شائبہ نفسانی خواہش یا غرض ذاتی کا پیدا نہیں ہو سکتا۔ بلکہ کسی پر احسان کرنا گویا خود ممنون ہونا ہوگا کہ اس طرح وہ ایک فرض سے سبکدوش ہو گیا۔

جب تک اعمال کے ساتھ خدا کا ڈر یا اُس کی خوشنودی و برہمی کا خیال شامل رہیگا، انسان صحیح معنی میں کبھی کوئی نیکی نہیں کر سکتا، بلکہ اس کے تمام افعال حسنہ یا تو اس طمع کے زیر اثر ظہور پذیر ہوں گے۔ جو حور و غلمان یا کوثر و سلسبیل سے متعلق ہو سکتی ہیں، یا اُس ڈر سے جو فطرتاً آگ، اژدہا، سانپ، بچھو وغیرہ سے انسان کو ہوتا ہے۔ خدا کو ماننا اور اس طرح ماننا کہ گویا وہ ہندوستان کی کسی ریاست کا نواب ہے۔ جس کے جاسوس ہر وقت ہر جگہ لگے ہوئے ہیں اور جو ذرا ذرا سی بات پر دار پر کھنچوا سکتا ہے، کم از کم میرے خیال میں کسیطرح

نہیں آتا۔ میں اسکو بے نیازی مطلق، استغنائے محض جانتا ہوں جسکو نہ ہمارے افعال بد سے واسطہ ہے نہ اعمال حسنہ سے کوئی تعلق، کائنات کے اور تمام نظام کے ساتھ اسنے انسان کی تمدنی زندگی کا بھی ایک قانون بنا دیا ہے۔ جسکو انسان نے اپنے ارتقائی دور کے مختلف منازل میں اچھی طرح سمجھ لیا ہے، پھر اگر وہ اس پر کاربند ہوگا تو خود اسی کی ہئیت اجتماعی کو فائدہ ہوگا ورنہ تباہ و برباد ہو جائے گا خواہ بجائے پانچ کے چالیس وقت کی نماز کیوں نہ پڑھے۔ مولانا لکھتے ہیں کہ:۔

"خدا پر ایمان لائے بغیر حسن عمل کا تصور ہی ممکن نہیں"

میں اسکے ماننے کے لئے تیار نہیں، کیونکہ دنیا میں بعض افراد ایسے بھی مل سکتے ہیں جو باوجود انکار خدا کے اچھے خصائل رکھتے ہیں اور اپنے ابنائے جنس کو فائدہ پہونچاتے رہتے ہیں، صرف اس خیال کے ماتحت کہ یہ ہر انسان کا فطری فرض ہے میں حیران ہوں کہ مولانا اس کا انکار کیسے کر سکتے ہیں۔ جبکہ وہ خود بھی اس کے قائل ہونگے کہ "نیکی خود آپ اپنا بدلہ ہے" درآنحالیکہ اس نظریہ کے ماتحت خدا کے ماننے کی ضرورت نہیں۔ یہ تو اصولی گفتگو ہوئی۔ اب رہا وہ مسئلہ جس کے سلسلہ میں مولانا نے یہ اظہار خیال کیا ہے، سو میں دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ آپ لوگ جو ایک نیکوکار برہمن کو ناری بتاتے ہیں تو کیا وہ خدا کا قائل نہیں ہے۔ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ ایک بت پرست (اصطلاحی معنے میں) حقیقتاً ایک اسی قوت کا قائل نہیں ہوتا جسے سوائے خدا سمجھنے کے کوئی چارہ نہیں۔ اسلئے میری رائے میں مولانا کو یہ لکھنا چاہئیے تھا کہ "بغیر مسلمان ہوئے حسنِ خلق کا تصور ممکن نہیں" اور اسکو ثابت کرنیکے بعد بیشک وہ نیکوکار برہمن کو ناری اور بدکار مسلمان کو ناجی کہہ سکتے تھے۔

اس کے بعد مولانا زیادہ کھل کر اصل مدعا کی طرف آئے ہیں اور فرماتے ہیں:۔

"آج جبکہ مسلمانوں کو عملاً کام کرنا ہے، صرف باتیں بنانا نہیں، کچھ لوگ ایسے پیدا ہو گئے ہیں، جو اس پر بحث نہیں کرتے کہ ایمان ہو یا حسن خلق عملاً حاصل کرنا چاہیئے، بلکہ اسپر بحث کرتے ہیں کہ نجات اُخروی کا ذریعہ محض ایمان ہے یا حسن عمل۔ صرف حسن عمل ہی سہی، ہمارے داعی اسکا نمونہ بنکر دکھائیں، اسکی اہمیت نمایاں کرکے بتائیں۔ وہ کبھی اسکی دعوت نہیں دیتے کہ نماز پڑھنی کس قدر ضروری ہے، لے دیکر دعوت یہ ہے کہ نماز پانچ وقت ہی کہ تین وقت، تین ہی وقت سہی، مگر ان تینوں وقتوں میں پڑھی بھی تو جائے، یہ وہ لوگ ہیں جو ایجابی اسلام کے بجائے صرف سلبی اسلام کو مسلمانوں کی ہر ترقی کا ذریعہ جانتے ہیں، حالانکہ پانچ وقتوں والا غازی سلطان صلاح الدین، سلطان محمد فاتح اور سلیمان اعظم پانچ وقتوں کی نماز پڑھنے سے نہ اپنی سلطنت کھو بیٹھے اور نہ اس عہد کے ملاحدہ ترک صلوٰۃ و عدیم ایمان کے باوجود ملک کا چھوٹا سا گوشہ بھی حاصل کر سکے، اگر ملک ہی حاصل کرنا تھا"۔

مولانا نے اس بیان میں چند در چند غلطیاں کی ہیں۔ اول تو "وہ کچھ لوگ جو ایسے پیدا ہو گئے ہیں" خود نجات اُخروی سے کوئی بحث نہیں کرتے۔ اس میں سے اگر آپ لفظ اُخروی نکال دیں تو بیشک آپ کا یہ دعوے درست ہو سکتا ہے، کیونکہ اُخروی کا جو مفہوم

آپکے بیاں ہے اُس سے وہ کوسوں دور ہیں اور اگر بطور معارضہ یا استفادہ وہ اُخروی نجات سے گفتگو کرتے ہیں تو صرف اس لئے کہ آپ اُس کے قائل ہیں اور آپ ہی کے مسلّمہ اصول کو سامنے رکھکر اصولاً بحث کرنا چاہیئے۔

دوسری غلط بیانی یہ ہے کہ ان لوگونکو صرف باتیں بنانے والا ظاہر کیا گیا اور عملاً حسنِ خلق سے بالکل بیگانہ۔ اگر اس سے مقصود یہ نہیں ہے کہ دوسرے گھر کی تیز روشنی کو گُل کر کے اپنے گھر کی ضعیف روشنی کو نمایاں کیا جائے، تو میں حیران ہوں کہ مولانا نے کیسے کہدیا کہ ایسے لوگ حسنِ اخلاق سے مُعرّا ہوتے ہیں اور عمل کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔ اس وقت اظہار انکسار کی ضرورت نہیں مجھے صاف صاف دریافت کرنا چاہیئے کہ مولانا مجھے کیوں اخلاق حسنہ سے معرا جانتے ہیں اور کس روایت کی بناء پر وہ مجھے بداخلاق کہہ سکتے ہیں۔ درآنحالیکہ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ "مجھ صرف باتیں بنانیوالے" کے اخلاق بدرجہا اُن بہت سے مولویوں سے اچھے ہیں جو مولانا کے نزدیک عملاً حسنِ اخلاق کے تعلیم دینے والے ہیں اور باتیں نہیں بناتے۔

اب رہا یہ الزام کہ ایسے لوگ تین ہی وقت نماز پڑہنے کی دعوت لوگونکو کیوں نہیں دیتے، سو اس کا جواب زیادہ دشوار نہیں جبکہ صدیوں سے پانچ وقت کی نماز پڑہنے اور پڑہانے والوں کے اخلاق سامنے موجود ہیں۔ تو بردن درجہ کردی کہ دُرونِ کعبہ آئی۔ گفتگو تو اسی میں ہے کہ مولویوں نے لوگوں سے اس قدر نمازیں پڑہوائیں، اتنے روزے رکھوائے، کہ وہ نماز روزہ ہی کو اصل ایمان سمجھنے لگے۔ اسلئے اب وقت کا اقتضا کیا ہے نماز کی اہمیت کا درس دینا یا اُس چیز کا، جس کے حصول کے مختلف ذرائع میں سے ایک ذریعہ نماز بھی تھی اور جو اب اپنی اہمیت ذریعہ ہونے کی بھی کھو چکی ہے۔

اگر سلطان صلاح الدین وغیرہ پانچ وقت نماز پڑہنے سے اپنی سلطنت نہیں کھو بیٹھے تھے تو اس سے یہ بھی ثابت نہیں ہو سکتا کہ سلطنت ان کو پانچ وقت کی نماز ہی سے حاصل ہوئی تھی۔ اور اگر یہ صحیح ہے تو کیوں نہیں آج تمام مولوی پنجوقتہ نماز پڑہکر کم از کم "صوبہ برار" ہی انگریزوں سے چھینکر حضور نظام کو نہ دیں خود ہی لیلیں۔ اور خیر صوبہ برار یا کوئی حصہ ملک تو خیر بڑی چیز ہے میں کہتا ہوں کہ بجائے پانچ وقت کے وہ چالیس وقت کی نماز کنوئیں میں اُلٹے لٹک لٹک کر ادا کرتے رہیں۔ یہ میرا ذمہ ہے اگر وہ مالسر انگل لاج کے غسلخانہ ہی پر قابض ہو سکیں۔

اب رہا دوسرا الزام کہ ملاحدہ ترک صلوٰۃ و عدم ایمان کے باوجود کیوں نہیں ملک کا کوئی چھوٹا سا گوشہ حاصل کر لیتے، سو یہ بالکل بے محل ہے، کیونکہ انھوں نے تو اسکا کبھی دعوٰے ہی نہیں کیا اور نہ وہ اس کے قائل ہیں کہ سلطنت یا ملک گیری نماز سے متعلق ہے۔ اور اگر الزامی جواب دینا چاہیں تو کہہ بھی سکتے ہیں کہ آج دنیا میں حکمراں کس قوم کا حصہ ہے، کیا وہ بڑی خداترس ہر کیا وہ بڑی مسلمان ہے، کیا وہ ملحد و بے دین نہیں۔ اور دور کیوں جائے خود ترکی کو دیکھئے کہ اس کے احیاءِ ثانیہ کا کیا راز ہے۔ اور کیا ترکوں پر الحاد و بیدینی کا الزام عائد نہیں کیا جاتا۔ نماز کے متعلق آپ گفتگو کا ایسا پہلو کیوں اختیار کرتے ہیں، جو بالکل بے محل و غیر متعلق ہے۔ میں نے کب کہا کہ نماز بُری چیز ہے۔ یقیناً وہ ایک بہتر طریقہ اصلاح نفس کا ہے اور میں پابندِ صوم و صلوٰۃ کو کون کو اچھا سمجھتا ہوں بشرطیکہ وہ آپ ہی کے نظریہ کے مطابق ایمان و عمل میں امتیاز پیدا کر سکیں۔ نماز اگر نفس ایمان سمجھکر ادا کیجائیگی

تو یقیناً وہ اپنے حدود سے متجاوز ہو کر ناجائز چیز قرار دیجائیگی، لیکن اگر اُس کو محض ایک ذریعہ فلاح سمجھکر اختیار کیا گیا اور جذبۂ رافت و لطف اسکی وساطت سے اپنے اوپر طاری کیا گیا تو اس کے بہتر ہونے سے کس کو انکار ہو سکتا ہے۔

اخیر میں مولانا فرماتے ہیں کہ:۔

"اصل یہ ہے کہ آجکل جہاں یورپ کی نقالی ہر چیز میں ہے، مذہب و اصلاح مذہب میں بھی نقالی ہے۔ یورپ کے رفارمیشن کی تاریخ پڑھ پڑھ کر ہر جدت پسند کو اسلام کا لوتھر بننے کا خیال ہے، لیکن یہ خبر نہیں کہ اسلام و مسیحیت میں اشتراک کیا ہے؟ جس کے لئے اسلام کو لوتھر کی ضرورت پیش آئے۔ عیسائیوں نے عیسائیت ملنے کے پندرہ سو برس بعد، عیسائیت کو چھوڑ کر سلطنت پائی، لیکن مسلمانوں نے تو اسلام اور سلطنت ایک ساتھ پائی اور جب اسلام چھوڑا سلطنت بھی چھوٹی۔ کیا یہ فرق ہمارے نئے مصلحین کے سامنے ہے۔ غلط رسوم و رواج اور خارجی بدعات کا نام مذہب نہیں۔ محمد (صلعم) کا اسلام وہی ہے جو محمد (صلعم) کے عہد میں مجسم ہو کر نظر آیا اور جس کی تصویر اب بھی اوراق میں محفوظ ہے۔ محمد کا اسلام وہ نہیں ہے، جسکی تصویر آپ اپنے واہمہ سے کھینچ کر دکھائیں۔"

اس کے جواب میں ہم اسی عبارت کو دُہرا کر خود مولانا سے سوال کرینگے کہ وہ اسلام کہاں گیا جس کے ساتھ ساتھ سلطنت آئی تھی، اگر سلطنت کا ساتھ آنا اسلام کا لازمی نتیجہ ہے تو پھر اس سے کیوں انکار کیا جاتا ہے، کہ ترقی ملک گیری کا نام نہیں ہے۔ اگر آج اسلام کہیں نہیں ہے تو اس کا ذمہ دار کون ہے؟ کیا علماء کا گروہ اس الزام سے بری ہو سکتا ہے، یا تو اس کا اعتراف کیجئے کہ اس وقت کوئی عالم دین، کوئی ہادی شریعت، کوئی مصلح مذہب و ملت موجود نہیں ہے اور اگر ایسا نہیں ہے تو پھر ان اسباب کو تلاش کیجئے جنھوں نے سلطنت کو اسلام سے جدا کر دیا۔ وہ لوگ جنھیں آپ نئے مصلحین کے لقب سے یاد کرتے ہیں، وہ بھی اسی جستجو میں ہیں اور آخر کار اس نتیجہ پر پہونچ رہے ہیں کہ یہ سارا ادبار اُنھیں کا لایا ہوا ہے جو اپنے آپ کو علماء کرام اور "ہادیانِ مذہب" کہتے ہیں۔ اور آپ بھی اسی جستجو میں ہیں، لیکن آپ کی جستجو خود اپنے اندر سے شروع نہیں ہوتی اور اس لئے آپ کو اس "لنکا ڈہانے والا" کا پتہ نہیں چلتا۔

یہ آپ صرف زبان سے کہتے ہیں کہ "غلط رسوم اور خارجی بدعات" کا نام اسلام رکھ لیا گیا ہے، لیکن ان رسوم و بدعات کے مٹانے کے لئے آپ کوئی عملی قدم نہیں اُٹھاتے۔ کیونکہ آپ میں ایسا کرنے کی جرأت و جسارت نہیں ہے اور یہ جرأت و جسارت کیوں نہیں ہے؟ اس لئے کہ جبتک نصیحت دوسروں سے متعلق ہوتی ہے بہت دلچسپ چیز ہے، لیکن جہاں اپنی ذات کا سوال آیا، تو پھر وہی "کشفِ ساق" کا معاملہ پیش آجاتا ہے جس کا تحمل آسان نہیں۔

بندہ نواز اگر ہم کچھ نہیں کر سکتے تو ہمارے پاس اسکا ایک معقول جواب بھی ہے کہ ہم اس کے اہل نہیں، لیکن آپ تو ایسا نہیں کہہ سکتے اُٹھئے اور اُن رسوم و بدعات کو مٹائیے جن میں اسلام گم ہو گیا ہے۔ اگر ہم سلبی اسلام والے ہیں تو آپ ایجابی اسلام والے کیوں نہیں سامنے آتے۔ اور اُن اوہام و تشکیک کو کیوں نہیں رفع کرتے، جنھوں نے مسلمانوں کو نصف سے زیادہ تعداد میں ملحد، بے دین، اور کافر بنا رکھا ہے۔

آپ لوگوں کو صرف کافر و ملحد کہہ کر ذہن کی اس رفتار کو نہیں روک سکتے جو زمانہ کے ساتھ ساتھ ایک سیلاب کی طرح بڑھتی آرہی ہے، بلکہ اس کی تدبیر یہ ہے کہ آپ خود اس سیلاب میں پڑ کر بہ نکلنے والوں کو طوفان سے بچائیں۔ لیکن اگر آپ اس سے معذور ہیں تو پھر یہ وعظ و نصیحت بھی ترک کیجئے کہ اس سے بجائے فائدہ کے اور نقصان ہے اور کبھی کبھی اپنی جماعت کو بھی غیر معصوم جان کر اسکے اعمال و افعال کا جائزہ لے لیا کیجئے کہ خانقاہوں کے گوشوں اور مسجد کے محراب و منبر سے جو تقدس کی داستانیں بیان کی جاتی ہیں۔ وہ واقعی صحیح و درست ہیں؟

اتنی نہ بڑہا پاکی داماں کی حکایت
دامن کو ذرا دیکھ، ذرا بند قبا، دیکھ،

نیاز

ہمارے زوال کے اسباب[۱]

(۱)

ہندوستان کے تعلیم یافتہ مسلمانوں کا ایک گروہ کبھی کبھی اغیار کی سیاسی دراز دستیوں سے متاثر ہو کر اپنی کمزوری کا اعلان اس طریقہ سے کرتا ہے:-

"کاش! اورنگ زیب اکبر کی طرح وسیع النظر ہوتا، مغلوں کی سلطنت اب تک دلی میں قائم ہوتی، اور مسلمان شاہی انعامات و اکرامات کی ضیا پاشی میں نہایت خوشگوار زندگی بسر کرتے ہوتے!"

یہ خواب جس قدر خوش آئند ہے، اُسی قدر بعید از قیاس ہے، جس قدر سہانا ہے، اُسی قدر ہماری طبعی سہل انگاری و تن آسانی کا پتہ دیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک بڑی حد تک یہی ذہنیت ہماری تباہی کی ذمہ دار ہے۔ مسلمان اس امر کی سعی بلیغ کرتا ہے کہ وہ خود اپنے دماغ پر آنچ نہ آنے دے۔ بلکہ کوئی دوسرا فرد بشر اُسکی دقتوں کا سامنا کرے۔

۱؎ آقائے محترم جناب قریشی صاحب قبلہ کی خدمت میں بارہا اس موضوع پر علیگڈھ میں گفتگو ہوئی ہے۔ آج میں ذرا وضاحت کے ساتھ اپنے خیالات اور زمانہ کے حالات قلمبند کر رہا ہوں۔ امید ہے کہ جناب ممدوح، اس ہرزہ سرائی کا غور سے مطالعہ فرمائیں گے۔ جناب ممدوح کے درد قومی کا نقش اب تک میرے دل پر ثبت ہے۔

اس مضمون کی تیاری میں مندرجہ ذیل کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے۔

The Muslim world of today - J.R. Mott (1)
Across the world of Islam - Zwemer (2)
Turkey - (Modern world Series) Toynbee (3)
Turkey today - Grace Ellison (4)
Modern Egypt - Cromer. (5)
The Muslim world in resolution by W. Wilson (6)
The Intelligent woman's Guide to socialism & capitalism (G.B.S) (7)

اور وہ خود سکون و عافیت کی زندگی بسر کرتا رہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں وہ ہر وقت کا مقابلہ کرنا اُس وقت تک ملتوی کرتا رہتا ہے، جب تک کہ وہ وقت خود اُسکے سر پر آکر سوار نہیں ہو جاتی۔ اورنگ زیب کے زمانہ میں سرزمینِ ہند میں ایسی ایسی سیاسی موجیں پیدا ہو گئی تھیں کہ ان کا مقابلہ کرنا ناممکن تھا۔

وہ زمانہ بھی کچھ اور تھا۔ ریل۔ تار۔ وائرلس۔ موٹر۔ مشین گن کا پتہ نہ تھا اور شخصی حکومت کے لئے یہ ناممکن تھا کہ وہ کشمیر سے لے کر دریائے کاویری تک اُن حالات میں کامیابی کے ساتھ فرماں روائی کرسکتی۔ بالخصوص ایسی حالت میں کہ جب راجپوت۔ مرہٹہ۔ اور سکھ حلقوں میں قومیت کا احساس پیدا ہو چکا ہو، اس لئے اورنگ زیب کی بجائے اگر خود ملکہ وکٹوریہ اُس صورت میں ہندوستان پر حکمراں ہوتیں تب بھی ہند کی تاریخ اُن ہی سانحات کا مجموعہ ہوتی جیسی کہ آج کل ہے۔

اورنگ زیب کی وفات (۱۷۰۷ء) سے لے کر ۱۸۵۷ء تک مغلوں کی سلطنت کا شیرازہ بکھرتا چلا گیا، یہاں تک کہ غدر کی آندھیوں نے مغلوں کی شان و شوکت کا آخری چراغ تک گُل کر دیا۔ اور تختِ طاؤسی و کوہِ نور الف لیلیٰ کی سی داستانوں کا مرکز بن کر رہ گئے۔ اس کے بعد ہندوستان کی تاریکی کا زمانہ شروع ہوتا ہے اور اغیار کی فتح مند افواج رفتہ رفتہ کل ہندوستان پر اپنا تسلط جما لیتی ہیں۔ اور گویا ہندوستان میں ایک نئے عہد کی ابتدا ہوتی ہے۔ یہ عہد کچھ ہندوستان ہی کے لئے مخصوص نہ تھا۔ بلکہ اس عہد کی روشنی دنیا کے اکثر ممالک میں پہونچکر کارفرما ہو چکی تھی۔ قرونِ وسطیٰ کی خصوصیات ایک ایک کرکے فنا اور دورِ حاضرہ کی بنیادیں مستحکم ہوتی گئیں۔ اس عہدِ نو کو ہندوستان میں غدر سے سو سال قبل عمل پیرا ہونا چاہیئے تھا۔ لیکن مغل سلاطین کا عہدِ حکومت غیر معمولی طور سے پُر امن رہا۔ علاوہ ازیں ہندوستان کی جغرافیائی پوزیشن کچھ ایسی واقع ہوئی ہے کہ اس میں بیرونی اثرات ہمیشہ تاخیر کے ساتھ پہونچتے تھے۔ اسلئے اس عہدِ نو کی ابتدا کرنے میں ہم لوگ اس قدر پیچھے رہے۔ حالانکہ اسی زمانہ میں مغربی اقوام نے ترقی کی منازل طے کیں۔ مگر ہم سکون و عافیت ہی میں مبتلا رہے۔ اُدھر تلاش و تجسس سرفروشی و کامرانی جاری تھی۔ اودھر بادۂ شبانہ کی سرمستیوں کا دور دورہ تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ ترقی کی دوڑ میں ہندوستان ہزاروں میل پیچھے رہ گیا۔ اور مغربی اقوام اقصائے عالم کو زیر نگیں کرنے میں کامیاب ہو گئیں، یہاں تک کہ ہمیں خود اپنی سیاسی آزادی سے ہاتھ دھونا پڑا۔

ہندوستانی شکایت کرتا ہے کہ انیسویں صدی کی ابتدا میں اگر مسلمان افواج ہند اس قدر خراب و خستہ نہ ہوتیں تو ہمارے ملک پر اغیار کا قبضہ کیوں ہوتا؟ یہ شکایت گو ایک حد تک صحیح ہے، لیکن اس سے بڑی شکایت یہ ہے کہ اکبر۔ جہانگیر۔ شاہجہاں و اورنگ زیب کے زمانہ میں ہندوستان اس قدر پُر امن کیوں رہا؟ یہ

بالفاظ دیگر اگر یہ سلاطین اس قدر کامیاب نہ ہوتے تو پھر ہندوستان میں بھی دیگر ممالک کی طرح اضطراب و تردد پھیلتا۔ اور پھر شاید ہم بھی ترقی کی دوڑ میں کچھ پیش قدمی کرسکتے۔ واسکوڈیگاما، ڈریک، فرانسس۔ نامعلوم سمندروں میں شجاعت و مردانگی کی داد دے رہے تھے۔ اُدھر ہندوستانی مثنوی زہر عشق پڑھتا تھا یا امانت کے اشعار الاپتا تھا۔ فلاطون کی (Republic) میں نہ ایسے اشعار کی گنجائش ہے نہ ایسے شعرا کی مگر یہ شاہکار، ہماری زندگی کا جزو لاینفک بن گئے تھے اور رفتہ رفتہ "قصہ منصور" "قوالی" کا چسکا ایک وبائے عام کی طرح قوم کی رگ رگ میں پیوست ہو گیا۔ چنانچہ ہندوستان کا مسلم نوجوان اب عشق بازی پہلے ہی شروع کرتا ہے اور سن شعور کو بعد میں پہونچتا ہے۔

اس سلسلہ میں چند اور امور عرض کرنا ضروری ہیں جن کی مدد سے یہ ذہنیت مستحکم ہوتی گئی۔ اس عہد نو میں ذہانت کا مرکز یورپ بنا اور چونکہ یورپ ہندوستان سے ہزاروں میل کے فاصلہ پر ہے۔ اس لئے اس کے اثرات ہند میں بہت دیر میں پہونچے، ثانیاً ہندوستانی ہی نہیں بلکہ کل مشرقی اقوام ماضی پرست واقع ہوئی ہیں اسلئے اُنھوں نے نئے خیالات اور حالات کی رو کا مدتوں تک مقابلہ کیا۔ اور آخر وقت تک اس امر کی کوشش کی کہ اس نئی تہذیب کے حملوں سے متاثر نہ ہوں، بلکہ اپنی ہی تہذیب کے شکستہ مندر کو قائم رکھیں۔ تیسرے ہندوستان میں سو۔ سوا سو سال سے لٹریچر پیدا ہو رہا ہے۔ وہ نہایت ہی حوصلہ شکن اور پست ہے۔ آپکو معلوم ہے کہ اب تک ہمارے شعرا نے کس قسم کے اشعار ہمارے سامنے پیش کئے ہیں اور ہم کہاں تک ان اشعار سے (Inspired) ہو کر مفید اور کارآمد بن سکتے ہیں!

آہوں کا بھرنا۔

صبح شام نالہ و فریاد کرنا۔

دوپہر کی دھوپ میں خار مغیلاں سے اُلجھنا۔

رقیب روسیاہ کو کوسنا۔

دن بھر میں بار بار مرنا۔ اور پھر ٹھوکر کھا کر جاگ اُٹھنا۔

یہ خیالات کیا کسی حالت میں بھی ہمارے لئے مفید ہوسکتے ہیں؟

اس سے ناظرین یہ اندازہ نہ فرمائیں کہ میں شاعری کی خوبیوں کا منکر ہوں، لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی مانتا ہوں کہ یہ شاعری نوجوانوں کے دلوں میں قومی یا ملی حوصلے پیدا نہیں کرسکتی۔ اس کے علاوہ یورپ کی سیاسی ترقی زیادہ تر مسلمانوں کی تباہی کا دوسرا نام ہے، یقیناً یہ عمارت ہماری ہی ہڈیوں سے تعمیر ہوئی ہے یہ چند اہم اسباب ہیں۔ جنھوں نے نہ صرف ہندوستان کے مسلمانوں بلکہ دنیا کے مسلمانوں پر جمود کی حالت طاری کر دی ہے۔

اور صفحۂ عالم سے ہماری مذہبی اخلاقی اور سیاسی اہمیت حرف غلط کی طرح محو ہو گئی۔ اس قدر عرض کرنے کے بعد مجھے ایک اور امر کی جانب ذرا وضاحت کے ساتھ اشارہ کرنا چاہیئے۔ وہ ہمارے بعض مذہبی رہنماؤں کی جہالت ہے جو ہم کو اقوام عالم کے دوش بدوش آنے نہیں دیتی۔ اگر ہماری ذہنیت مکمل طور سے پُر صحت ہوتی تب بھی علماء کی غلط رہبری ہمیں کبھی سرسبز نہ ہونے دیتی۔ موجودہ صورت تو اس درجہ افسوسناک ہے کہ نہ ذہنیت درست ہے اور نہ رہبری صحیح، پھر مسلمانوں کے زوال کے اسباب پر غور کرنیکی ضرورت ہی کیا باقی رہی؟

غدر کا زمانہ ہند کے مسلمانوں کے لئے سخت ابتلا کا زمانہ تھا۔ چونکہ ہم حکمران رہ چکے تھے اس لئے ہم ہی بغاوت پر آمادہ ہوئے، اور بغاوت کے فرو ہونے کے بعد ہم ہی سے سخت ترین انتقام لیا گیا۔ مسلمانوں کا چونکہ ضمیر کمزور تھا اور قوائے مضمحل ہو چکے تھے۔ اس لئے ان سختیوں کو خاموشی کے ساتھ برداشت کرتے رہے ہزارہا خاندان جو اپنے اثر و دولت میں آپ اپنی نظیر تھے نان شبینہ کو محتاج ہو گئے اور آن کی آن میں مسلمانوں کا جاہ و جلال اور دولت و عظمت خواب و خیال ہو گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ غدر کی داستان ہر حیثیت سے ہندوستان کی ایک خونی داستان ہے اول تو باغیوں نے مظالم کی حد کر دی تھی۔ اس کے بعد حکومت نے انتقام لینے میں دلوں پر اپنا تسلط جمانے کے لئے پوری پوری سختی دکھائی، سیاسی نقطۂ نظر سے یہ اس لئے ضروری تھا کہ آئے دن کی بغاوتوں کا احتمال تک جاتا رہے۔

غدر کے بعد ہندوستان کے مسلمان ایک عجیب کشمکش میں پھنسے ہوئے تھے۔ مذہبی پیشوا پرانی تہذیب ……… و پرانی روایات پر زور دے رہے تھے۔ جنکو انھوں نے ایمان کا جزو قرار دیدیا تھا۔ زمانہ کی رو دوسری جانب بہ رہی تھی۔ مذہبی پیشوا ادہر آق و رق رق کی داستانیں سناتے تھے ادہر نئی تہذیب کے انجن نے دنیا کی طنابیں کھینچ دی تھیں۔ ہند میں ایک نیا عہد شروع ہو رہا تھا جسکا بڑھتا ہوا سیلاب قیانوسی (Institutions) کو بہائے لئے جاتا تھا۔ لیکن مولوی اسی خیال میں تھے کہ آسمان پر سے فرشتے جوق جوق اتریں گے اور مغربی تہذیب کے علمبرداروں کو نیست و نابود کر کے چھوڑیں گے۔ یا پھر یہ ہوگا کہ مسیح موعود تشریف لائیں گے اور آن کی آن سفید اقوام کے شیرازہ کو منتشر کر دینگے۔ حالانکہ معجزوں کا عہد عرصہ ہوا ختم ہو چکا۔ لیکن علماء کی اس تعلیم نے لوگوں کے دلوں میں گھر کر لیا اور قوم ہاتھ پر ہاتھ رکھکر مسیح موعود کا انتظار کرنے لگی۔ علماء کے ایک گروہ کا یہ بھی خیال تھا کہ اگر مسیح موعود آچکے ہیں تو پھر قیامت جلد برپا ہو جائے گی اور میدان حشر میں سفید اقوام کو اپنی سیاسی چیرہ دستیوں کا خمیازہ اٹھانا پڑے گا۔ عرصہ کافی گذر چکا ہے۔ نہ بازار حشر گرم ہوا اور نہ مسیح موعود نے ہماری خبر لی اور اگر حقیقتاً وہ آچکے ہیں تو خدا جانے ہم اب تک کیوں محروم ہیں اور اقصائے عالم پر اسلام کا پھریرا کیوں نہیں اڑتا؟

میں اوپر عرض کر آیا ہوں کہ غدر کا زمانہ ہندوستان کی ذہنیت کی تاریخ کا ایک اہم ترین زمانہ ہے۔ اُس

زمانہ میں پرانی داستانیں، پرانے خیالات و عقائد اور پرانی قسمیں ناقص معلوم ہوتی تھیں، مگر مولوی کی وہی ایک راز تھی۔ مغربی قوام نے عہدِ نو کی روشنی سے پورا فائدہ اُٹھایا، مگر ہم تک یہ روشنی ہمارے غلام ہو جانے کے بعد ہو گئی۔ یا یوں کہئے کہ ہم غلام اسی وجہ سے ہوئے کہ ہم اس روشنی سے بلد مستفیض نہ ہوسکے۔ مولویوں کا فتویٰ تھا کہ مغربی تہذیب اور انگریزی تعلیم سراسر کفر ہے۔ ترکی ٹوپی اوڑھنے والا۔ انگریزی لباس پہننے والا، انگریزی مدارس میں پڑھنے والا، داڑھی منڈانے والا، سب کافر، اور جو لوگ ایسا کریں اُنکے ساتھ دینے والے تک کافر اور لائق گردن زدنی۔ یہ خدا کا شکر ہے کہ اُس زمانہ میں ہند میں اسلامی حکومت نہ تھی ورنہ یا تو ہزاروں بے گناہوں کی جانیں جاتیں، یا ہزاروں مولوی جلا وطن کر دئے جاتے۔ جواب انگورہ۔ مصر اور ایران میں ہو رہا ہے۔ ایک تو سلطنت کا چراغ گُل ہو چکا تھا، دلی کا شاہی اقتدار خاکستر کا ڈھیر نظر آتا تھا، دوسری جانب بغاوت کے سلسلہ میں جائدادیں نکل چکی تھیں۔ تیسرے ہندستان کی پرانی تہذیب کو مغربی رو بہائے لئے جا رہی تھی، مگر مولوی اس کے لئے طیار تھا کہ اس سیلاب فنا کا مقابلہ کرے۔ اگر آج ۱۸۶۱ء یا ۱۸۷۱ء میں فوت شدہ مولوی کلمہ پڑھ کر اُٹھ بیٹھے۔ اور قبر میں سے جھانک کر ہندوستان کی فضا پر نظر ڈالے تو میرے خیال میں اُسکی عبرت کی کوئی انتہا نہ رہے گی اور یہ خیال کرکے کہ آج کل ہند میں کفر کا بازار گرم ہے وہ پھر موت کی نیند سو جائے گا، اُسکے قبل میں اسلام کی صرف وہی سچی تعلیم تھی جو اُس کے ساتھ پیوند خاک ہو گئی۔

اُس زمانہ میں سرسید کا پیدا ہونا ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے ایک انعام خداوندی تھا۔ انھوں نے مسلمانوں کے زوال کے دو خاص اسباب تجویز کئے تھے۔

(۱) مسلمانوں میں مغربی تعلیم سے نفرت

(۲) اسلام کی تعلیم کا زمانہ کے حالات کے مطابق نہ ہونا۔

سرسید نے ان اسباب کے دور کرنے میں اپنی ساری عمر صرف کر دی، اور اپنی ساری قوتیں اسلام کی خدمت کے لئے وقف کیں۔ مغربی تعلیم کو عام کرنے کے لئے انھوں نے مدرستہ العلوم علیگڈھ کی بنیاد ڈالی۔ جس کے پڑھے ہوئے طلبا نہ صرف ہندوستان کے ہر گوشہ میں بلکہ ہندوستان کے باہر تک پھیلے ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کا دوسرا مہتم بالشان کارنامہ انکا وہ مذہبی لٹریچر ہے جس نے اسلام کی (Islamic Standpoint) کی بنیاد ڈالی۔ اور جو مدتوں تک جویانِ حقیقت اسلام کے لئے شمع ہدایت کا کام دیگا۔ انھوں نے خود قرآن پاک کی سائنٹفک تفسیر لکھی، پادریوں کے ناپاک حملوں کے دندان شکن جوابات دئے اور اسلام کو ایک معقول اور مدلل صورت میں دنیا کے سامنے پیش کیا، مولویوں نے سرسید پر بھی کفر کے فتووں کی بوچھار جاری رکھی تھی لیکن اُن کے پائے استقامت میں ذرا تنزلزل پیدا نہ ہوا۔ اور چونکہ وہ دھن کے پکے تھے۔ اس لئے وہ آخر دم تک اپنے مفید کام میں ہمہ تن محو رہے۔

مولویوں نے سرسید کو بوجوہ مندرجہ ذیل کافر۔ مشرک۔ ملعون۔ و مردود قرار دیا تھا،

(۱) سرسید مغربی تعلیم کے حامی ہیں۔

(۲) سرسید ترکی ٹوپی اوڑھتے ہیں اور قوم کا راگ گایا کرتے ہیں۔

(۳) سرسید مغربی تہذیب کے دلدادہ ہیں۔

(۴) سرسید نے اسلام کی معقول ترجمانی کی ہے۔

دراصل یہ تھے وہ اسباب جن کی بنا پر غریب سرسید کو اُن کے ہمعصر علماء نے دائرہ اسلام سے خارج کردیا تھا۔ زمانہ اب اس قدر آگے بڑھ گیا ہے کہ ان وجوہ پر تنقید کرنے کی مطلق ضرورت نہیں، ناظرین خود علماء کی وسعت نظر، تعمق نگاہ۔ اور دردِ قومی کا اندازہ کرسکتے ہیں۔ میں عرصہ سے سنتا چلا آیا ہوں کہ اسلام کی تباہی اس وجہ سے ہوئی کہ مسلمان اسلام سے منحرف ہوگئے، مگر حقیقت یہ ہے کہ ہم صرف منحرف ہی نہیں ہوئے بلکہ ہم سے اور اسلام سے دراصل کوئی علاقہ ہی باقی نہ رہا، اور ہم نے اپنے دین کو چھوڑ کر بت پرستی اختیار کرلی۔ یہ بُت وہ نہیں ہیں جو مندروں اور شوالوں کو اپنا مسکن بناتے ہیں۔ بلکہ حجرہ و خانقاہ میں جبہ و دستار سے ہم آغوش ہوکر "قال اللہ" و "قال رسول" کے نعرے لگاتے رہتے ہیں۔

یہ ظاہر ہے کہ جب مذہب سیاسی قوت سے معرا ہوتا ہے تو اس کی اہمیت فلسفہ کی سی رہجاتی ہے، وہی آج اسلام کی حالت ہے۔ تعلیم یافتہ نوجوانوں کے گروہ پر ذرا نظر ڈالئے، جن کی تعداد روز بروز نہایت سُرعت کے ساتھ بڑھ رہی ہے۔ اُن کا ایمان جس قدر درست ہوتا ہے۔ اُس کا علم ہم سب کو ہے۔ ہوش سنبھالتے ہی انگریزی کی تعلیم شروع ہوجاتی ہے۔ پھر بی۔ اے یا ایم۔ اے پاس کرنے کے بعد اگر زمانہ نے فرصت دی۔ (جو نسبتاً کم ہوتا ہے) تو جاکر کہیں مذہب کی چھان بین شروع ہوتی ہے۔ اور ہر نوجوان کا دماغ بہت جلد علمائے وقت کی تعلیم اور خیالات کی چٹانوں سے ٹکرا کر بہت جلد پارہ پارہ ہوجاتا ہے۔ اور اپنے تشکک و اعتراضات کو دل میں چھپائے ہوئے وہ ظاہراً ایک مسلمان کی حیثیت سے زندگی کے ایام گذارنا شروع کردیتا ہے۔ ہندوستان کے ایک اوسط درجہ کے مسلمان نوجوان کے مذہب کا آج یہ حال ہے۔ زندگی میں داخل ہونے کے بعد جب وہ آریہ سماجیوں اور پادریوں کے اعتراضات سنتا ہے تو اکثر تو چپ ہوجاتا ہے، اور اگر زیادہ تلاش و جستجو کرنا پڑی تو امیر علی مرحوم کی "اسپرٹ آف اسلام" یا مولانا محمد علی کا انگریزی قرآن پاک پڑھنے لگتا ہے۔ "اسپرٹ آف اسلام" اور قادیانی لٹریچر (لاہوری) یقیناً بہت مفید اور کارآمد چیزیں ہیں۔ مگر کبھی آپ نے یہ بھی غور کیا کہ آخر یہ ہیں کیا؟ اس نوع کا سارا لٹریچر جس میں رسالہ سودمند اور مرزا عظیم بیگ چغتائی کی اصلاحی کتابوں تک کو شامل کرتا ہوں۔ یہ سب کوشش ہے اسلام کو موجودہ زمانہ کے حالات کے مطابق بنانے کی۔ اگر امیر علی مرحوم ولایت کو اپنا مسکن نہ بناتے تو اسپرٹ آف اسلام کبھی عالم وجود میں نہ آتی۔ اگر مولانا محمد علی و خواجہ کمال الدین

یورپ سے سراسر ناآشنا ہوتے تو لاہوری لٹریچر پیدا ہی نہ ہوتا۔ اسی لحاظ سے اگر ترکوں کے مقبوضات یورپ سے ہزاروں میل کے فاصلہ پر ہوتے تو انگورہ کی یہ ذہنیت جو آج عالم اسلام کے لئے شمع کا کام کر رہی ہے کبھی بروئے کار نہ آتی۔ سرسید کا (Imagination) نہایت قوی تھا۔ اُنھوں نے اس حالت کا اندازہ پچاس برس پہلے کر لیا تھا مگر افسوس ہے کہ اُن کا کام جاری نہ رہا۔

سرسید کی یہ بدنصیبی تھی کہ اُنھیں نہایت تنگ نظر قائم مقام ملے۔ اور جو شمع وہ روشن کر گئے تھے وہ بہت جلد وقار الملک کے ہاتھوں سے بظاہر ہمیشہ کے لئے گُل ہو چکی۔ وقار حیات کے پڑھنے سے آپ بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں کہ وہ کیسے راسخ الاعتقاد شخص تھے۔ مذہب کے وہ بہت پکے تھے۔ لیکن ان کے دماغ میں وسعت اور (Imagination) کا ذرا بھی دخل نہ تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ اُنھوں نے ایک تمثیل کو ساری تیاریوں کے باوجود بالکل بند کر دیا تھا۔ اور پھر اپنے فیصلہ پر اس شدت سے اڑے رہے کہ علماء کے طبقہ میں ان کی بڑی واہ واہ ہوئی۔ آج وہی علی گڈھ ہے جہاں سال میں دو تین تمثیلیں ضرور ہوتی ہیں۔ اسے آپ علی گڈھ کے موجودہ ارباب حل وعقد کی کمزوری تصور نہ کیجئے۔ بلکہ اُسے زمانہ کی اس رو سے تعبیر کیجئے جس سے گلو خلاصی صرف ایک راہب ہی حاصل کر سکتا ہے۔ اور پھر لطف یہ ہے کہ یورپ میں آپ یہ منہ سے بھی نہیں نکال سکتے کہ ہمارے والس چانسلر صاحب بہادر

That with the return of new life the inner catholicity of the spirit of Islam is bound to work itself out, in spite of the rigorous conservation of our doctors. And I have no doubt, that a deeper study of the enormous legal literature of the superficial opinion that the law of Islam is stationary and incapable of development.

(Maulvi Chiragh Ali)
(Sir Syed Ahmad Khan)
(Syed Amir Ali)

مرحوم نے ڈرامہ کرانا نہ صرف منع کیا تھا، بلکہ اس کارنامہ کو نجات کا وسیلہ گردانتے تھے!

اب ذرا مجھے اجازت دیجئے کہ میں علمائے دین و مفتیان شرع متین کے ایک دوسرے کارنامہ کو آپ کی خدمت میں پیش کروں۔ اس سے آپ بخوبی اندازہ کرلیں گے کہ ان ہادیان برحق نے کہاں تک اسلام کی خدمت کی ہے۔ دور نہ جائیے، تھوڑی دیر کے لئے اپنے ہمسایہ کے گھر میں نظر ڈال کر حالات کا جائزہ لیجئے، اور اپنے دل سے سوال کیجئے کہ:-

(۱) افغانستان کی گذشتہ تباہی کا ذمہ دار کون ہے؟

(۲) کیا امیر امان اللہ خاں سے کل عالم اسلام کو، بلکہ کل ایشیا کو غیر معمولی توقعات وابستہ نہ تھیں؟

(۳) کیا اس افغان ٹریجڈی میں ملاؤں کا ہاتھ نہ تھا؟

اس میں شک نہیں کہ امیر موصوف سے نادانی ہوئی اور افغانستان کی سنگلاخ زمین میں اُس نے بعض اصلاحات پانچ سال میں جاری کرنا چاہے تھے۔ جو پچیس برس میں رواج پذیر ہوتیں، امیر کی اس غلطی کا سب لوگ معترف ہیں، مگر مذہب کے پردے میں ملاؤں نے نہ صرف اُس سے بلکہ اسلام کے سیاسی اقتدار سے کیسا سخت انتقام لیا۔ ملاؤں نے جرگوں کو مشتعل کیا اور آن کی آن میں ایک لہلہاتے ہوئے چمن کو مذہب کی راہ میں دشت سے بھی زیادہ ویران و بھیانک بنادیا۔ امیر موصوف کے خلاف مندرجہ ذیل فرد جرم مرتب کی گئی تھی۔

(۱) امیر پردے کا قائل نہیں ہے۔

(۲) امیر مغربیت کا دلدادہ ہے۔

(۳) امیر خود ہیٹ اوڑھتا ہے اور دوسروں کو بھی یہی تلقین کرتا ہے۔

اب ذرا غور فرمائیے کہ افغانستان کی آبادی میں کتنی عورتیں ایسی ہیں جو پردہ کرتی ہیں۔ مشکل سے دس فی صدی۔ پھر قرآن پاک میں پردہ کا حکم کہاں ہے؟ من گھڑت احادیث جن کی روایت میں علماء کو شک ہو اُن کا میں قائل نہیں، میں صرف علماء سے قرآن پاک کی وہ عبارت سننا چاہتا ہوں جس کی رو سے علماء نے پردہ کی رسم جاری کی ہے۔

مغربیت کی دلدادگی امیر موصوف ہی پر موقوف نہ تھی۔ آج دنیا کی کوئی بھی قوم ایسی ہے جو یورپ کی تہذیب سے متاثر نہ ہوئی ہو۔ ایشیا میں صرف جاپان و روس کو سیاسی اقتدار حاصل ہے اور یہ دونوں قومیں بالکل یوروپین ہو چکی ہیں۔ افریقہ میں جتنی سلطنتیں حکمراں ہیں۔ انھوں نے بھی یورپ کی تقلید شروع کردی ہے۔ امریکہ کی عنان حکومت بھی اسی لحاظ سے یورپ کے ہاتھ میں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اب واسطی قلم۔ جاذب کی بجائے رہئیے۔ اور

بلیو بلیک روشنائی کے بجائے خانہ ساز سیاہی کا زمانہ نہیں، آپ مجبور ہیں کہ آپ ولائتی قلم ولائتی جاذب اور ولائتی روشنائی استعمال کریں۔ ترک جب تک[۵۱] واسطی قلم اور جاذب کے بجائے ریتے کا استعمال کرتے رہے اُن کی سیاسی فلاح ہمیشہ اُن سے گریزاں رہی۔ دراصل امیر موصوف کا جو کچھ بھی قصور رہو اُس کا اندازہ کرنا مشکل ہے، مگر اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اُسکو پہلے اپنے ملک کی فضا کو درست کرنا چاہئے تھا، ٹرکی میں جب تک یہ فضا سم آلود رہی ترکوں کی ساری اصلاحی کوششیں ناکام ثابت ہوئیں۔

---

۵۱ "A revolutionary descended upon the president as he took the reins of the power & he drove like the wind Sultan & the Sultanate were already gone; Caliph & Caliphate next before the blast; or seminaries were for state purposes & then vast properties & endowment made over to the treasury. & all similar religious & corporations were abolished in the campaign against the reaction – Their monastries were appropriated for Govt; purposes. The

Tonybee

The Turkish Republic is a monument to to the ascendancy which the modern civil-isation of the west has established in the contemporary world!"

(")

غرض یہ ہے کہ آپ جس قدر بھی غور فرمائیں گے۔ اُسی قدر اس نتیجہ پر پہونچیں گے کہ جہاں مذہبی تعصب نے دنیا میں ہزاروں مظالم کئے ہیں۔ وہاں یہ افغانی ٹریجڈی سب سے زیادہ خونی الفاظ میں لکھی جائیگی۔ مولوی کی تنگ نظری ضرب المثل ہو چکی ہے۔ دنیا اور دنیا کے حالات سے وہ اسی قدر دلچسپی لیتا ہے جہانتک کہ اس کی ذاتی آمدنی پر اثر پڑتا ہے۔ اُس کے آگے وہ دنیا کو سمجھنے اور دنیا کے حالات سے صحیح نتیجہ اخذ کرنے کا قائل نہیں۔ پھر لطف یہ ہے کہ امیر موصوف ایک ناکام مگر نہایت ہوشمند مدبر کی طرح ہندوستان سے گذرتا ہے۔ اُس سے ہمدردی کرنیوالے، اُس کا خیر مقدم کرنیوالے، اُس کی بات سننے والے بالعموم غیر مسلم ہوتے ہیں۔ مولویوں کا فتویٰ تھا کہ وہ کافر ہے اور کافر کا خیر مقدم کرنیوالا کافر۔ پھر ٹریجڈی نہ صرف افغانستان بلکہ کل ایشیا کی بدنصیبی کا مجموعہ تھی، جس نے نہ صرف ہندوستان و جاپان بلکہ چین۔ عراق، فلسطین و عرب کل ممالک کو سفید اقوام کا مزید پچاس سال تک غلام بنا دیا۔ مولوی تو اپنا جوہر دکھا چکے لیکن فطرت اپنے طریقہ عمل سے غافل نہیں ہے۔ گو سیزر اب وہاں موجود نہیں۔ لیکن سیزر کی روح اور اسپرٹ اُس فضا پر ابتک مستولی ہے اور بہت جلد کسی اور ہیئت کذائی میں نمودار ہوگی۔

کہا جاتا ہے کہ اسلام سیاست پر بھی حاوی ہے۔ گویا جو اسلام کا عالم ہے وہ سیاست سے بھی باخبر ہے لیکن علماء کی سیاسی تبحر کا ابتک تو کہیں تجربہ نہ ہوا۔ بالعموم ہمارے مذہبی پیشوا اپنی خانقاہ کے حدود کے اندر متمکن رہتے ہیں۔ اور ملک یا ملت کی سیاست سے کچھ زیادہ تعلق نہیں رکھتے، ممکن ہے کہ یہ بھی کسی گہری سیاست کا ایک پہلو ہو۔ جس کی ماہیت ایک غیر مذہبی انسان کی نگاہوں سے پوشیدہ رہتی ہے۔ بہرحال یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے کہ یہ علماء کہاں تک سیاست داں ہوتے ہیں، لیکن یہ ضروری ہے کہ میں یہاں اس گروہ کے دو حصہ کر دوں۔ ایک گروہ تو ایسے علماء کا ہے جو تبحر علمی کی وجہ سے بحر العلوم ہوتے ہیں۔ ان کی تعداد بہت کم ہے، اور اُنکے اثرات بھی اسی نسبت سے محدود ہوتے ہیں۔ دوسرا طبقہ پیشہ ور مولویوں کا ہوتا ہے، جنکی تعداد کافی سے کہیں زائد ہے اور جن کا اثر گو ہماری نگاہوں سے پوشیدہ ہے لیکن دور دور کارفرما ہے۔ پہلا طبقہ جس قدر مفید اور وجہ استقامتِ دین ہے اُسی قدر دوسرا طبقہ مخربِ اسلام اور تباہ کن، اس لئے ہمارا جہاد اس آخری ہی طبقہ کی تعداد اور اثر سے وابستہ ہے۔

اب ذرا ہندوستان کے مسلمانوں کی سیاسی حالت کا اندازہ مندرجہ اقتباس سے کر لیجئے جو میں نے "تازیانہ" سے اخذ کیا ہے۔ یہ مضمون دراصل رسالہ سودمند سے لیا گیا ہے:۔

"اب سوال یہ ہے کہ ان کی (مسلمانوں کی) یہ قابل افسوس حالت کیوں ہے۔ اپنی کسی کمزوری سے یا غیر قوموں کی مخالفت سے ہے۔ غیر قوموں کی مخالفت بھی اُسی وقت موثر ہوتی ہے جب اپنے میں کمزوری ہوتی ہے، جب مسلمان ہندوستان میں آئے تو انکی تعداد غالباً سات سو بھی نہ ہوگی، مگر وہ تمام ملک پر بھاری تھے۔ آج

تعداد میں اُس وقت سے ایک لاکھ گو نہ ہے مگر اپنی ذات پر اتنا بھی بھروسہ نہیں جتنا ایک لاکھ پارسیوں یا چند لاکھ سکھوں کو ہے۔ مسلمانوں کو زیادہ تر اپنی کمی تعداد کا رونا ہے اور اسی لئے وہ اپنے لئے خاص حقوق کے طالب رہتے ہیں، مگر سوال یہ ہے کہ جن صوبوں میں انکی اکثریت ہے وہاں اُنکے حقوق کس نے چھین لئے اور اُنھوں نے کیوں چھین لینے دئے۔"

اس سے آپ اندازہ کرلیجئے کہ ہندوستان کی حکمران قوم آج کس ذلت کی حالت میں زندگی بسر کر رہی ہے۔

لارڈ کرومر جو سالہا سال مصر میں حکومت کر چکے ہیں اور جنھوں نے مشرق قریبہ میں بارہا چکر لگایا ہے اپنی کتاب "ماڈرن اجپیٹ" میں تحریر فرماتے ہیں :-

" سوشل اور پولٹیکل نظام کی حیثیت سے اسلام عرصہ ہوا مردہ ہو چکا اور اُسکی تباہی ناگزیر ہے، خواہ طبیب کسقدر ہی ہوشمند کیوں نہ ہو"

پروفیسر میکڈانلڈ جو اسلام کے ایک بڑے عالم ہیں کہتے ہیں :-

" دنیا کے عہد نو کی رو نے مسلمانوں کے ایمان کو تزلزل میں ڈالدیا ہے۔ کل علامات کو پیش نظر رکھکر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ مسلمان اقوام کے لئے مستقبل میں سخت مذہبی تباہی پوشیدہ ہے۔ اسلام یورپ کی تہذیب کے مقابلہ میں اپنے ایمان کو قائم نہیں رکھ سکتا۔ نوجوان طبقہ روز بروز دہریت کی جانب پیش قدمی کر رہا ہے اور جیسی تعلیم پھیلتی جائے گی اور تاریخ کے نتائج واضح ہوتے جائیں گے۔ حِس اخلاقی زیادہ تیز ہوتا جائے گا، اور محمدی افسانہ برباد ہوکر اپنی اصلی حقیقت کو آشکارا کرے گا۔ اور یہ سارا ڈھونگ فنا ہوجائیگا اُسوقت عیسائیت کا فرض ہے کہ وہ ان اقوام پر تسلط حاصل کرکے انکو محفوظ رکھے ...."

ایک طرف تو پروفیسر میکڈانلڈ نے اسلام کی تباہی کی یہ افسوسناک تصویر کھینچی ہے۔ اب میں تصویر کا دوسرا رُخ آپکی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔ جرمنی کے مشہور جنرل ایرک لوڈنڈراف یہ پیشین گوئی کرتے ہیں کہ مئی ۳۲ء میں ایک عالمگیر جنگ شروع ہونیوالی ہے جو اپنے ساتھ یوروپین تہذیب کی قبر لائے گی۔ اور جس کے ختم ہونے سے قبل کل یورپ اور امریکہ تباہ ہوجائیں گے اور پھر دنیا پر از سر نو جہالت، تاریکی۔ اور وحشت طاری ہوجائے گی۔ جنرل موصوف کی اس تحریر نے دنیا میں ہلچل ڈالدی ہے۔ اور متمدن دنیا کے اخبارات نے اس پر بڑی دھوم دھام کے ساتھ رائے زنی کی ہے۔ جابجا اس پیشنگوئی کے اقتباسات شائع ہوئے ہیں، اور باخبر حلقوں میں اس پیشین گوئی کو خاص اہمیت دیجارہی ہے۔ جنرل موصوف کہتے ہیں کہ یہ جنگ

" ان تمام جنگوں سے جو اب تک دنیا میں ہوئی ہیں بہت زیادہ تباہ کن ہوگی، اور یورپ اُس کے بعد ایک تباہ شدہ تہذیب

تہذیب کا تودہ نظر آئے گا، یہاں تک کہ اُس کے بعد جو انقلابات ہوں گے وہ امریکہ کو بھی نیست نابود کرکے چھوڑینگے"
یہ وثوق کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ جنگ کب ہوگی، لیکن ایسے قرائن موجود ہیں جو یہ بتاتے ہیں کہ اب وہ زمانہ دور نظر نہیں آتا کہ جب یہ ہولناک و المناک مصیبتیں دنیا کو گھیر لیں۔ مغربی حکماء کہتے ہیں کہ مضطرب مسلمانوں تک عیسائیت کا پیام پہونچانا چاہیئے۔ ورنہ مسلمانوں کی بد اخلاقی بہت جلد ایک مہیب صورت میں دنیا پر مستولی ہوجائے گی۔ مگر ہم تھوڑی دیر کے لئے یہ مانے لیتے ہیں کہ دنیا میں ایسی جنگ ہونیوالی ہے جو مغربی تمدن اور اُس کے ساتھ ساتھ مذہب کا خاتمہ کردیگی مگر کیا آپ صداقت کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر ایسا ہوا تو موجودہ اسلام دنیا پر حاوی ہونے میں کامیاب ہوجائے گا۔ کیا اسلام کی موجودہ ترجمانی ایسی ہے جو دنیا کی مضطرب اقوام کو تسکین دے سکیگی۔ اگر ایسی شدید جنگ نہ بھی ہو، تب بھی ذرا یہ غور کیجیئے کہ مغربی اقوام آج کس حالت میں ہیں۔ مذہب سے وہ دور ہیں، اور زمانہ کی مادی حالت نے ان کو ازحد سراسیمہ اور بدحواس کردیا ہے۔ یورپ کی تہذیب کا مرکز مشین ہے، جو فی الحال ان کے اضطراب کا باعث ہے، اور جو آگے چلکر اُن کی تباہی کا موجب ہوگی۔ اسی اضطراب کی وجہ ہے کہ برکن، اور چکاگو کے مشن کامیابی حاصل کررہے ہیں، اور جس قدر زمانہ گذرتا جائے گا اور زیادہ سرسبز ہوتے جائیں گے لیکن وہ اسلام کی کونسی ترجمانی ہے جو اس قدر کامیاب ہورہی ہے، یہ اسلام وہ نہیں ہے جو مشرق کا پیشہ ور مولوی دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے، اگر وہی اسلام آپ آج مغرب کے سامنے لائیں تو اسلام قبول کرنا تو درکنار آپ کو شاید مہذب سوسائٹی میں جگہ بھی نہ ملے۔ اس سے آپ یہ اندازہ نہ فرمائیں کہ مہذب سوسائٹی میں داخل ہونے کے لئے اسلام کو قربان کردینا چاہیئے۔ بلکہ اس زمانہ کے حالات کو مدنظر رکھکر اسلام کی ترجمانی کرنا چاہیئے۔ ورنہ اسلام کو سخت خطرات کا اندیشہ ہے۔

موجودہ مصر و ٹرکی آج اسلام کی ضروری ترجمانی پر کاربند ہیں۔ لیکن یہ ترجمانی اُن ممالک کے غارت ہونیکے

له Islam of a generation ago is passing into new forms. Religious & social & intellectual revolutions are in progress in the Islamic world. This movement is more general & more fundamental than any similar religious movement since the reformation. awakened intellects will not brook fanatic dictation. Blind tradition cannot stay the rising tide of reason as applied to religion. Moslem state are falling into line with (بقیہ صفحہ ۱۲ پر ملاحظہ ہو)

بعد بر وئے کار آئی۔ ذرا ٹرکی کی حالت کا اندازہ کیجئے۔ یورپ کے بعض اقوام ہمیشہ اُس کے در پے آزار ہیں۔ اول تو روس یونان و ریاست ہائے بلقان کا ہمیشہ ترکوں کے خون کا پیاسا ہونا۔ پھر شخصی حکومت کی ابتری۔ سلطان عبدالحمید کی تباہ کن پالیسی، اور بعد ازاں ترکوں کی سوشل خرابیاں جن کو وہ مذہب کا رنگ دے چکے تھے، چنانچہ ان حالات نے جنگ کریمیا۔ جنگ ٹریپولی۔ اور جنگ بلقان میں ترکوں کو غارت کر دیا۔ جبتک سلطان عبدالحمید تخت پر جلوہ افروز رہے انھوں نے ملک میں کوئی سیاسی۔ مذہبی۔ یا ملکی اصلاح نہ ہونے دی۔ ایک موقعہ پر ایک ترک مدبر نے پیرس میں تقریر کرتے ہوئے یہ کہا تھا کہ ہم نے سب سے بڑی غلطی یہ کی کہ مذہب اسلام قبول کیا اور اس مذہب کے سب سے بڑے بت کو (خلیفہ کو) اپنے ملک میں جگہ دی۔ ورنہ ہمیں کبھی یہ مصیبتیں نہ اُٹھانا پڑتیں۔ مگر اسلام قبول کرنے کے بعد اگر ٹرکی کے مسلمان اپنے مذہب کو زمانہ کے حالات کے مطابق بناتے رہتے تو ان کو یہ دقتیں کبھی نہ اُٹھانا پڑتیں، انکی سیاسی کمزوری محض اس وجہ سے ہوئی کہ وہ اسلام کے فروعات سے وابستہ ہوکر جوہرِ اسلام سے بے خبر ہو گئے تھے۔ اُنیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے شروع میں ترکوں کی ذہنیت کیا تھی؟ سلطانِ وقت سے لے کر ادنےٰ ترک شدت کے ساتھ قسمت پرست واقع ہوا تھا۔ اور دنیا کے ہر سانحہ کو اسی قسمت کا کرشمہ تصور کرتا تھا۔ ترکوں کی سوسائٹی میں پیشہ ور مولویوں کا بہت زور تھا جو اب تک ہر ملک میں اگر اسلام سے باخبر ہوتے ہیں تو دنیا سے بیخبر پائے جاتے ہیں۔ بات بات میں تعویذ۔ گنڈے ٹوٹکے چلتے تھے۔ گھروں میں بھوت۔ آسیب پائے جاتے تھے۔ پردہ کی شدت نے عورتوں کو ملت کا ناقص ترین جز بنا دیا تھا۔ مستورات بالعموم جاہل۔ کمزور۔ آرام طلب اور ملک کی سیاسی حالت سے بے خبر رکھی جاتی تھیں۔ ان کی اولاد کمزور دل اور پست ہمت پیدا ہوتی تھی۔ کثرتِ ازدواج کا بازار گرم تھا۔ شاہی حرم میں تو ہزاروں بیویاں ہوتی ہی تھیں، مگر اس کے ساتھ ہر بے اور پاشا بالعموم چار بیویاں کرتا تھا۔ چنانچہ شاہی حرم سے لے کر ہر ذی اختیار شخص کے گھر میں بداخلاقی۔ بے راہ روی۔ عیش پسندی۔ چالبازی اور پریشاں حالی کا زور تھا۔ بے اور پاشا جو ملک کے ستون ہو سکتے تھے گھر کی ریشہ دوانیوں میں مصروف رہتے تھے۔ اور اسی وجہ سے ملک کا عام اخلاق روز بروز

(بقیہ صفحہ ۲ ملاحظہ ہو) the world continue in favour of intellectual & religious freedom. Modern education is accepted among Moslems of every country. In its train follow an awakened press & re-evaluation of Islam a religious to meet the needs of a people & a state."

(Rev: J. L. Barton LL. D)

گرتا جاتا تھا۔ پھر لطف یہ ہے کہ سب کچھ مذہب کے پردے میں کیا گیا، اگر آج یورپ اسلام کو محض پردے اور کثرتِ ازدواج کا پاسپورٹ سمجھتا ہے تو اس میں یورپ کا کیا قصور ہے۔

"اسلام کا سوشل نظام جو اس کے عقائد اور تمدن میں پوشیدہ ہے۔ انگلو سیکسن معیار سے
مطابق نہیں پایا جاتا۔ صرف یہ کہنا کافی ہے کہ غلامی اور غلاموں کی تجارت جو اسلام کے مذہبی
حقوق ہیں، عورتوں کی غلامانہ حالت، کثرت ازدواج ...."

اسلام یوروپین معیار سے نیچے کیوں ہے، کیونکہ اسلام کو یورپ محض غلامی۔ عورتوں کی غلامانہ حالت اور کثرت ازدواج کا مجموعہ شمار کرتا ہے۔ اور کیوں نہ شمار کرے۔ جس قدر مسلمان اقوام یورپ سے روشناس ہوئیں۔ اُن میں سے ہر ایک ان امور پر مذہب کے پیرایہ میں کاربند تھی۔ مصری خواتین کی حالت کا اندازہ کرتے ہوئے ایک مورخ رقمطراز ہے:۔

"پیدائش کے وقت غیر خوش آیند۔ بچپن میں تعلیم سے دور، بیوی بن کر محبت سے بیگانہ، ماں بنکر
عزت سے بے خبر۔ بڑھاپے میں بے یار و مددگار، اور جب اسکی تاریک۔ خشک اور تکلیف دہ زندگی
ختم ہوتی ہے، اس کا ماتم وہ تک نہیں کرتے۔ جنکی اس نے مدت العمر خدمت کی۔"

جس زمانہ کی طرف میں اوپر اشارہ کر آیا ہوں، اُس زمانہ میں ترکی خواتین کی بھی یہی حالت تھی۔ کیا ترک یہ امید کر سکتے تھے کہ ایسی ماؤں کی اولاد درِ خیبر کو اُکھاڑ سکے گی، اور سمندروں میں گھوڑے دوڑا دے گی۔ کیا ایسی ماؤں کی اولاد دنیا کے کسی حصہ پر کبھی حکمران ہوئی ہے؟ مسلمان جب تک خیمہ و خرگاہ کو اپنا مسکن بنائے رہے۔ دنیا پر ان کا رعب طاری رہا۔ مگر حرم سرا میں داخل ہونے کے بعد، اوّلاً عورتوں کو مقید کیا گیا، اُس کے بعد کثرتِ ازدواج کا بازار گرم ہوا، اور پھر رفتہ رفتہ اسلام کا سیاسی اقتدار خاک میں ملتا گیا۔ یہاں تک کہ اب مسلمانوں کے پاس "حرم سرا کی حفاظت کو تیغ ہی نہ رہی"۔ لیکن حرم سرا۔ پردہ کی بلند اور نہایت مستحکم دیواریں، کثرتِ ازدواج، اور اسکی ساری خرابیاں موجود ہیں۔

باقی رہے نام اللہ کا ،

~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~

ایران جنت نشان میں ایک کروڑ کی آبادی ہے، اُس کے اقتصادی ذرائع وسیع ہیں، اس کا رقبہ ۶ لاکھ مربع میل ہے، اُسکی آبادی زبان، تمدن اور آئیڈیل میں ولایتی اقوام کے دوش بدوش ہے، مدبرین کا یہ فیصلہ ہے کہ ایک زمانہ میں یہ ملک مغربی ایشیا کا مالک تھا اور اب جبکہ اسلام اس کی

---

۱) اقتباس از Across the world of Islam. صفحہ ۲۷۸
~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~

سرزمین میں پوری طرح کارفرما ہوچکا، وہ مشرق قریبہ میں سب سے پیچھے ہے۔ لیکن اس ملک میں بھی جنگِ عظیم کے بعد قومی تحریک پیدا ہو گئی ہے۔ وہ بھی سیاسی آزادی کے لئے مضطرب ہے۔ اس نے بھی ایک لیڈر حاصل کرلیا ہے اُس کے ہاتھ میں تلوار دیدی ہے، اور اُس کے سر پہ تاج رکھدیا ہے" لیکن

اُس سرزمین میں بھی،

"دقیانوسی[۵۲] اسلام سے بددلی پھیلی ہوئی ہے، جو کبھی کبھی بلند آواز کے ساتھ بیان بھی کیجاتی ہے تفریحی اخبارات میں دقیانوسی ملاؤں کے رسومات کے متعلق کارٹون نکلتے ہیں، اُن نوجوانوں میں سے جو اعلےٰ تعلیم حاصل کرچکے ہیں۔ اکثر اسلام سے منحرف ہو گئے ہیں۔ ایک نے یہ بھی بیان کیا کہ جب تک ایران عرب کے مذہب سے کنارہ نہ کرے گا۔ اسکی ترقی ناممکن ہے۔ ایک اور شخص نے یہ بیان کیا کہ عربوں نے ہم پر تین چیزیں مسلط کیں۔ بدیشی حکومت، بدیشی زبان، اور بدیشی مذہب، ہم نے پہلی شے کو عرصہ ہوا خیرباد کہدیا ہے، اپنی زبان کو صاف کرکے دوسری شے سے کنارہ کررہے ہیں، لیکن تیسری شے اب تک ہم پر مسلط ہے"۔

اسی بنا پر پادری زنیور کا خیال ہے کہ

"ایران سے زیادہ اور کوئی مسلم ملک مسیحی مبلغوں کے لئے زیادہ مواقع اپنے اندر پنہاں نہیں رکھتا تعلیم یافتہ ایرانی اب یہ کہتے ہیں کہ ان کی قومی سطوت اسلام سے قبل رونما ہوئی تھی۔ اور درحقیقت عربوں کا حملہ ہماری تہذیب کے لئے سدِ باب تھا نہ کہ ہماری ترقی کا پیش خیمہ"۔

بیسویں[۵۳] صدی میں جاوا سے لیکر امریکہ تک ہر ملک کا مسلمان اپنے دین سے بددل ہے، اور کثرت سے

---

[۵۲] ابھی چند ہی سال ہوئے کہ ایرانی مغربی تعلیم کی افضلیت ماننے پر مجبور ہوئے، عرب میں یہ خیال بڑھتا جارہا ہے کہ اسلام زمانۂ حال کے مطابق نہیں ہے، اور یہ کہ مغرب کی طاقتور قومیں دنیا میں اپنی جگہ اس لئے حاصل کرنے میں کامیاب ہوئیں کہ انکی تعلیم اور ان کے سوشل ضوابط افضل تھے"۔

مسلمان ہر تہذیب کی اچھی باتیں حاصل کرنے کے لئے آزاد ہیں، انکے خیال میں تمام مذاہب یکساں ہیں، موجودہ اسلام جس میں مولوی پرستی، سخت تنگ نظری اور جہالت اور رسومات داخل ہو گئی ہیں رسول پاک کے اسلام کی توہین ہے۔ (ایس خدابخش)

(بقیہ صفحہ ۲۴ پر دیکھئے)

مسلمان دیگر مذاہب اختیار کر رہے ہیں، یا دہریت کی جانب مائل ہو جاتے ہیں۔ اسلام کی تعلیم زمانہ کے حالات کے منافی ہے اور یہ ناممکن ہے کہ کوئی قوم اسلام کے دقیانوسی اصولوں پر کاربند رہ کر ترقی کر سکے، اُسکی مثالیں میں اوپر بھی دے آیا ہوں۔ اور ایک مثال اور آپ کی خدمت میں پیش کروں گا۔

جنوبی افریقہ میں مسلمان پچاس ہزار کے قریب ہیں، ان میں اکثر تجارت پیشہ ہیں، اور بعض نہایت وسیع پیمانہ پر تجارت کرتے ہیں، مسلمانوں کا طبقہ ہندوستانیوں میں سب سے زیادہ خوش حال اور دولت مند ہے۔

۵۳　(بقیہ صفحہ ۲۳ ملاحظہ ہو)

The Rev: J Zackle, of India writes:-
The Spiritual revolt against a cold formalism rationalism, & Traditionalism, in the Islam. That preaches a lonely in unfeeling diety is spreading everywhere."

Dr: Speer reports that there is in persia a manifest dissatisfaction with Islam among the thinking people. There is a talk among the part of starting a protestant movement in Islam.

G. Simon writes
"I have noticed discontent with the teachings of Islam among those Moslems who have come into contract with christianity."

لیکن باوجود اس کے کہ یہ سفید اقوام کے ہجوم میں رہتے ہیں۔ یہ اب تک اسلام کی دقیانوسی ترجمانی پر مبالغہ کے ساتھ کاربند ہیں۔ سود ان کے ہاں اب تک ایمانا حرام ہے۔ میں نے چند تجارت پیشہ احباب سے دریافت کیا کہ کیوں بھائی! سود اگر حرام ہے تو تم کیا سود نہیں دیتے؟ فرمانے لگے کہ آج کوئی ایسی تجارت ہے۔ جو بغیر سود دئے چل سکے؟ پھر میں نے پوچھا کہ آپ سود لیتے بھی ہیں؟ کہنے لگے لاحول ولاقوۃ، بھلا حرام کام کیسے کیا جائے؟ میں نے عرض کیا کہ سود کا لینا اور دینا یکساں حرام بتایا جاتا ہے۔ اس لئے دینا بھی حرام ہوا۔ اب غور فرمائیے کہ بیسویں صدی کی کوئی تجارت ایسی ہے جس میں سود کا لین دین نہیں ہوتا؟ اور کیا یہ ممکن ہے کہ تجارتی مرکز میں رہ کر اور وسیع بیوپار چلا کر کوئی مسلمان اسلام کے دقیانوسی تعلیم پر کاربند رہے؟ اس زہریلے خیال نے جس قدر مسلمانوں کا خون چوسا ہے اس کا اندازہ محال ہے۔ ہزاروں خاندان اسی غلط التعلیم کے نذر ہو گئے۔ اور اب تک مسلمانوں کو یہ خیال ہے کہ سود لینا۔ حرام، دینا۔ مجبوری ہے۔ آج دنیا کے کوئی انسٹیٹیوشن ایسی نہیں ہے جو سود پر نہیں چلتی۔ دنیا کی کوئی حکومت ایسی نہیں ہے جس کا سود کا حساب کتاب نہ ہو۔ اگر مسلمان مذہب کی غلط تعلیم پر کاربند رہیں تو اولاً انھیں اپنی ساری حکومتیں اغیار کو دیدینا چاہئیے، اپنی درسگاہیں بند کر دینی چاہئیے۔ اور دکانوں اور گوداموں میں قفل لگا کر من وسلویٰ کے انتظار میں زندگی گذارنا چاہئیے۔

حقیقت یہ ہے کہ بقول[۵] برنڈشا "اگر ایک عورت پابہ زنجیر رہنے کی عادی ہو گئی ہے، اور دیگر مستورات کو بھی اسی حالت میں دیکھتی ہے تو اس کی زنجیریں کاٹنے کی تجویز تک اسے خوفزدہ کر دے گی۔ زنجیروں کے بغیر وہ اپنے آپ کو برہنہ تصور کرے گی۔......... آدمیوں کو پابہ زنجیر کرنا آسان تر ہے بہ نسبت زنجیریں کاٹنے کے، اگر وہ زنجیریں عزت کا تمغہ شمار کیجاتی ہیں۔"

اسی طرح سے یہ عام خیال پختہ ہو گیا ہے کہ باعزت اور پکا مومن وہ ہے جو۔

(۱) سود کو حرام سمجھ کر اس سے اجتناب کرے۔

(۲) ایک سے لیکر چار بیویاں کر کے ان کو چار دیواری میں مقفل کرے۔

(۳) خانقاہوں اور مدارس کے بتوں کو پوجتا رہے، اور

---

[۵] اقتباس از The Intelligent woman's Guide to Socialism and capitalism. by Shaw

(۴) اُن کی تعلیم و تلقین کو بغیر چون و چرا کے مانتا جائے۔

عام مسلمانوں میں یہ خیالات صدیوں سے پختہ ہو کر راسخ ہو گئے ہیں، چنانچہ اب اسکا نتیجہ یہ ہے کہ ان زنجیروں میں جکڑ کر مسلمان اپنے آپ کو باعزت مومن سمجھتے اور اس سے انحراف کرنیوالے کو کافر اور دوزخ کا ایندھن تصور کرتے ہیں۔

اسی سلسلہ میں کثرت ازدواج پر شا کے خیالات ملاحظہ فرمائے اور دیکھئے کہ آج بیسویں صدی کی سب سے عالمانہ رائے، کہاں تک اسلام کی سچی تعلیم کے مطابق ہے، یہ کس قدر افسوسناک ہے کہ ہم تو اسلام کی تعلیم سے بےخبر ہوتے جاتے ہیں، مگر مہذب اقوام اُسی تعلیم سے استفادہ کرتی ہیں۔

"قوم کے افراد کو محض ایک بیوی اُسی وقت تک کرنا چاہیئے کہ جب تک ملک میں عورتیں اور مرد ایک ہی تعداد میں ہوں۔ اگر کوئی جنگ برپا ہو جائے اور ملک کے ستر فی صدی مرد نذر تیغ و تفنگ ہو جائیں، اور عورتوں کی آبادی میں محض ایک فی صدی کی کمی واقع ہو۔ اُس حالت میں کثرت ازدواج پر کاربند ہونا لازمی ہو جائیگا، اور تمام مذاہب کو اس تدبیر کی تائید کرنا ہو گی......"[۱]

اس سے آپ اس نتیجہ پر پہونچ سکتے ہیں کہ اسلام نے کثرت ازدواج کا جواز (economic whole) رکھا ہے وہ اسلام کی اُس ہمہ گیر درس کا پتہ دیتا ہے جو ہر ملک اور ہر زمانہ پر حاوی ہو سکتا ہے، لیکن وہ تدابیر جو جنگ کے زمانہ میں مفید ہو سکتی ہیں، اُن پر صلح و آشتی کے زمانہ میں کاربند ہونا، اور پھر اپنی نفس پرستی کو مذہب کے قالب میں چھپانا اگر اسلام کی توہین نہیں ہے تو کیا ہے؟ بیگم شاہ نواز نے اخبار کے ایک نمائندہ سے ملاقات کرتے ہوئے لندن میں یہ ٹھیک کہا تھا کہ ہند میں کثرت ازدواج کی صورت بہت شاذ و نادر بطور استثنا کے پائی جاتی ہے، اور جہاں پائی جاتی ہے۔ وہاں اکثر ایسے اسباب موجود ہوتے ہیں۔ جن سے اُسکا عمل میں آنا ناگزیر معلوم ہوتا ہے۔ لیکن میں بلا خوف تردید یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ ٹرکی میں یہ رسم مستثنیات میں سے نہ تھی، بلکہ ایک بلائے بے درماں کی طرح گھر گھر میں موجود تھی، جس نے قوم کی عام ذہنیت کو تباہ کر دیا تھا، اور جو حقیقتاً ٹرکی کے زوال کا ایک بڑا سبب ہوئی۔ چنانچہ اب اُسی سرزمین میں اس رسم کے خلاف سخت ترین ردعمل رونما ہوا ہے۔

پیشہ ور مولوی کا ایک عقیدہ جو اس سلسلہ میں دلچسپی کے ساتھ پڑھا جائیگا یہ ہے اگر کوئی شادی شدہ صاحب اولاد شخص ایسے مولوی سے اپنی کشاکش رزق کی شکایت کرتا ہے، تو مولوی معاً اسے دوسری شادی کرنیکی تلقین کرتا ہے۔ ایسے مولوی کا فلسفہ واضح ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہر شخص اپنی قسمت کی روزی اپنے ساتھ لاتا ہے، اور جب دوسری بیوی اپنی روزی

---

[۱] Shaws Guide to Socialism & Capitalism.

اپنے ساتھ لائے گی تو گویا کشاکش رزق کی تکلیف بھی دور ہو جائے گی لیکن بقول برنارڈ شا عورتیں اور مرد دونوں حکومت کی ملکیت ہیں، اور حکومت کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ شادی اور تعداد اولاد کو اپنے ہاتھ میں رکھے، گویا ہر فرد بشر کو یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ جسقدر چاہے شادیاں کرلے اور جسقدر چاہے اولادیں پیدا کرے۔ بہرحال یہ دونوں خیالات ایک دوسرے سے متضاد ہیں، اور اس امر کی ضرورت ہے کہ ہم افراط و تفریط سے بچکر ایک معقول نتیجہ پر پہونچیں یہ نتیجہ وہی ہوگا جو اسلام کی سچی تعلیم ہے اور جس سے ہمکو افسوس ہے کہ اب بیگانہ ہو گئے ہیں۔

ردائے خلافت کی عرصہ ہوا دھجیاں اڑ چکیں جس نے عالم اسلام کی یکجہتی کو پارہ پارہ کر دیا ہے۔ اسلامی ممالک علیحدہ علیحدہ اپنی اپنی حدود کے اندر تعمیری کام کر رہے ہیں، ان کی نگاہوں سے دقیانوسی مذہب کے غباری عینک دور ہو چکی ہے، اور ہر اسلامی ملت اپنی ملکی اور قومی فلاح کی تدابیر کر رہی ہے۔ پان اسلامزم سلطان عبدالحمید کا ایک ناتوان آلۂ حرب تھا جو اب مدفون ہو چکا، وہی مذہب اسلام جسے نہایت سخت اور اٹل سمجھا جاتا تھا اب اپنی ہیئت کذائی تبدیل کر رہا ہے، یا بہتر ہوگا کہ ہم یہ کہیں کہ اسلام کی وہ فروعات جو مذہب سے وابستہ ہو کر اس کا جزو لاینفک بن گئی تھیں آج مردہ، اور زرد۔ زرد پتیوں کی طرح شجر اسلام سے گرنا شروع ہو گئی ہیں اور وہ زمانہ قریب ہے کہ ہم اس شجر کو پھر پھلتا اور پھولتا دیکھیں۔ اسلام کے حدود کے اندر آج تغیرات پیدا ہو رہے ہیں۔ جنکو آج سے بیس برس قبل قیاس کرنا تک محال معلوم ہوتا تھا۔ افریقہ۔ ایشیا۔ اور یورپ کی تمام اسلامی ریاستیں ایک نئی روح اور ایک نئی جان سے لبریز نظر آتی ہیں، مگر ہر ریاست کا مطمح نظر سیاسی ہے، نہ کہ مذہبی۔ خلافت کا صفحۂ عالم سے دور ہونا ایسا ہی ہوا جیسا کہ رومن امپائر کا پارہ پارہ ہونا ہوا تھا۔ رومن امپائر کی تباہی نے دیگر ریاستوں میں جان ڈالدی تھی، اسی طریقہ سے خلافت کا فنا ہونا دیگر اسلامی ریاستوں کی حیات کا باعث ہے۔ سلطان عبدالحمید کے زمانہ اسلام کا مستقبل نہایت تاریک تھا، آج وہ تاریکی رفتہ رفتہ گو دور ہو رہی ہے، لیکن اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ تاریکی کس طرح دور ہو رہی ہے؟ خطبہ میں محض عربی عبارت پڑھکر سامعین کو خواب گراں کی تلقین کرنا، پردہ کی دیواریں بلند تر کرکے مستورات کو ملکی اور ملی تعلیم سے بیخبر رکھنا، کثرت ازدواج کو قوم کی بداخلاقی اور ناداری کا وسیلہ بنانا، حضرت مسیح کو آسمان کا ساکن سمجھنا، سود لینا حرام جاننا، اور دنیا مجبوری، قرآن پاک کی تعلیم کو پیچیدہ سے پیچیدہ تر بنانا، اسلام اور عقل میں دشمنی پیدا کرنا۔ مذہب کو نہ

---

(1) When Ibsen said that the hope of the world lay in the woman & the workers he was neither a sentimentalist nor [illegible] demagogue !! Shaw

(Scientific طریقہ سے سمجھنا اور نہ اپنے خیالات میں بلندی اور وسعت پیدا کرنا۔ یہ ہیں شاید وہ طریقہ جو آج کل عالم اسلام میں بیداری پیدا کر رہے ہیں!

ذرا اگر آپ غور فرمائیں گے تو صاف پتہ چل جائے گا کہ مسلمانوں نے سبق زمانہ سے لیا تو ضرور، مگر ہمیشہ سخت ترین نقصانات اٹھانے کے بعد۔ ٹرکی حکومت کا ٹکڑا ٹکڑا اغیار کے ہاتھوں میں چلا جاتا ہے، یہاں تک کہ خود قسطنطنیہ اور استمبول پر بیرونی افواج قابض ہو جاتی ہیں۔ اُسکے بعد ٹرکی نیند سے بیدار ہوتی ہے اور مصطفےٰ کمال پاشا منصۂ شہود پر آتے ہیں۔ مصر نے جب تک اپنی نصف سے زائد آزادی، نہر سوئز (Suez) اور تجارتی (concessions) اغیار کو نہ دیدئے زاغلول پاشا کا پیدا ہونا محال ہو گیا تھا۔ اسی طریقہ جبتک روس اور برٹش کی ریشہ دوانیاں ایران میں اچھی طریقہ سے کامیاب نہ ہوگئیں رضا خاں پہلوی دنیا میں آہی نہ سکے، اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ہماری قدامت پرستی ہی ہماری سب سے بڑی دشمن ہے اور جبتک ہم اس اہرمن کو پامال نہ کریں گے ہماری سیاسی فلاح کی اُمید ایک امید موہوم ہے۔

"اسلام[1] کی یہ کوشش کہ وہ بنی نوع انسان کو ایک ہی جھنڈے کے نیچے لے آئے" ناکام ہو چکی، اور اسلام کا پیغام دنیا کی آبادی کے لئے پوری طرح تسکین بخش نہ ہو سکا۔ وہ مذہبی عقیدہ جو اس تہذیب کا بنیادی پتھر ہے ایک بڑی تعداد کے لئے ناکافی ہے، اور اُس نظامِ قانونی نے جو ایک عالم کے انسانوں پر اٹل ضوابط کی مدد سے حکومت کرنا چاہتا تھا یہ صاف ظاہر کر دیا کہ وہ کہاں سے اخذ کیا گیا ہے ......" مگر اس خیال کے باوجود میں یہ ماننے کے لئے طیار نہیں ہوں کہ اسلام کا پیغام کل عالم کے لئے تشفی کا باعث نہیں ہو سکتا۔ موجودہ صورت میں تو خود اسلام کے نام لیوا اُس سے بددل ہیں، لیکن اگر ہم اس کا جوہر حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں اور غیر تندرست فروعات کو کاٹ ڈالیں تو یقین کامل ہے کہ یہ پیغام نہ صرف کافی ہوگا بلکہ دنیا کی ساری بین الاقوامی کوششوں پر حاوی ہو سکتا ہے۔ اور ناممکن ہے کہ اسلام کی شانِ جمہوریت

"ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز"

دنیا کی زبردست اور زیردست قوموں کو اپیل نہ کرے۔ دنیا کی سوسائٹی آف فرینڈز[2] لیگ آف نیشنس اور لیگ آف ڈس آرمامنٹ، یہ ساری جماعتیں اور ان جماعتوں کی ساری کوشش اسلام کی حدود میں اچھی طرح سرسبز ہو سکتی

---

[1] Prof: C. S. Hurgronje کا یہ خیال ہے

[2] Quakers Society.

ہیں۔ مگر اس سے قبل اسکی ضرورت ہے کہ ہم اپنے مکان کی اچھی طرح مرمت کریں اور اس کی چار دیواری کے اندر
جو خار و خاشاک اٹ گیا ہے اُسے دور کردیں۔ اسلام کی تعلیم دنیا کی بہترین تعلیم ہے، لیکن جس عنوان سے وہ آج
پیش کیجارہی ہے وہ شدت سے ناقص اور ترمیم طلب ہے[۵۱]

زمانہ نے آج جو اسلام کے ساتھ سلوک کیا ہے وہ تقریباً ہر مذہب کے ساتھ کیا جاچکا ہے،
کیونکہ یہ فطری امر ہے جس سے ہم رہائی حاصل نہیں کرسکتے، ہندو مذہب میں بھی امتداد وقت نے ہزارہا تغیرات پیدا
کردیے ہیں۔ یہاں تک کہ اب یہ کہنا دشوار ہوگیا کہ اس مذہب کی اصلی تعلیم کیا ہے۔ چنانچہ اس مذہب کی ایک اصلاحی
کوشش نے بدھ مت کی صورت اختیار کی، اور آگے چلکر برہمو سماج اور آریہ سماج اُس اصلاح کے ....
پیدا ہوئے، یہ جسقدر تحریکیں ہیں دراصل کوششیں ہیں ایک ایسے مذہب کو درست کرنیکی جو زمانہ کے ہاتھوں سے مسخ ہوگیا
تھا، عیسائیت کو لیجئے، اُس میں بھی بہت سی اصلاحات کرنیکی ہر زمانہ میں ضرورت پیش آئی، اور یہ اصلاحات وقتاً فوقتاً
ہوتی رہیں۔ ریفارمیشن کیا شئے تھی، لوتھر کے ناقوس سے کیا آواز آتی تھی، پروٹسٹنٹ فرقہ نے ایک جداگانہ شان کیوں اختیار
کی، انگلستان کے ([illegible]) کا کیا مقصد تھا، اور یہ ([illegible]) کون لوگ ہیں، اور کیا
چاہتے ہیں؟[۵۲] مگر ہمیں ان مذاہب پر ایک بڑی فوقیت حاصل ہے، وہ یہ ہے کہ اُنکی الہامی کتابیں ناقص ہیں اور اُنمیں

---

۵۱ لیگ آف نیشنس کی دقتوں کا ذکر کرتے ہوئے مس رتھ فرائی (Miss Ruth Fry) نے ڈبن میں ۱۵ر جنوری سنہ ۳۱ء
کو تقریر کرتے ہوئے یہ بیان کیا تھا:۔ "The difficulty with the league was that
if ambraced so many nations so many different
types, & temperaments that it was very difficent to come to some agreement"
مگر مس موصوف کو شاید یہ علم نہیں ہے کہ ان دقتوں کے باوجود اسلام کی لیگ آف نیشنس تیرہ سو سال سے موجود ہے جسکا سالانہ جلسہ مکہ شریف میں منعقد
ہوتا ہے، جو اگر ذرا اور مرتب کرلیا جائے تو یقین ہے کہ جنیوا کے لیگ سے زیادہ کامیاب ہوگا۔ دراصل اسلام ہی ایک ایسی انسٹیٹیوشن ہے جو World
peace کو قائم رکھنے میں کامیاب ہوسکتی ہے! (مس موصوف لیگ کے لندن برانچ کی انتظامیہ کمیٹی کی مشہور و معروف ممبر ہیں۔)

---

۵۲ Rev. W. R. Inge. K.C.V.O. Says in his latest book
Christian Ethics & Modern problems!!
We need a new type of Christianity, more
Ethical, more mystical, and less dogmatic than the traditional forms!!

اکثر مقامات پر تحریفیں کر دی گئی ہیں، اور ہمارا قرآن پاک ابتک اُسی صورت میں بجنسہ موجود ہے جس صورت میں وہ (Revealed) ہوا تھا۔ اس لئے ہمیں صرف اس قدر اصلاح کرنے کی ضرورت ہے کہ ہم قرآن پاک کی عبارت کا صحیح مفہوم سمجھیں، اس پر عمل پیرا ہوں۔ غیر معقول تعلیم کو جو مذہب کے پردے میں پیش کی جاتی ہے، اپنے دلوں سے دور کرکے اسلام کو سائنٹیفک بنیاد پر استوار کریں، جو ہمارا اولین فرض ہے۔

مولانا حالی مرحوم نے علمائے وقت کی جو تصویر اپنے مسدس میں کھینچی ہے وہ میرے ذہن میں موجود ہے، اور مجھے خوف ہے کہ میری یہ ہرزہ سرائی بعض حلقوں میں وہی منظر پیدا کرنے میں کامیاب ہو گی، مگر میری صرف ایک گذارش ہے، جسپر مجھے امید ہے کہ تنقید فرمانیوالے علماء توجہ فرمائیں گے، وہ یہ ہے

"اے شیخ! گفتگو تو شریفانہ چاہیئے!"

آپ میرے جیب و گریباں کے ضرور پرزے اُڑایئے، لیکن اخلاق کے بلند معیار کو نیچے نہ گرنے دیجئے، اسکے بعد تو پھر

"تو مشقِ ناز کر، خونِ دو عالم میری گردن پر"

عبدالشکور۔ ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی (علیگ)

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنفوانِ شباب کا لکھا ہوا افسانہ جس میں پاکیزگی بیان، اسلوب ادا، ندرت خیال، اور جدت اظہار کے ایسے ایسے نادر نمونے موجود کہ کسی ادبی تصنیف میں نہیں مل سکتے، حسن و عشق کی تمام لذت بخش کیفیات اسکے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں۔

قیمت علاوہ محصول۔ دس آنے (۱۰ر)

مینجر "نگار" لکھنؤ

سوبھا

بچی کا نام سوبھاشنی تو رکھدیا گیا، لیکن کون کہہ سکتا تھا کہ یہ بڑی ہو کر واقعی گونگی ہوگی۔ اُسکی بڑی بہنوں کے نام سوکھیشنی اور سوہاشنی تھے۔ اُس کے باپ نے قافیہ کا خیال کرکے سب سے چھوٹی لڑکی کا نام سوبھاشنی رکھدیا۔ پیار میں اسے لوگ سوبھا کہتے تھے۔ اُس کی بڑی بہنوں کی شادیاں کرنے میں جو مشکلیں پیش آئی تھیں۔ وہی کیا کم تھیں کہ دستِ قدرت کا یہ عطیہ والدین کے لئے بار نہ ہوتا۔ اکثر لوگوں کا یہ خیال تو تھا کہ چونکہ وہ گونگی ہے اس لئے وہ احساسات سے بے بہرہ ہے۔ لیکن اُس کو بچپن ہی سے اس کا احساس تھا کہ وہ والدین پر ایک بار ہے، اور اسی لئے اُس نے عزلت نشینی اختیار کرلی تھی۔ اُس کو خوشی ہوتی اگر لوگ اُسے بھول جاتے، مگر تکلیف اور مصیبت کو کون بھولتا ہے۔ درد کا احساس کسکو نہیں ہوتا۔ اُس کے والدین کی راتیں اور دن اُسی کے خیال میں گذرتے۔ اُس کی ماں کو زیادہ فکر تھی۔ ماں کے لئے بہ نسبت لڑکے کے لڑکی زیادہ اُلنس کا باعث ہوتی ہے اور لڑکی کا کوئی ادنےٰ سا عیب اور معمولی سی خرابی بھی خود اُسکے لئے باعث شرم ہوتی ہے۔ پانی کنتھا، اُس کا باپ اُس سے بہ نسبت دوسری لڑکیوں کے زیادہ محبت کرتا، لیکن اُس کی ماں اُس سے بُری طرح نفرت کرتی اور اس کو حقیر جانتی تھی، اور گویا اُسے اپنے وجود کے لئے ایک بدنما داغ اور ننگ خیال کرتی تھی۔ اگر سوبھا کے دماغ میں کوئی بات آتی اور اُسے ظاہر کرنا چاہتی تو اُس کے خوبصورت ہونٹوں میں حرکت ہوتی۔ جیسے خوب صورت پتیاں ہلتی ہوں، اور اُس کی کالی کالی بڑی بڑی آنکھیں جن پر گھنی بھویں تھیں حرکت میں آجاتیں۔ جب ہم کسی خیال کا الفاظ میں اظہار کرنا چاہتے ہیں تو الفاظ جلد دستیاب نہیں ہوتے اور خیالات کی ترجمانی میں اکثر غلطیاں ہوجاتی ہیں۔ پھر ہمارا ذہن ترجمانی کا عمل شروع کرتا ہے، لیکن کالی آنکھوں کو ترجمانی کے عمل کی کوئی ضرورت ہی نہیں۔ دماغ خود ہی ان میں ایک مخصوص چمک پیدا کردیتا ہے، ان آنکھوں میں خیالات آتے بھی ہیں۔ ٹھہرتے بھی ہیں۔ چمکتے بھی ہیں اور دھندلے اور تاریک بھی ہوجاتے ہیں۔ کبھی چاند کی طرح ڈوبتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں، کبھی ایک جگہ جم کر رہ جاتے ہیں اور کبھی تیز رفتار اور بیقرار بجلی کی طرح آسمان کے گوشہ گوشہ کو جگمگا دیتے ہیں۔

وہ ہستیاں جو بچپن ہی سے اپنے خیالات کا اظہار ہونٹوں کی حرکت کے سوا اور کسی طرح نہیں

کر سکیتں، آنکھ سے بات کرنا جانتی ہیں جن میں طلوع صبح بھی موجود ہے اور غروب خورشید بھی جن میں نور بھی کھیلتا ہے اور ظلمت بھی۔ جس طرح قدرت کی شان و شکوہ خاموش ہے اسی طرح گونگے بھی۔ ایک شانِ خاموشی کے مالک ہیں۔ سوبھا کی ہمجولیاں اُس سے خوف زدہ سی رہتیں اور سوبھا خود بھی دوپہر کے سناٹے کی طرح بغیر کسی ہمجولی یا سہیلی کے خاموشی سے دن گذار دیتی۔

وہ چاندی پور کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں رہتی تھی، وہ دریا جس کے ساحل پر گاؤں واقع تھا، بنگال کے دوسرے دریاؤں کے مقابلہ میں چھوٹا تھا اور اپنے تنگ کناروں میں اس طرح مقید تھا کہ گویا وہ کسی اور خاندان کی ایک لڑکی ہے، آزادیوں سے محروم، اور خود مختاریوں سے بے نصیب! اس دریا میں کبھی سیلاب نہیں آتا تھا اور اپنے فرائض کو اس طرح انجام دیتا جیسے یہ بھی اُن گاؤں کے ہر ایک خاندان کا ایک فرد ہے جو اس کے کناروں پر واقع ہیں۔ کنارے درختوں اور مکانات سے سایہ دار تھے۔ ایسا معلوم ہوتا کہ ایک شاہزادی اپنے شاہی تخت سے اُتر کر دریا کے بھیس میں ہر گھر کے لئے باغوں کا ایک فرشتہ بن گئی ہے جو نہایت تیزی اور مسرت کے ساتھ اپنا نہ ختم ہو سکنے والا کام جاری رکھے ہوئے ہے۔

بانی کنٹھا کا مکان ٹھیک دریا کے کنارے واقع تھا۔ قرب و جوار کی ہر جھونپڑی اور ہر مکان کشتیوں کے مسافروں کی نظروں سے گذرتا تھا۔ میں نہیں جانتا کہ ان دل فریب مناظر کے ساتھ ساتھ کسی نے کبھی اُس لڑکی کو بھی دیکھا تھا جو اپنے کام کو ختم کر چکنے کے بعد دریا کے کنارے آبیٹھتی تھی۔ یہاں قدرت خود ہی اُس کے لئے خیالات کا سلسلہ ڈھونڈتی اور خود ہی اُس کے لئے بولتی۔ دریا کی روانی کی آواز، گاؤں کے باشندوں کا شور۔ ملاحوں کے گیت۔ چڑیوں کے خوش الحان نغمے۔ درختوں کی سنسناہٹ اُس کے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ ہم آواز ہو جاتے۔ اور اُس کے بیقرار دل سے جا کر ٹکراتے۔ مناظر قدرت کی یہی لطیف اور نرم آواز اس گونگی لڑکی کی گفتگو تھی اور اُس کی کالی آنکھوں کی تقریر جن پر گھنی بھویں سایہ کئے ہوئے تھیں اُس دنیا کی آواز تھی جو اُس کے آس پاس تھی۔ اُس وقت اُن درختوں سے لے کر جہاں چڑیاں شور کر رہی تھیں آسمان کے خاموش ستاروں تک سوا اشارات اور گفتگو اور بجز آہ و زاری کے اور کوئی چیز نہ تھی۔

ٹھیک دوپہر کو جب ملاح کھانا کھانے چلے جاتے۔ جب گاؤں کے لوگ سوتے اور چڑیاں خاموش ہو جاتیں۔ جب کشتیوں پر کاہلی چھا جاتی۔ جب مشغول دنیا دم لیتی۔ آہ! کتنا دردناک اور افسوسناک منظر ہوتا کہ اُس وقت لمبے اور چوڑے آسمان کے نیچے ایک گونگی لڑکی ہوتی، اور دوسری فطرتِ گنگ۔ ایک خورشید عالم افروز کی روشنی میں اور دوسری وہاں، جہاں ایک درخت سایہ کئے ہوتا۔

لیکن یہ نہ تھا کہ سوبھا کا کوئی دوست ہی نہ ہو۔ دو گائیں تھیں سرارب بھاشنی۔ پنگولی نامی کہ ہر چند

انھوں نے اس کے ہونٹوں سے کبھی اپنے نام نہیں سُنے۔ لیکن وہ اُس کے قدموں کی آہٹ سے اُسے پہچان لیتیں وہ پیار اور محبت کے ساتھ کچھ زیر لب بڑبڑاتی اور گو ان سے کوئی مفہوم نہ بنا سکتی۔ لیکن وہ اس بڑبڑاہٹ ہی کو تقریر سے بڑھ کر سمجھ لیتیں اور جب سوبھا ان کو ڈانٹتی تو وہ اُس کا مطلب انسانوں سے زیادہ سمجھتیں کبھی اُن کے پاس جاتی اور سارب بھاشنی کے گلے میں باہیں ڈال دیتی اور اپنے گال اُس کے گال پر رکھ دیتی پنگولی محبت بھری آنکھیں اُسکی طرف اُٹھا کر دیکھتی اور پیار سے اُس کے رخساروں کو چاٹتی۔ لڑکی معمولاً دن میں تین بار اُس کے پاس جاتی۔ اور جب وہ ایسی باتیں سنتی جو اُسے تکلیف دیتے تو وہ اپنی انھیں دونوں گونگی سہیلیوں کے پاس غم غلط کرنے کے لئے چلی آتی۔ چاہے وہ وقت اُس کے لئے موزوں ہوتا یا نہ ہوتا۔ وہ بھی اس کے مضمحل اور رنجیدہ چہرہ سے اس کے جذبات کا اندازہ لگا لیتیں۔ اُس کے نزدیک آکر وہ اپنی سینگوں کو آہستہ آہستہ اُس کے بازوؤں سے ملتیں اور گونگی معمہ والی زبان ہی سے یا اپنے خاموش اور ناقابل فہم طریقوں سے کوشش کرتیں کہ اُسکی تسلی کریں۔ اُن کے علاوہ چند بکرے اور ایک مرغی کا بچہ بھی تھا۔ لیکن سوبھا کو ان سے دلبستگی اور ویسا انس نہ تھا۔ حالانکہ ان کی طرف سے بھی ویسی ہی ہمدردی پائی جاتی تھی۔ جب کبھی مرغی کے بچے کو موقع ملتا وہ اس کی گود میں کود کر آجاتا اور اُس کی گود میں آرام کی نیند سونے کی کوشش کرتا، اور جب سوبھا اپنی ملائم اور پتلی اُنگلیوں سے اُس کی گردن اور پیٹھ کو سہلاتی تو وہ اس کو لوری سمجھتا اور بہت خوش رہتا۔ اشرف المخلوقات میں بھی ایک شخص یعنی گوسائیں کا سب سے چھوٹا لڑکا پرتاب جو ذرا کاہل بھی تھا اُس سے انس رکھتا تھا۔ سمجھ میں نہیں آسکتا کہ اُس کے تعلقات سوبھا سے کس قسم کے ہوسکتے تھے جب وہ بول بھی سکتا تھا۔ پرتاب کے ماں باپ نے اگرچہ بہت کوشش کی کہ اُسکی کاہلی دور ہو اور کچھ زندہ دلی اُس میں آجائے۔ وہ کچھ کمانے لگے۔ لیکن سب بے سود۔ بالآخر ان دونوں کو اس کی جانب سے پوری مایوسی ہو گئی۔ بیکاروں کا بھی عجیب حال ہے کہ گو اپنے خاندان میں حقارت سے دیکھے جاتے ہوں لیکن یہ بات اُن کے سوا کسی دوسرے کو حاصل نہیں کہ اپنے خاندان کے علاوہ ہر شخص کے نزدیک وہ بہت ہر دلعزیز ہوتے ہیں۔ انکے پاس کوئی مشغلہ تو ہوتا نہیں لہذا ان کی حیثیت ایک مشترکہ ملکیت کی سی ہوتی ہے۔ ٹھیک جسطرح کہ ایک شہر میں ایک کھلے میدان کی ضرورت ہوتی ہے۔ جہاں ہر ایک اطمینان کی سانس لے سکے، اسی طرح ایک گانوں میں دو تین ایسے آدمیوں کی بھی ضرورت ہوتی ہے جو گانوں کے ہر باشندہ کو اپنا کچھ وقت دے سکیں کہ اگر اُس وقت ہم کاہل ہوں اور ہمیں ایک ساتھی کی ضرورت ہو تو ایک ساتھی ہمیں مل جائے۔ پرتاب کا محبوب ترین مشغلہ مچھلیوں کا شکار تھا۔ اسی طرح سے اُس کا بہت سا قیمتی وقت ضائع ہو جاتا۔ ہر روز دوپہر بعد وہ اس کام میں ضرور منہمک نظر آتا اور یہی وہ وقت ہوتا جب وہ اکثر سوبھا سے ملتا۔ وہ جیسا بھی ہو لیکن اسے ایک

ساتھی کی خواہش ہوتی اور جب کوئی مچھلیوں کا شکار کرتا ہے تو اس کے لئے ایک خاموش ساتھی سب سے بہتر ہے۔ پرتاب کے دل پر سوبھا کی خاموشی نے گھر کر لیا اس لئے وہ اُس کی عزت کرتا تھا۔ ہر ایک تو اسے سوبھا کہتا لیکن وہ اپنی محبت کا اظہار ''سو'' کہکر کرتا۔ سوبھا ایک املی کے درخت کے نیچے بیٹھا کرتی اور پرتاب اُس سے کچھ ہی فاصلہ پر۔ پرتاب اپنے ہمراہ پان لاتا اور سوبھا اُسے پان بنا بنا کر دیا کرتی۔ میں خیال کرتا ہوں کہ مسلسل بیٹھے بیٹھے اور ٹکٹکی باندھ کر اُدھر دیکھتے رہنے سے فطرتاً سوبھا کے دل میں خیال ہوا ہوگا کہ وہ پرتاب کو کسی قسم کی مدد دے اور اُس کی اعانت کرے جو فی الواقعی اعانت ہے۔ لیکن اس کا کوئی موقعہ نہ ملتا تھا، وہ کیا کر سکتی تھی۔ صرف ایک تدبیر تھی، اور یقیناً وہ آخری تدبیر تھی۔ اُس نے گڑگڑا کر دعائیں مانگیں کہ کوئی ایسی طاقت اس میں پیدا ہو جائے جس سے وہ ایک معجزے کی طرح پرتاب کو حیرت سے یہ کہنے پر مجبور کرے کہ ''اچھا! میں نہیں جانتا تھا، میری ''سو'' یہ کچھ کر سکتی ہے۔''

ذرا غور تو کیجئے اگر سوبھا ایک دریائی دیوی ہوتی اور آہستگی سے دریا سے ظاہر ہوتی اور اپنے ساتھ ''سانپ'' کے سر کا من نکال لاتی۔ تب پرتاب یقیناً مچھلیوں کا شکار ترک کر دیتا اور زمین کے نیچے کی دنیا میں جا کر زندگی بسر کرتا تو وہاں وہی بانی کنتھا کی گونگی لڑکی ''سو'' اُسے نظر آتی جو چاندی کے محل میں ایک سنہرے تخت پر بیٹھی ہوتی۔ ہاں یہی ''سو'' اُس جواہر کی دنیا کے بادشاہ کی اکلوتی لڑکی سمجھی جاتی لیکن یہ نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ ناممکن تھا۔ نہ اس وجہ سے کہ کوئی چیز فی الواقع ناممکن ہے۔ بلکہ سو بانی کنتھا کے گھر میں پیدا ہوئی تھی نہ کہ پتال پور کے شاہی خاندان میں پس اُس کے لئے بظاہر کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ جس سے وہ گوسائیں کے لڑکے کو تعجب میں ڈالتی وہ اب بڑی ہو چلی تھی اور رفتہ رفتہ اپنے کو سمجھنے لگی تھی۔ اُس نے اپنی حالت کا اندازہ کرنا سیکھا۔ اُس کے خیالات میں ایک ناقابل اظہار ہیجان شروع ہوا۔ جیسے سمندر میں طوفان اُٹھتا ہے اُس وقت جب چاند کامل ہو جاتا ہے۔ اُس نے اپنی حالت کو دیکھا۔ خود دل سے کچھ سوالات کئے لیکن اطمینان کے قابل جواب اُسنے نہ پایا۔

ایک رات جب چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ اُس نے آہستگی سے اپنا دروازہ کھولا اور خوفزدہ ہو کر باہر جھانکا۔ قدرت، خود بھی افسردہ سوبھا کے مانند خاموش زمین کی طرف چاند کی دل فریب روشنی سے دیکھ رہی تھی۔ سوبھا کا بچپن ملا شباب اُس کے اندر جوش مار رہا تھا۔ شادمانی اور افسردگی دونوں سے اُس کا دل لبریز تھا۔ اس سے پہلے بھی وہ بہت افسردہ رہتی۔ لیکن افسردگی کا احساس اُسوقت اپنے انتہائی نقطہ پر تھا۔ اُس کا دل اس قدر غم سے بھرا تھا کہ وہ بول نہ سکتی تھی۔ مادر فطرت کی آغوش میں جو اسوقت غمگین تھی اور خاموش وہ گونگی لڑکی بھی غم اور خاموشی کی مجسم تصویر بنی ہوئی تھی۔

اس کے شادی کے خیال نے اس کے والدین کو زیادہ پریشان کر رکھا تھا۔ لوگ ان کو طعنے

دنیتے یہانتک کہ ان کو ذات سے باہر کرونیے کی دھمکیاں دینے لگے۔
بانی کنتھا خوشحال تھا۔ اس کے گھر میں دونوں وقت مچھلی کا سالن پکتا۔ یہ وجوہ بھی تھے کہ لوگ اسکے دشمن ہوگئے تھے۔ اسکے علاوہ گانوں کی عورتیں بھی مداخلت کرنے لگیں تو بانی کنتھا کچھ دنوں کے لئے کہیں باہر چلا گیا۔ ایک دن پکایک وہ آیا اور اُس نے کہا کہ ہم کو کلکتہ چلنا چاہیئے۔ آخرکار انھوں نے کلکتہ جانا طے کیا تا کہ افکار سے کچھ دن کے لئے تو نجات پائیں۔ سوبھا بہت مغموم تھی۔ آنسو ڈبڈبائے ہوئے تھے اور وہ بالکل لہرآلود صبح کے مانند ہوگئی۔ مدتوں سے جو خوف اس کو لگا ہوا تھا اس کی وجہ سے وہ اپنے والدین کا مطلب نہ سمجھ سکی۔ اپنی بڑی آنکھوں سے جن سے حیرت کا اظہار ہوتا تھا۔ اُس نے اپنے والدین کی طرف دیکھنا شروع کیا جیسے کہ وہ کوئی بات معلوم کرنا چاہتی ہو لیکن انھوں نے ایک لفظ کا بھی اظہار نہیں کیا۔ ایک سہ پہر کو، مچھلی کے شکار کے دوران میں پرتاب ہنسا اور ذرا تمسخر کے ساتھ اُس نے سوبھا سے کہا" ہاں تو سوبا تمہارے والدین نے تمہارے رفیق عمر کی تلاش کر لی ہے اور تمہاری شادی شاید عنقریب ہونیوالی ہے مجھے بالکل بھول نہ جانا" یہ کہکر اس نے پھر مچھلی کے شکار کی جانب اپنا رُخ کیا۔ جسطرح ایک زخمی ہرنی۔ صیاد کے چہرے کو دیکھتی ہو جسکا مقصد یہ ہوتا ہے کہ "بیٹے آخر کونسا کام تمہیں تکلیف پہنچانے کیلئے کیا تھا" بالکل اسی طرح سوبھا نے پرتاب کی طرف دیکھا اُسدن اس واقعہ کے بعد وہ درخت کے نیچے نہیں بیٹھی۔ وہ سیدھی اپنے باپ کے پاس گئی۔ وہ اپنے آرام کے کمرے میں تمبا کو نوشی کر رہا تھا۔ وہ اسکے قدموں پر گر پڑی اور اُس نے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کیا۔ بانی کنتھا نے اُسکو اطمینان دلانیکی کوشش کی۔ اس کے رخسارے خود آنسوؤں سے تر تھے۔ ایکدن یہ طے پایا کہ دوسرے دن وہ کلکتہ کو روانہ ہوجائیں گے۔ سوبھا اپنی گایوں سے جو اسکی بچپن کی سہیلیاں تھیں رخصتی ملاقات کرنے گئی۔ اُس نے انھیں اپنے ہاتھ سے چارہ دیا۔ اُنکے چہروں کیطرف دیکھا اور اُن آنکھوں سے جو اسکے لئے زبان کا کام کرتیں۔ آنسوؤں کی دھار بہ نکلی۔ چاند کے مہینے کی دسویں شب تھی۔ سوبھا اپنے کمرے سے نکلی۔ اور دریا کے کنارے گھاس کے ہرے فرش پر جا بیٹھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اپنی خاموش ماں زمین کی آغوش میں جا گری۔ گویا سوبھا یہ کہنا چاہتی تھی کہ "اے ماں کوئی تدبیر کرو کہ ہم جدا نہ ہوں۔ مجھے اپنی آغوش میں لیلے اور سینہ سے لپٹا لے جسطرح کہ بیٹے تیرے گلے میں باہیں ڈالدی ہیں اور مجھے مضبوط پکڑلے۔"
ایک دن کلکتہ کے ایک گھر میں سوبھا کی ماں نے اُس کو خوب بنایا سنوارا اس نے اُسکے بالوں کی خوب صورت لٹیں بنائیں۔ اس نے زیور سے اُس کو آراستہ کیا اور جہانتک اس سے ہوسکتا تھا اس نے اُسکی قدرتی خوبصورتی اور پیدائشی حسن کی دل فریبی ختم کرنے کی کوشش کی۔ سوبھا کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ اُس کی ماں نے یہ خیال کرکے کہ کہیں اُس کی آنکھیں روتے روتے سرخ نہ ہوجائیں ذرا سختی سے اُسے ڈانٹا۔ لیکن آنسو اس کے بس کے نہ تھے۔ سوبھا کا ہونیوالا رفیق اپنے ایک دوست کے ہمراہ اپنی رفیقہ

حیات کو دیکھنے آیا۔ اُس وقت سوبھا کے والدین پر ایک رنگ آتا تھا ایک رنگ جاتا تھا۔ انکے چہروں پر امید اور مایوسی دونوں کے نشانات ہویدا تھے۔ آنے والا دیوتا اپنی قربانی اور بھینٹ کی چیز نظر انتخاب سے دیکھ رہا تھا۔ پردہ کے پیچھے ماں نے لڑکی کو بہ آواز بلند ضروری ہدایتیں کرنی شروع کیں۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ اسکو سُنے آنسوؤں کی لڑیاں دوچند اور سہ چند ہو گئیں۔ اس سے سوبھا کے رفیق حیات نے اس کو دیکھکر نتیجہ نکالا! "ایسی بُری تو نہیں ہے"۔

اس نے اُس کے آنسوؤں پر خاص توجہ کی اور خیال کیا کہ اس کا دل نازک ہوگا۔ اس نے خیال کیا کہ وہ دل جو آج اپنے والدین کی جدائی کے خیال سے یوں غم کے آنسو گرا رہا ہے وہ کل کو اسکے لئے وفادار ثابت ہوگا۔ لڑکی کے ان آنسوؤں نے اس کو قیمتی اور عزیز بنا دیا۔ اُس کے بعد اس نے کوئی دوسری تنقید نہیں کی۔

نسبت طے پا گئی اور ایک خوشگوار دن دونوں کی شادی ہو گئی۔ اپنی گونگی لڑکی کو دوسرے کے ہاتھ میں دے کر باقی کنتھا اور اُس کی بیوی وطن کو لوٹ گئے۔ دونوں خدا کا شکر ادا کر رہے تھے کہ اب اُن کی دنیاوی اور دینی دونوں نجات کا ٹھکانا ہو گیا۔ داماد بلاد مغرب میں کہیں تجارت کرتا تھا۔ اس لئے وہ کچھ دنوں بعد اپنی بیوی کو اپنے ساتھ لے گیا۔

دس ہی دن کے عرصہ میں سب نے جان لیا کہ دلہن گونگی ہے۔ کسی کا قصور ہو یا نہ ہو لیکن اُسکا قصور تو یقینی نہ تھا۔ کیونکہ خود اُس نے کسی کو دھوکا نہیں دیا تھا۔ اُس کی ہر ایک سے تمام واقعات کا انکشاف کرنا چاہتیں مگر کوئی سمجھتا ہی نہیں تھا۔ وہ ہر ایک کی طرف دیکھتی لیکن اُس کے زبان نہ تھی۔ اب اسکو محسوس ہوا کہ وہ اپنے تمام لوگوں سے چھوٹ گئی ہے جو بچپن سے اُس کو جانتے اور اس کی زبان پہچانتے تھے اُس کے خاموش دل میں گریہ وزاری کا ایک زبردست طوفان اُٹھ رہا تھا۔ جس کی آواز نہ تھی اور جس کو صرف عالم الغیب ہی سن سکتا تھا۔ (ٹگور)

سید فرید جعفری

نگارستان

(دوسرا اڈیشن) جس میں حضرت نیاز کے اور متعدد ادبی مضامین اور افسانے شامل کئے گئے ہیں۔ قیمت (عہ)

مینیجر "نگار" لکھنؤ

نہ ملے۔ ان میں سے چند برتن ایسے تھے کہ جن میں مخصوص طور پر خانصاحب کھانا کھاتے تھے۔ صفیہ بیچاری میں اتنی کہاں طاقت تھی کہ وہ خانصاحب کی منظورِ نظر نوکرنیوں کو برتنوں کی تلاش کے واسطے کہتی۔ چار و ناچار خود اٹھی اور باہر تلاش کرنے گئی۔ لیکن جب وہ باہر کے کمرہ میں پہونچی تو ایک عجیب منظر دیکھا کہ خانصاحب گھر کی نوجوان کھلائن کے گلے میں ہاتھ ڈالے مزے کی نیند سو رہے ہیں۔ اُس کا کلیجہ دہک سے ہو گیا۔ اب نہ قدم آگے بڑھتا تھا نہ پیچھے۔ آخر ہزار دقت صفیہ دبے پاؤں واپس آگئی اور اپنے کمرے میں جاکر زار زار رونے لگی۔

عورت سب کچھ برداشت کر سکتی ہے۔ لیکن اپنے حقوق میں کسی دوسرے کو دست انداز نہیں دیکھ سکتی۔

اُسی وقت ملازمہ کے لڑکے سے خانصاحب کو بلوایا۔ دو تین مرتبہ تو خانصاحب نے پھر آنے کا بہانہ کرکے ٹال دیا۔ لیکن جب صفیہ برابر بلاتی رہی تو خانصاحب نہایت خشونت کے عالم میں تیوری پر بل ڈالے گھر میں آئے۔ صفیہ تو بھری بیٹھی تھی کڑک کر بولی کہ "کیا شریف ایسے ہی ہوتے ہیں۔ کیا عزت داروں کی یہی شان ہوتی ہے۔ انکار کی ضرورت نہیں آج میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے۔" خانصاحب صفیہ کی شرربار آنکھیں دیکھ کر ڈر گئے اور اُنھوں نے نرمی سے ٹالنا چاہا۔ لیکن جب صفیہ برابر برا بھلا کہتی رہی تو کڑک کر بولے کہ "بس چپ رہ ورنہ تو جانے گی۔" صفیہ اس وقت غضبناک شیرنی ہو رہی تھی چلا کر بولی "نہیں نہیں میں نہ چپوں گی۔ ابھی تمام باتوں کا فیصلہ کراؤں گی۔ میں تم جیسے بدمعاش کے پاس ایک منٹ نہیں رہنا چاہتی۔" خانصاحب نے ایسی باتیں بھلا کب اپنی زندگی میں اپنے کانوں سے سنی تھیں۔ پاس ہی ایک بانس کا ٹکڑا پڑا تھا۔ اٹھا کر جو صفیہ کو مارنا شروع کیا تو ادھموا کر دیا۔ صفیہ پٹ رہی تھی۔ لیکن جو کچھ منہ میں آرہا تھا کہہ رہی تھی۔ اُس کی باتوں پر خانصاحب کا غصہ اور زیادہ ہوتا جاتا تھا۔ جب مارتے مارتے لکڑی ٹوٹ گئی۔ تو خانصاحب نے ہاتھ سے مارنا شروع کر دیا۔ اور اُس وقت تک مارتے رہے کہ صفیہ بیہوش نہ ہوگئی۔ صفیہ نہ معلوم کتنی دیر بیہوش رہی۔ جب اٹھی تو دور سے اُس کا روم روم ٹیسا جاتا تھا۔ گھڑی میں وقت دیکھا ساڑھے گیارہ بجے تھے۔ لوٹ کر عظیم کو تلاش کیا وہ کھری چارپائی پر پڑا سو رہا تھا۔ اُس کو اٹھا کر پیار کیا اور برقع اوڑھ کر گھر سے چل دی۔

(۳)

صفیہ کا دنیا میں کوئی ایسا عزیز موجود نہ تھا کہ جس کے ہاں وہ جاتی۔ مجبوراً اپنی ملانی کے ہاں تانگہ کرکے اُتر گئی۔ ملانی ایک غریب بیوہ عورت تھیں اُنھوں نے کبھی صفیہ کو قرآن پڑھایا تھا۔ ان کا ذریعہ معاش سلائی تھی۔ جب سے ملانی کے شوہر کا انتقال ہوا صفیہ برابر اُن کی مدد کرتی رہتی تھی۔

صفیہ کے ناگہاں آجانے سے وہ گھبرا سی گئیں اور پوچھنے لگیں۔ صفیہ نے پورا قصہ سنایا کہ:۔

"یوں اور اس طرح ارادہ کرکے نکلی ہوں کہ پھر کبھی ساری عمر اس گھر کا منہ نہ دیکھوں گی۔" ملانی نے تسلی دی کہ

"بیٹا تیرا گھر ہے۔ رہ مجھے کیا عذر ہے جو کچھ میسر آئے پہلے تو کہا بعد کو مجھے دینا۔"

دوسرے ہی دن سے صفیہ نے ملانی کا ہاتھ بٹانا شروع کر دیا اور سلائی کے کپڑے خود سینے لگی۔

(۴)

خانصاحب نے چند روز تو اپنے غصہ کی وجہ سے صفیہ کو بالکل تلاش نہیں کیا۔ لیکن بہت جلد ان کو معلوم ہو گیا کہ ان کے گھر سے صفیہ نہیں گئی بلکہ گھر کی برکت اور شگفتگی رخصت ہو گئی۔

تلاش سے خانصاحب کو صفیہ کی جائے رہائش کا علم ہو گیا۔ اب انھوں نے تجدید عہد کی کوشش شروع کی اور ملانی کے ایک عزیز کو درمیان میں ڈال کر معاملہ طے کرنا چاہا۔ لیکن صفیہ کسی طرح واپس آنے پر راضی نہ ہوئی۔ خانصاحب نے مختلف زور اور دباؤ ڈالے لیکن وہ اپنے فیصلہ پر اڑی رہی کہ:۔ "میں مہر معاف کرتی ہوں۔ مجھے طلاق دے کر آزادی دیجائے۔ میں ایسی زندگی گذارنا نہیں چاہتی۔ میں عورت بن کر رہ سکتی تھی۔ لونڈی بن کر نہیں۔ میں جھڑکیاں سہ سکتی تھی لیکن لات گھونسے کے برداشت کی مجھ میں طاقت نہ تھی اور نہ اب ہے۔ جو ہونا تھا سو ہو چکا اب نہ میں ان کے قابل ہوں اور نہ وہ میرے لائق۔"

جب خانصاحب کو صفیہ کی واپسی سے ناامیدی ہو گئی تو انھوں نے کوشش شروع کی کہ عظیم کو اس سے چھین لیا جائے تاکہ وہ اس طرح واپسی پر مجبور ہو۔ پہلے صفیہ کو روپیہ کا لالچ دیا۔ لیکن وہ ایسی عورت کہاں تھی کہ ان چالوں میں آتی۔ صاف انکار کر دیا کہ "ابھی عظیم ہرگز نہیں دیا جائے گا۔ یہ میں جانتی ہوں کہ ان کا بھی اس پر ایسا ہی حق ہے جیسا کہ میرا۔ لیکن وہ ابھی شیرخوار بچہ ہے بغیر ماں کے بے موت مر جائے گا۔ ہاں جب وہ جوان اور ہوش گوش کا ہو جائے تو اس کو اختیار ہے کہ چاہے وہ میرے پاس رہے یا ان کے پاس چلا جائے۔ اگر ان کا جی چاہے تو وہ اس کے مصارف برداشت کر سکتے ہیں۔ میں ان میں سے ایک پیسہ بھی اپنے اوپر لگانا حرام جانوں گی۔" خانصاحب مجبور ہو کر کوئی کام کرنا اپنی توہین جانتے تھے بھلا وہ کب اس بات پر راضی ہوتے۔ انھوں نے وکلاء سے مشورہ لیا تو انھوں نے بھی واپسی سے مایوسی ظاہر کی۔

(۵)

شوہر سے جدائی کے بعد صفیہ نے ۵ سال جس طرح گذارے اس سے اللہ ہی خوب واقف ہے۔ سلائیاں سیں، چکیاں پیسیں، فاقے کئے۔ لیکن اس دوران میں خانصاحب بالکل خاموش رہے۔ انھوں نے لوٹ کر یہ بھی نہ پوچھا کہ صفیہ مر گئی یا زندہ ہے۔

جب چھ برس ہونے آئے تو انھوں نے عظیم کے واپس لینے کی کوشش شروع کی۔ خانصاحب

کا ارادہ عظیم کو واپس لینے کا اس وجہ سے نہ تھا کہ ان کو عظیم کی یاد ستاتی تھی۔ بلکہ وہ اب، جو کچھ کرنا چاہتے تھے۔ صرف انتقام کی حیثیت سے تھا کیونکہ عظیم اُن کی آنکھوں سے دور رہنے کی وجہ سے دن ہوئے کہ ان کے گوشۂ خیال سے محو ہو چکا تھا۔ دوسرے انھوں نے پے در پے دو شادیاں کر لی تھیں جنکی وجہ سے ان کو عظیم کی پروا نہ رہی تھی۔ لیکن اُنھوں نے اپنے منتقمانہ جذبہ کو ٹھنڈا کرنے کے لئے دعویٰ دائر کر دیا۔

عظیم کئی دن سے بیمار تھا۔ سردی کا موسم تھا۔ مشینوں کی کثرت نے صفیہ کی آمدنی کو بھی گرا دیا تھا۔ کئی دن ہو گئے تھے کہ صفیہ کو کوئی کام نہ ملا تھا۔ آج اُس کو بے آب و دانہ تین دن ہو گئے تھے۔ سردی کا یہ عالم تھا کہ دل ٹھنڈا ہو کر بیٹھا جا رہا تھا۔ صفیہ عظیم کو سینہ سے لپٹائے ایک پتلی رضائی اوڑھے پڑی تھی۔ پیسہ پاس نہ تھا کہ عظیم کا علاج کرتی۔ خیراتی شفا خانہ میں بغیر مریض کو دیکھے اور حال سنے ڈاکٹر صاحب نے نسخہ لکھدیا۔ بھلا ایسی دوا کیا فائدہ کرتی۔

صفیہ رو کر کہنے لگی "مرے اللہ میں کیا کروں۔ ٹھنڈی ہوا میرے بچہ کی ہڈیوں میں گھسی جاتی ہے یہ بخار اور تین دن سے ایک دانہ بھی منھ میں نہیں گیا۔ دوائی گئی بھاڑ میں اگر ایک پیسہ کہیں سے مل جاتا تو چنے ہی اس کو کھلا دیتی۔ کچھ تو اس کو تسکین ہوتی۔ ہائے میں کیوں ایسی جلوں نصیب پیدا ہوئی کہ جسکی وجہ سے تجھ کو یہ تکلیف اُٹھانا پڑی۔"

اسی وقت دروازہ پر کسی نے آواز دی ملانی گئیں تو معلوم ہوا کہ چپراسی سمن کی تعمیل کرانے آیا ہے۔ صفیہ پڑھی ہوئی تھی۔ سمن دیکھتے ہی معلوم ہو گیا۔ "قہر درویش بر جان درویش" ناچار ایک پرت پر دستخط کر دئے۔"

کثرتِ مصائب انسان کو دلیر بنا دیتی ہے۔ اگرچہ صفیہ کے دل و دماغ اسوقت محشر راز ہو رہے تھے۔ اور اُس کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آج زمین و آسمان بدل گئے ہیں۔ لیکن اُٹھی اور گھٹری میں سے وہ پاجامہ نکالا جس کو پہنے گھر سے آئی تھی اور ملانی کو بیچنے کو دیا۔

سرِ شام وہ ملانی کو ہمراہ لے کر گھر سے نکلی۔ اور ایک ایک وکیل کے گھر جانا شروع کیا۔ لیکن اُس کی غربت کی وجہ سے کوئی الفاظی ہمدردی پر بھی تیار نہ ہوا۔ وہ رو رو کر اپنا قصہ سناتی اور اس قدر پُر درد الفاظ میں کہ اگر انسان سنتا تو اس کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا لیکن وہ انسانی طبقہ جس کی زندگی کا دارومدار انسانی گروہوں کی جنگ پر ہو وہ تقریباً اس قسم کے جذبات انسانیت سے معرا ہوتا ہے۔

صفیہ ناامید اور دل شکستہ ہو کر گھر واپس آ رہی تھی کہ راستہ میں ایک سائن بورڈ مولوی احتشام علی وکیل کا اُس کو نظر پڑا۔ اُس نے کہا کہ لاؤ یہاں بھی ہوتی چلوں۔ وکیل صاحب اگلے زمانہ کے

لوگوں میں سے تھے۔ انھوں نے نہایت ہمدردی اور توجہ سے صفیہ کا قصہ سُنا۔ صفیہ نے کہا "میں مقدمہ کی پیروی نہیں کرانا چاہتی۔ کیونکہ میرے پاس روپیہ نہیں۔ غریب ہوں، مصیبت زدہ ہوں۔ چکیاں پیس پیس کر میں نے اپنے بچے کو پالا ہے۔ میری ساری عمر کی کمائی یہی ہے۔ مجھکو صرف اتنا اطمینان دلا دیا جائے کہ میرا بچہ تو مجھ سے چھینا نہ جائے گا۔ ورنہ میں پیشی کے دن اس کو عدالت میں حاضر کر دوں گی۔ اور خود کچھ کھا کر سو رہوں گی۔" وکیل صاحب نے نہایت نرمی سے کہا کہ "میں تم کو کوئی غیر معمولی امید دلانا نہیں چاہتا میں ابھی نہیں جانتا کہ قانونی موشگافیوں میں مقدمہ کیا رنگ اختیار کرے۔ بہرحال میں پیروی میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھوں گا۔ تم کچھ فکر نہ کرو انشاءاللہ سب انتظام ہو جائے گا۔" صفیہ کی یہ حالت ہوئی کہ "زندگی حسرت مردہ کو ملی بار دگر" بے اختیار رونے لگی۔ جوش تشکر نے اُسکی زبان بند کر دی تھی۔

(۶)

دوران مقدمہ میں وکیل صاحب نے ہندوستان کے تمام مذہبی مرکزوں سے صورت واقعہ کے متعلق استفسار کیا لیکن افسوس کہ ہر جگہ سے اُن کو یہی جواب ملا کہ "بہ حیثیت شرع حنفی اولاد باپ کی ملکیت ہے۔"

صفیہ اس دوران میں بہت پریشان رہی۔ اگر وکیل صاحب اپنی ہمدردی سے دلدہی نہ کرتے رہتے تو وہ یقیناً دیوانی ہو جاتی۔

مقدمہ جب تمام منزلیں طے کر چکا اور آخری بحث کا موقع آیا تو وکیل صاحب نے جج کو مخاطب کر کے کہا "آپ کے سامنے ایسے بہت سے مقدمات فیصلے کے لئے آچکے ہوں گے۔ لیکن یہ مقدمہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل جداگانہ شان رکھتا ہے۔ چونکہ اس مقدمہ میں زیادہ تر بحث شرع محمدی سے کی گئی ہے اور اسی بنیاد پر اس کا فیصلہ ہوگا۔ اس لئے مجھے اجازت دیجئے کہ تدوین شرع محمدی پر اُس کے ماحول کے لحاظ سے بحث کر سکوں سب سے پہلے مجھے عرب کی تمدنی حالت پر کچھ کہنا ہے۔ آنحضور کے مبعوث ہونے سے پہلے عرب وحشیوں اور درندوں کا ایک خطہ تھا۔ عورت کی حیثیت اُن کے نزدیک جائداد منقولہ سے زیادہ نہ تھی۔ جب کوئی مرتا تو اُس کی بی بیاں بھی اشیاء متروکہ کے ذیل میں اُس کی اولاد پر تقسیم ہو جایا کرتی تھیں۔ جہالت کا یہ عالم تھا کہ داماد و خسر بننے کی شرم سے باپ اور بھائی اپنی لڑکیوں اور بہنوں کو زندہ دفن کر دیا کرتے تھے۔ عورتیں اکثر ان کے ہاں غارتگری میں ہاتھ آیا کرتی تھیں۔ جن کی کوئی وقعت نہ ہوتی تھی۔ ماں خواہ کسی قبیلہ سے ہو مگر نسب باپ کا صحیح مانا جاتا تھا۔ جیسا کہ عرب کا قول ہے "النسب من الاب"۔ آنحضور نے اپنے حیرت انگیز اثر سے ان کی جہالتوں کو دور فرمایا۔ ان کو انسان بنایا لیکن وہ بنیادی چیزیں جو ان کے ہاں مسلم چلی آتی تھیں۔ ان میں صرف ترمیم سے کام لیا انکی کلی طور پر میٹ نہیں دیا۔ وہ جنگجو تھے ان کی اس اسپرٹ کو "اشداء علی الکفار و رحماء بینھم" کے ذریعہ سے مسلم و کافر میں تقسیم کر دیا۔ وہ بُت

پرستی میں غلو رکھتے تھے، ان کے اس جذبہ کو مذہب اسلام کی طرف پھیر دیا۔ غرضیکہ وہ تمام رسوم جو جہالت سے ان میں چلی آتی تھیں۔ ان میں مناسب ترمیم کر دی۔"

"میں موضوع سے نہیں ہٹ رہا ہوں، میں بہت جلد بیان کروں گا کہ اس تمہید سے میرا مقصد کیا ہے۔ طائف میں ایک بڑا بت خانہ تھا جس کی عظمت کو اسلام سے پہلے کفار بہت زیادہ تسلیم کیا کرتے تھے جب اُس کے توڑنے کی بابت حکم ہوا تو بہت سے صحابیوں نے انکار کر دیا، حالانکہ یہی صحابی آپ کے ادنے اشارہ پہ اپنی جانیں قربان کر سکتے تھے۔ یہ وہی جذبہ تھا کہ کسی انسانی گروہ میں یکدم انقلاب نہیں کیا جا سکتا جسکی طرف لطیف اشارہ قرآن میں ان اللہ لایغیر بقوم حتیٰ یغیر ما بانفسھم سے کیا گیا ہے۔ عرب مال غنیمت کے نہایت شوقین تھے۔ کیونکہ اسی پر ان کی زندگی کا دارومدار تھا۔ فتح مکہ کے بعد تقسیم مال میں انصار نے اپنے ذہن کے لحاظ سے غیر انصافی دیکھی تو بغاوت پر آمادہ ہو گئے۔ جس عرب کا ماحول یہ ہو جس کی تمدنی اور اخلاقی حالت یہ ہو۔ جس میں عورت کی قدر و منزلت یہ ہو وہ بھلا کیسے گوارا کر سکتا کہ عورت کا درجہ اس قدر بلند کر دیا جائے کہ مرد کے مساوی ہو جائے۔ شراب جو ان کی گھٹی میں پڑی تھی اُس کو بھی یکے بعد تین حکموں کے ذریعے سے حرام کیا گیا وہ بھی اس قدر نرم الفاظ سے کہ" واثمھما اکبر من نفعھما"

علاوہ ازیں عربوں کا یہ عام طرزِ معاشرت تھا کہ بہت معمولی معمولی باتوں پر اپنی عورتوں کو طلاق دیدیا کرتے تھے اسلام نے بھی ان کی مالی حالت کو دیکھ کر مہر کی رقم اس قدر قلیل قرار دی کہ جس کی ادائی کسی پہ گراں نہ گذرتی تھی۔ اس صورت میں اگر عورتوں پر اولاد کی پرورش بغیر معاوضہ کے تسلیم کر لیجاتی اور انھیں کو اولاد کا مالک قرار دیا جاتا تو ظاہر ہے کہ وہاں کا نظام تمدن ہی درہم برہم ہو جاتا۔ ایک عورت طلاق کے بعد اپنے بچوں کی پرورش کرتی یا قوتِ لایموت کے حصول کے لئے دوسرا نکاح کرتی۔ دوسرا نکاح عرب میں کوئی معیوب بات نہ تھی ایک ایک عورت اپنی عمر میں دس دس نکاح کرتی تھی۔ اس حالت میں شارحانِ شریعت نے اولاد کی ملکیت کا بار جو باپ پر ڈالا وہاں کے لحاظ سے بالکل حق بجانب تھا لیکن وہ ملک جسکی تہذیب عرب سے بالکل مختلف ہو۔ جہاں مرد کو یہ حق حاصل ہو کہ عورت کی بغیر طلاق کے ساری عمر برباد کر سکتا ہو۔ جہاں کی عورتیں دوسرا نکاح ناقابلِ معافی گناہ جانتی ہوں وہاں عرب کے اصول کے تحت میں کیونکر فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ میں آپ کے جذباتِ انسانیت سے اپیل کرتا ہوں کہ ایک عورت شوہر سے ناچاقی کے بعد اپنی اولاد کو نوکریاں کر کے، اپنا پیٹ کاٹ کر، مزدوریاں کر کے، خود ننگی بھوکی رہ کر، پرورش کرے۔ تو کیا آپ کے نزدیک یہ جائز ہوگا کہ جب اولاد پروان چڑھے تو باپ کو سپرد کر دیجائے۔ حالانکہ عورت کی آرزوؤں کا آخری مرکز وہی اولاد ہو اور پھر ایسی حالت میں جبکہ مرد نے نہ کوئی تکلیف اُس کی پرورش میں اٹھائی ہو نہ کسی قسم کے مصارف برداشت کئے ہوں۔

قانون میں روزانہ ترمیم ہوتی رہتی ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ کسی قوم کا نظام تمدن ہمیشہ یکساں نہیں رہتا اور نہ انسانی عقول نے اس قدر ترقی کی ہے کہ وہ دنیا کے لئے ایسا قانون مرتب کرے جو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے قابل عمل ہو۔ قرآن میں صرف کلئیے بتادئے گئے ہیں۔ انہی کلیوں سے مسلمان روزانہ نئے نئے معنی مراد لیا کرتے ہیں اور اپنے خیال کے مطابق شرح کیا کرتے ہیں۔ یہ اگر نہ ہوتا تو آج دنیا میں قرآن کی اتنی شرحیں موجود نہ ہوتیں۔ پھر اس صورت میں اولاد کو باپ کی ملکیت قرار دینا کس طرح ایک امر فیصل کے طور پر مان لیا جائے۔ جبکہ قرآن اس باب میں بالکل خاموش ہے۔ نہ صرف قرآن بلکہ کوئی صحیح حدیث بھی آج تک اسکی بابت نہیں پیش کی گئی تاکہ اُس سے یہ معلوم ہوتا کہ بانیٔ شریعت کا اس کے متعلق کیا فیصلہ ہے۔ ابتک جو کچھ سامنے لایا گیا ہے وہ صرف اقوال فقہا ہیں۔ اور ان کی خود یہ حالت ہے کہ قدم قدم پر آپس میں اختلاف ہے۔ آج تک ان میں اس پر اتفاق نہ ہوسکا کہ سورۂ فاتحہ امام کے پیچھے پڑھی جائے یا نہیں۔ خود اسی مسئلہ ملکیت اولاد کے بارہ میں امام شافعیؒ کو امام ابوحنیفہؒ سے اختلاف ہے۔ وہ اولاد کو باپ کی ملکیت نہیں قرار دیتے۔ لیکن چونکہ ضابطہ دیوانی میں شرع محمدی کو اس لحاظ سے کہ ہندوستان میں حنفیوں کی کثرت ہے امر مسلّم مان کر قانون مرتب کر دیا گیا ہے۔ لیکن میری موکلہ چونکہ عقائد میں شافعی ہے لہذا میں درخواست کروں گا کہ اُسکے مقدمہ کا فیصلہ شافعی عقائد کے ذیل میں کیا جائے۔

ممکن ہے کہ میری بحث کے بعض اجزا کو سُن کر معاوضہ دینے کا سوال اُٹھایا جائے۔ اس لئے میں اسی وقت عرض کئے دیتا ہوں کہ مدعا علیہا نے جن پریشانیوں میں بچہ کو پرورش کیا ہے اُس پریشانی کی قیمت نہ مدعی ادا کر سکتا ہے اور نہ عدالت ہی دلا سکتی ہے۔ اس لئے یہ سوال معرض بحث ہی میں نہیں آتا۔

میں اپنی بحث کو ختم کرتے ہوئے صرف اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں کہ مدعی نے موجودہ مقدمہ کے علاوہ مدعا علیہا کو طلاق نہ دیکر پریشان کر رکھا ہے۔ وہ اسی بچہ کے سہارے اپنی زندگی کاٹ رہی ہے۔ اگر اس کی امیدوں کا یہ آخری چراغ بھی گل ہو گیا تو اگر وہ مری نہیں تو دیوانی ضرور ہو جائے گی۔ یہ گویا ایسا فیصلہ ہو گا کہ جس کے ذریعہ سے ہم خود ایک انسان کو موت کی طرف ڈھکیل رہے ہونگے۔ دوسرے بچہ ابھی ۶ برس کا بھی نہیں ہوا ہے۔ اُس نے چونکہ اپنی ہوش میں علاوہ اپنی ماں کے اور کوئی محبت کرنیوالا چہرہ نہیں دیکھا ہے۔ اس لئے ماں کی جدائی کے بعد وہ یقیناً مر جائے گا۔ اس طرح ہم گویا دو قتلوں کے مرتکب ہونگے۔ لیکن مجھے امید ہے کہ ایسا ہرگز نہ ہو گا۔"

صفیہ کے وکیل کی تقریر نے کافی اثر کیا۔ لیکن جب دوسرے دن فیصلہ سنایا گیا تو خانصاحب کے حق میں تھا فیصلہ سُن کر صفیہ بیتاب ہو گئی مگر وکیل صاحب کے امید دلانے پر کہ "کچھ حرج نہیں، میں ہائیکورٹ میں اپیل کرونگا۔ وہاں یقیناً کامیابی ہو گی"، صفیہ کی مردہ امیدیں پھر زندہ ہو گئیں۔

تقریباً دس مہینہ میں ہائیکورٹ سے بھی مقدمہ کا فیصلہ صفیہ کے خلاف سنایا گیا اور اس نے صفیہ کی کمر توڑ دی۔

(۷)

ہائیکورٹ کے فیصلہ کے بعد سے صفیہ کی یہ حالت ہوگئی کہ اس نے اپنا کام کاج سب چھوڑ دیا۔ دن رات روتی رہتی۔ دیوانوں کی طرح واہی تباہی باتیں کرتی۔ اور ایک پل کو عظیم کو اپنی نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیتی۔ خالصاحب پر انتقام کا بھوت سوار تھا۔ وہ اپنی کامیابی پر خوش تھے کہ صفیہ سے بدلہ لینے کا موقع آیا ہے۔ انھوں نے لے دیکر فیصلہ کا نفاذ جلد کرا لیا۔ جسوقت خالصاحب سرکاری سپاہیوں کو لیکر صفیہ کے گھر پہونچے اور اُسے اطلاع ہوئی تو اس نے ایک چیخ ماری اور بیہوش ہوگئی۔ تھوڑی دیر کے بعد جب ہوش میں آئی تو سپاہی عظیم پر قبضہ کرکے لیجا رہے تھے۔ عظیم بلک بلک کر رو رہا تھا۔ صفیہ دیوانہ وار ہائے میرا بچہ کہکر دروازہ سے بے دھڑک نکلکر عظیم سے لپٹ گئی۔ صفیہ اسوقت ایسی رو رہی تھی کہ سننے والوں کا کلیجہ شق ہوا جاتا تھا۔ اُس نے سپاہیوں سے کہا "میری تمام چیزیں لیلو مگر میرے بچہ کو نہ لے جاؤ۔ میں تمہارے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ للہ مجھکو برباد نہ کرو"۔ سپاہی بھی آخر انسان تھے۔ لیکن تعمیل حکم سے مجبور تھے۔ انھوں نے کہا کہ "ہم کچھ نہیں کرسکتے اگر خالصاحب چاہیں تو ایسا ممکن ہے"۔ صفیہ ڈر کر خالصاحب کے قدموں سے لپٹ گئی اور آنکھیں پاؤں سے مل کر کہنے لگی "میں تمہاری مجرم ہوں مجھکو سزا دے لو۔ مجھکو مارو اور اتنا مارو کہ مرجاؤں۔ میرے چمڑہ کی جوتیاں بنا کر پہنو لیکن خدا کے لئے اس ننھی جان پر رحم کھاؤ۔ یہ میرے بغیر زندہ نہ رہے گا۔ آخر کیا تم اسکے باپ نہیں ہو۔ کیا تم کو اسکا درد نہیں ہے۔ میں گنہگار ہوں اس نے تو کوئی خطا نہیں کی پھر تم اسکی جان کے پیچھے کیوں پڑے ہو۔ اگر نہیں مانتے تو صرف اتنے دنوں کیلئے اسکو اور میرے پاس امانت رہنے دو کہ یہ جوان ہو جائے۔ مجھکو اس کی کمائی کی ضرورت نہیں ہے۔ اچھا میں اپنا مہر معاف کرتی ہوں۔ تم مجھکو طلاق بھی نہ دو لیکن خدارا اسکو مجھ سے جدا نہ کرو۔ ہائے یہ میری ساری عمر کی کمائی ہے۔ میرے دل کی ٹھنڈک ہے۔ آنکھوں کا تارا ہے۔ میری دنیا تو اجاڑ چکے ہو۔ اب میرا دل برباد نہ کرو۔ یہ بھی یاد رکھو کہ اسکو مجھ سے چھین کر دل شاد ہو کر نہ بیٹھو گے۔ ہائے یہ نہیں سمجھتے لوگو تم ہی کچھ سمجھاؤ۔ افسوس میں لٹ رہی ہوں۔ اور کوئی آتا نہیں کہ میری مدد کرے"۔ خالصاحب نے پاؤں جھٹک کر کہا "دور ہو یہاں سے اب آئی ہے لسوے بہانے اب تو ساری عمر اسکی صورت نہ دیکھ سکے گی"۔ یہ کہکر خالصاحب نے سپاہیوں کو چلنے کا اشارہ کیا۔ اور صفیہ کو اسی حالت میں چھوڑ کر چل دئے۔

صفیہ کی ملانی زبردستی اُس کو پکڑ کر گھر میں لائیں۔ وہ دیوانہ وار ہائے میرا لال ہائے میرا لال کہتی دوڑتی پھرتی تھی۔ لیکن ملانی نے بہزار وقت اُسکو پکڑ کر پلنگ پر لٹا دیا۔ لیٹتے ہی وہ غافل ہوگئی۔

صفیہ کو اس قدر شدت کا بخار چڑھا کہ تین دن تک اُس نے آنکھ نہ کھولی۔ چوتھے روز جب وہ ہوشیار ہوئی تو کہنے لگی "ملانی جی وہ دیکھو میرا چاند آرہا ہے۔ لیکن اس کا منھ بھی تو کسی نے نہیں دُھلایا ہے۔ آ میرے بچے میں

تیرے صدقے میں تیرے قربان میں تیرا منھ دھلاؤں۔ سرمہ بھی تو نہیں لگا ہے"۔ پھر ایکدم چیخ کر کہنے لگی "وہ دیکھو وہ دیکھو اُس کو سپاہی پکڑے لئے جاتے ہیں ان کو مارو۔ انکو یہاں سے نکال دو"۔ یہ کہکر اُٹھنا چاہا مگر کمزوری کی وجہ سے غنودگی طاری ہوگئی۔

(۸)

عظیم کو لینے کو تو خانصاحب لے آئے۔ لیکن اُسنے وہ قیامت برپا کی کہ اللہ کی پناہ۔ سارے گھر کو رو رو کر سر پہ اُٹھالیا۔ خانصاحب نے کئی مامائیں عظیم کے لئے نوکر رکھ لیں تھیں اور بیسیوں کھلونے بازار سے خرید لائے تھے لیکن عظیم نہ تو کسی ماما کی گود میں گیا اور نہ کسی کھلونے کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھا۔ اُسکی ایک رٹ تھی وہ برابر "اماں" "اماں" پکار رہا تھا۔ رات کے دس بجے تک اس نے کسیکو آرام نہ لینے دیا۔ آخر تھک کر سو گیا۔

دوسرے دن صبح کو جب آنکھ کھولی تو پھر دہی اگلے دن کا سبق تھا۔ وہ رو رہا تھا اور برابر "اماں" "اماں" کہہ رہا تھا۔ خانصاحب نے پیار کر کے گود میں لینا چاہا تو وہ مچل گیا۔ گود میں لیتے وقت خانصاحب کو معلوم ہوا کہ عظیم کو بخار ہے۔ فوراً حکیم کو بلایا۔ اور اسی وقت نسخہ منگوا کر پلایا۔ لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔ بلکہ بخار برابر ترقی ہی کرتا رہا۔ شہر کے تمام مشہور ڈاکٹر، حکیم علاج کر کے عاجز ہو گئے۔ ڈاکٹروں نے انجکشن کے ذریعہ سے دوا پہونچائی لیکن بخار نہ اترنا تھا نہ اترا۔

آخر تیسرے دن جب خانصاحب نے دیکھا کہ لڑکا اب ہاتھوں سے چلا تو انکی آنکھیں کھلیں۔ اپنے دوستوں کے مشورہ سے عظیم کو گاڑی میں ڈاکٹر صفیہ کے ہاں پہونچا دیا۔

گاڑی جس وقت صفیہ کے دروازہ پر پہونچی تو صفیہ ہذیانی کیفیت میں مبتلا تھی اور مسلسل "وہ آیا میرا بچہ میرا چاند کا ٹکڑا" کہہ رہی تھی۔ نقاہت کی وجہ سے اُسکی آواز بھی مشکل سے نکلتی تھی۔ جب عظیم کو گاڑی سے اتارا تو وہ ختم ہو چکا تھا۔ لیکن چونکہ منھ پر چادر پڑی ہوئی تھی۔ اس لئے کسی نے دیکھا نہیں اور اسے اُٹھا کر صفیہ کے پاس لٹا دیا۔ صفیہ نے عظیم کو سینے سے لگا کر کہا "ہائے میرے لال تو آگیا" اور ایک ہچکی لے کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئی۔

محمد ذوالفقار کیفی "منشی فاضل"

نگارستان

(جدید اڈیشن) جسمیں حضرت نیاز کے اور متعدد ادبی مضامین اور افسانے شامل کئے گئے ہیں۔ نگارستان نے ملک میں جو درجہ قبولیت حاصل کیا اسکا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اسکے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے۔ قیمت (عار) منیجر نگار لکھنؤ

ریاض آپ اپنے آئینہ میں

(بہ سلسلۂ گزشتہ)

میں ماہ صوم میں آفتاب لبِ بام بن کر اپنے مراسلے میں رخصت ہوا تھا - اب بھی وہیں ہوں - جہاں تھا اور نہ معلوم اپنی جگہ پر ابھی کب تک رہوں - زوال پذیر ماہِ کامل بننے کو بھی اس لئے جی چاہتا ہے کہ ؎ داغ

ہوتا ہے حسینوں کا یہی وقت نمائش　　　ورنہ مہ کامل نہ سرِ شام نکلتا

مگر ماہ کامل اس آرزو میں صرف داغ - اپنی تابانی سے بن سکتے تھے - کہ دور ہی سے نظارہ ہو - وہ آسمان پر - حسن جہاں افروز زمین پر - مجھے زمین و آسمان کا بُعد محض نظارے کے لئے پسند نہیں جسکی جوانی اس طرح گزری ہو ؎

کوئی نہ کوئی ہے جلوہ گستر ریاض معشوق ماہ پیکر　　　کہ شام آئی ہے جو مرے گھر وہ چاند لائی ہے چودہویں کا

بڑھاپے میں ایسے شخص کا لبِ بام رہنا ہی اچھا - جبتک رہے - چل چلاؤ کا نازک وقت - بہت ہی عزیز ہوتا ہے - زندگی سے اُکتانے والے اور ہوں گے - میں تو چاہتا ہوں - کتنے ہلال بدر ہوتے کتنے بدر کاہیدہ ہوتے برسوں دیکھوں - خدا نے چاہا تو بتوں کے جلوے ہمیشہ اُسکی یاد میں پیش پا افتادہ رہیں گے اور رشک سے مجھ پر ہلالِ عید کی طرح انگلیاں اٹھیں گی ؎ محمد عمر

اُنگلیاں اُٹھتی ہیں مجھ پر میں جدھر جاتا ہوں　　　عید کا چاند ہوا چاک گریباں ہونا

نگار نے تصویر سے روشناس خلق کرنا چاہا - تو میں کیوں نہ کہوں ؎ غالب

وہ ایک ہم ہیں کہ ہیں روشناس خلق اے خضر　　　نہ تم کہ چور بنے عمر جاوداں کے لئے ،

جینے کو میری طرح خضر علیہ السّلام کا بھی جی چاہتا تھا - عمر جاوداں کے لئے چور ہی بن کر سہی - درازیٔ عمر نے ریش سفید کے ساتھ مجھے بھی خضر صورت تو بنا دیا ہے - میں کم سے کم یہ ضرور چاہتا ہوں کہ خضر سے مستفید نہ ہوں نہ سہی انکی کسی طولانی حصۂ عمر سے فائدہ اُٹھاؤں - کیا حضرت خضر سے میں طنزاً کہہ سکتا ہوں ؎ ریاض

ملی بھی خضر تو یہ تم سے نیک بندے کو　　　گناہگار نہ کیوں ہوتے عمر جاوداں کے لئے

عمر جاوداں کے لئے لذت معاصی کے اعتبار سے حق تو میرا ہی تھا - معصوم کے لئے تو عمر جاوداں ہمیشہ طاہر بے لذت رہیگی - اُنکے لئے خدا کی دین ہے تو مجھ گنہگار سے خدا کی دین کو کیوں تکلف جو اس کے فکر میں معصیت سے

زیادہ لذت پاتا ہے وہ چاہے تو اپنی رحمت سے مجھ آفتاب لب بام کے لئے ہر منٹ خضر کی عمر جاوداں بن سکتا ہے
میں خیرآباد چاند کی کاہیدگی لئے ہوئے آیا۔ چار دن نہیں گذرے تھے کہ ہلال عید یہاں ۲۹ کو نظر آگیا۔ یہاں کے سوا
ہر جگہ ۳۰ کا چاند ہوا۔ ماہ صوم بھی گذرا عید بھی ہو چکی اب مجھے یہ کہنے کا جلد موقع ملے گا۔ ع بر ما گذشت و اپن ل زار ہمہ
خدانے چاہا تو مصرع کا دوسرا ٹکڑا بار بار دُہرانے کی نوبت آتی رہے گی۔ چوتھے مصرع کا پہلا ٹکڑا یعنی بر ما گذشت بھی بشرط
زندگی گوارا کرلوں گا۔ ع واقعہ سخت ہے اور جان عزیز۔

گلچیں کے چھوٹے ہوئے ذکر کے سلسلے میں آتا اور کہنا چاہتا ہوں کہ اعلےٰ حضرت جنت نصیب میر محبوب علیخاں
تاجدار دکن کا مصرع۔ طرح کا مصرع نہ تھا۔ مگر متعدد شعرا کے مصرع لگانے اور ہر طرف شہرت ہو جانے سے اسکی
مقبولیت مصرع طرح سے کہیں زیادہ رہی۔ ایک تضمینی مصرع اعلےٰ حضرت کے مصرع پر گو وہ کسی درجہ کا ہو یاد
آگیا جو لکھے دیتا ہوں۔ استفہامیہ طرز سے پڑھنے کی ضرورت ہے ؎

جو لوکروٹ تو میں سمجھوں شب ہجر   یہ چوٹی کس لئے پیچھے پڑی ہے،

گر اصل مصرع طرح کی تضمین یعنی ع کنی ہیرے کی نیلم میں جڑی ہے۔ باوصف توجہ دلانے کے کسی بلند پایہ
شاعر سے بھی نہ ہو سکی۔ عام شعرا کے لئے ایک ہی پیش پا افتادہ مضمون کے سوا۔ کوئی صورت نہ تھی اور اس لیئے
توارد ہونا بھی لازمی تھا ؎

گل سوسن پہ شبنم کب پڑی ہے   کنی ہیرے کی نیلم میں جڑی ہے

بلند پایہ شعرانے ضرور توجہ کی ہوگی مگر نہ کہہ سکے۔ صرف امیر مینائی نے مصرع لگایا۔ جسے دیکھ کر ہمیشہ کے لئے قوت
شعری گویا عاجز ہو گئی۔ اب بھی مصرع نہیں ہو سکتا۔ امیر مینائی فرماتے ہیں ؎

مسی پر چھوٹ افشاں کی پڑی ہے   کنی ہیرے کی نیلم میں جڑی ہے

گلدستوں میں پیام یار و گلچیں نے زیادہ عمر پائی۔ نکلے۔ اچھے اچھے پرچے۔ خورشید صاحب کا پرچہ بھی نصیح الملک
بھی (جس کا نام غالباً پہلے گلزار خلیل تھا) قنوج کا پرچہ بھی۔ جس کے مہتمم بھگو خاں تھے۔ اور باوصف اعتباری نام
کے۔ مانگتے تھے ہمیشہ پیشگی۔ سب سے اچھا۔ دامن گلچیں تھا۔ جس کے چند پرچے نکلے۔ مگر ہمیشہ کے لئے یادگار اُسکے
بند ہوتے ہی۔ مرحوم آقائے سخن وسیم نے یہ کہکر ع

گلچیں بہار تو زداماں گلہ دارد،

گلچیں نکال دیا۔ اولیّت میں مقبولیت کے ساتھ صرف گلکدہ ریاض کے سر سہرا۔ ساتھ ہی غالباً کہہ دوں تو مضائقہ
نہیں۔ مولانا حسرت موہانی نے اردوئے معلےٰ نمبر ۱۰ جلد ۱۲۔ اکتوبر نمبر میں "گلکدہ ریاض خیرآباد نمبر ۲" عنوان میں
لکھا ہے۔ اس سے پہلے ایک مضمون شوق نیموی مرحوم کے متعلق ہے ساتھ ہی اُن کے۔ اصلاح نام پرچے کا بھی

ذکر ہے۔ بہرحال اصلاح ہو یا کوئی اور پرچہ شرف اولیت گلکدہ ریاض کو ہے اور پرچے جن کا ذکر ہوا بہت بعد کے ہیں۔ فتنوں پہ فتنہ گردوں پہ ترجیح اسے فرضی قیامت کو ہے ؎ ریاض

قیامت کی خلش کیوں ہر گھڑی ہے   وہ تم سے قد میں کم۔ سن میں بڑی ہے

مولانا حسرت۔ متذکرہ نمبر میں تحریر فرماتے ہیں :-

" ماہ جنوری سنہ ۹۷ء سے حضرت ریاض نے گلکدہ ریاض خیرآباد سے نکالنا شروع کیا اگر اُس زمانہ کی بہترین نثر و لٹریچر کا صحیح نمونہ دیکھنا ہو تو گلکدہ ریاض کا اشتہار ذیل ملاحظہ فرمایئے:-"

اس پرچے کی اشاعت ذریعۂ تجارت نہیں صرف مذاق سخن کا درست کر دینا ہے۔ یہ احسان ہمارا تمام اہل ہند پر ہے۔ ہم دہلی و لکھنؤ دونوں سے دور ہیں۔ مگر مضافاتِ اودھ سے ضرور ہیں۔ دیکھیں کس کی ہمت ہمارے احسان کا معاوضہ کرتی ہے۔ معاوضہ کے لئے مٹھی گرم ہونیکی یہ تمہید نہیں۔ منتخب اشعار کی ضرورت ہے۔ دیکھیں کس چوٹی کے شعر ہمیں کون بھیجتا ہے۔ اسمیں کہنے والے اور کلام اساتذہ و متاخرین کے منتخب کرنیوالے دونوں آگئے۔ درج اشعار میں رعایت نہ ہوگی۔ فرمانروائے رامپور سے سخندان و قدردانِ گلکدہ کے شعر جو انتخاب میں آئیں گے وہی لکھے جائیں گے۔ کوئی بیٹیں بےجبیں ہو تو ہم بھی بلا کے نازک مزاج ہیں۔ ہاں اتنے احسان کی گنجائش ہے۔ جہاں موقع نظر آئے انتخاب کرنے میں ہمارے مذاق کی بھی اصلاح کیجائے۔ پورپین مذاق کے لوگوں کے لئے ہم وہ بات کرینگے۔ جس سے سپے جھوٹوں کے آگے دم مرینگے۔ تصاویر شعرا کا بھی بندوبست بہت جلد شروع ہوگا۔ بزرگانِ ہند نے یہاں اسکا خاکہ رکھا نہیں چربہ اتارنا پڑے گا۔ اسمیں دائرہ کھولنے کی ضرورت ہے۔ اس لئے معاونوں کی مدد بڑھی۔ کیونکہ ناموری مفت۔ کام کی نہیں اب لگے ہاتھوں وہ بھی سُن لیجئے۔ اول مد معاونین کی ہے جنکی فہرست اسماء ہر پرچے کے ساتھ رہیگی۔ ان سے قیمت مرتبے کے موافق (اصہ) ماہوار تک ہے دوسری مد معمولی قیمت کی (سے) سالانہ پیشگی ۵؎ سالانہ۔ مابعد۔ نہ کوئی دیگا نہ ہم لیں گے۔ پیشگی رونق دو رہیگی اور جوگانٹھ کے پورے دو چار ایسے نکل آئیں گے تو سبحان اللہ۔ چشم ما روشن دل ما شاد۔ میعاد پیشگی تین ماہ۔ تیسری مد اشتہار صفحہ اول سے ہے۔ جو واقعی شاعر ہیں لیکن مفلس بھی وہ آمدنی کے حساب سے دیں۔ جن سے کچھ نہیں ہو سکتا اُن سے کچھ بھی نہیں۔ وہ شاعر ضرور ہوں یا مذاقِ سخن رکھتے ہوں۔ ورنہ بھینس کے آگے بین۔ ایسے کی خریداری بھی بُری۔ تفصیل مضامین بھی سُن لیجئے۔ منتخب متقدمین دو ورق متاخرین دو ورق طرح غیر طرح دونوں کے لئے قید نہیں۔ صاحبانِ اخبار کا شمار خریدار دنیں ہوگا۔ صرف (عہ) رعایت۔ معاونوں کے لئے قصائد مدحیہ بھی درج ہوتے رہیں گے۔ غرض یہ ہے اِن

دولت کے کھلونوں سے منھی گرم ہوتی رہے ۵ ریاض

وضع سے گو ہم ہوئے سب میں سُبک		پھر بھی بارِ خاطرِ احباب ہیں ،

گلدستہ ریاض کی خاص خوبی یہ بھی کہ اس میں حتی الامکان سب شعر منتخب درج کئے جاتے تھے۔ اور اس اصول کی پابندی اس سختی سے کیجاتی تھی کہ بعض پرچوں میں امیر سے استاد کامل کی غزل کا صرف ایک ہی شعر چھپا ہوا نظر آتا ہے۔ اسوقت تک نمبر کو حصہ لکھنے کا رواج تھا۔ مثلاً ۱۸۸۲ء کے اپریل پرچے کو گلدستہ ریاض حصہ چہارم جلد ۲ لکھتے تھے۔ منشی امیر احمد کے متفرق اشعار کا مجموعہ سب سے پہلے گوہرِ انتخاب موسوم آب گوہر کے نام سے بہ طور ضمیمہ اسی گلدستے میں شائع ہوا۔ کچھ دنوں میر تقی میر کے کلیات کا انتخاب اسی میں نکلتا رہا۔ رسالۂ معیار لکھنؤ نے ایک مقررہ قافیئے کی تحت میں کلام شعرا کی اشاعت کا جو طریقہ اختیار کیا اس کی ابتدا بھی گلدستہ ریاض سے ہوئی ہے کیونکہ حصہ سوم جلد ۲ مطبوعہ مارچ ۱۸۸۲ء کے گلدستے میں طرح کی غزلوں کے بعد آخر میں لکھا ہے کہ "ناظرین اگر پسند فرمائیں تو گلدستہ کی چھپنے کا ایک ڈھنگ یہ بھی ہے۔"

قافیہ تنہائی کا

اسیر

آتے جاتے ہیں بہت ساتھ مرے اعمال اپنے		خوف کچھ راہ عدم میں نہیں تنہائی کا

داغ

خوگرِ رنج و بلا حشر کے دن کیا خوش ہو		کہ وصال آج ہوا ہے شبِ تنہائی کا

فاخر سہسوانی

پاک ہے گوشۂ تجرید میں اپنا دامن		ابرِ رحمت ہے اندھیرا شبِ تنہائی کا

وسیم

گور میں چین سے منھ ڈھانپ کے سونا تھا		نہ بنا وہم وہاں بھی شبِ تنہائی کا

امیر

شفق شام نہیں ہے یہ مرے ماتم میں		منھ کو آیا ہے کلیجہ شبِ تنہائی کا

ریاض

آج تک اُس لبِ نازک پہ سہی ہی بدنام		نام بھولے سے لیا تھا شبِ تنہائی کا

اُس عہد میں جن مشہور لوگوں کی غزلیں گلدستوں میں شائع ہوتی تھیں۔ ان کے نام والقاب مندرجہ گلدستہ ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

حافظ نظام اللہ انداز رئیس خیر آباد۔ نواب عبد العزیز خانصاحب عزیز رئیس بریلی۔ ریاض مالک گلکدہ منشی امیر احمد امیر مینائی۔ سید حسن صاحب لطافت خلف اکبر سید آغا حسن صاحب مرحوم امانت لکھنوی۔ نواب کلب علیخانصاحب فرمانروائے رامپور۔ نواب تخلص نواب تدبیر الدولہ۔ منشی ظفر علی اسیر۔ سید اسمعیل حسن صاحب منیر شکوہ آبادی۔ مرتضے خاں بہادر بقا لکھنوی۔ سید عباس حسن صاحب فصاحت خلف اصغر امانت مرحوم لکھنوی۔ حکیم عابد علی صاحب کوثر خیر آبادی۔ منجھو صاحبہ مشتری شاعرہ معروف وطن قدیم خیر آباد شاگرد آغا علی صاحب شمس لکھنوی۔ محمد دلدار علیصاحب مذاق بدایونی۔ سید اکبر حسین صاحب اکبر وکیل ہائی کورٹ الہ آباد۔ سید محمد عسکری صاحب وسیم خیر آبادی۔ محمد عبد الغفور خانصاحب بہادر نساخ ڈپٹی کلکٹر بیر بھوم۔ سید محمد مرتضے صاحب بیان یزدانی رئیس میرٹھ۔ نواب مرزا خانصاحب داغ دہلوی۔ نواب احمد حسین خانصاحب عروج ملازم رامپور۔ آغا ججو صاحب ہندی تخلص ملازم رامپور۔ منشی امیر اللہ صاحب تسلیم لکھنوی شاگرد نسیم دہلوی۔ میرزا عنایت علی صاحب ماہ اکبر آبادی۔ میرزا حاتم علی صاحب مہر اکبر آبادی۔ محمد جان خانصاحب شاد لکھنوی۔ مرزا عاشق حسین صاحب بزم اکبر آبادی۔ آغا حسن صاحب حیدر رضا افسوں لکھنوی۔ مومن حسین صاحب صفی امروہوی۔ مہدی علی خانصاحب ذکی۔

گلکدہ ریاض میں ان سب کی غزلیں موجود ہیں پانچ چار یہاں بطور نمونہ نقل کیجاتی ہیں۔

عشق

چلی کسی پہ نہ شمشیر میرے قتل کے بعد حضور نے اثر خونِ ناتواں دیکھا

نواب خلد آشیاں

لگاؤ تیغ مجھے دیکھو آزما کر تم یہ کیا کہ رہ گئی لب تک ہی ہاتھ اُٹھا کر تم
دیا ہی بوسہ اسے پھیر لو تو ہم جانیں یہ دل نہیں ہے کہ لیجاؤ مسکرا کر تم

اسیر

در پہ جو ترے لحد بنی ہے بے شمع و چراغ روشنی ہے
اللہ ری ہجر کی درازی دن دونی ہی رات چوگنی ہے

مولانا حسرت موہانی اسی سلسلے میں دوسری جگہ تحریر فرماتے ہیں: "گلکدہ ریاض کا دوسرا صفحہ اعلانات و تصحیح و رسید زر کے لئے خاص تھا۔ تیسرے صفحے پر "خبروں کا خلاصہ" بطور نمونہ یہ سب چیزیں ممدوح نے دکھائی ہیں.....

اُس زمانہ میں مولوی محسن صاحب کاکوروی۔ مین پوری میں وکالت فرماتے تھے۔ آپ نے بہ لطف خاص اپنا نو تصنیف مشہور قصیدہ موسوم بہ مدیح خیر المرسلین۔ گلکدہ ریاض کو اشاعت کے لئے مرحمت فرمایا تھا۔ جسکا مطلع اور ایک شعر درج ذیل ہے۔ اس قصیدے کا ہر شعر وہی درجہ رکھتا ہے جو کلام نعتیہ مولوی محسن صاحب کا

خاص حصہ ہے سے

سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل برق کے کاندھے پہ لاتی ہے صبا گنگا جل

آتش گل کا دھواں بام فلک تک پہونچا جم گیا منزل خورشید کی چھت میں کاجل

اس قصیدے میں ایک شعر غلط قافیے کے ساتھ کاپی کے پتھر سے کاغذ پر جا چکا تھا لہذا صفحہ خاص متذکرہ پر مولوی محسن صاحب کی طرف سے حسب ذیل تحریر درج ہوئی:

"اعلان کیا جاتا ہے کہ مندرجہ ذیل شعر قصیدے سے خارج کیا گیا۔" سے

ہاتھ اُٹھائے ہے مناجات میں ہر شاہ و گدا سر جھکائے ہوئے سجدے میں سلیمان و نمل

نمل بہ فتح میم غلط بہ سکون صحیح۔ اسی طرح اعلان کا نمونہ حسب ذیل دکھایا گیا ہے:۔

امیر احمد ملازم سرکار رام پور ۔ یہ اعلام بہر آگاہی ہر خاص و عام ہے کہ بندگان حضور فرمانروائے ریاست مصطفےٰ آباد کو مرض سنگ مثانہ کا احتمال ہے جو صاحب ایسا علاج جانتے ہوں کہ پتھری بغیر شگاف و تکلیف شاقہ نکل جائے بہ جائے اور اُس کے رفع ہونے سے اور کسی طرح کا مرض لاحق نہ ہونے پائے تو وہ صاحب بذریعہ تحریر اطلاع دیں۔ بعد صحت تامہ سرکار فیض آثار سے ان کو لاکھ روپے نقد عنایت کئے جائینگے اگر کوئی بزرگ تارک دنیا ارباب توکل ایسا علاج یا دعا جانتے ہوں تو حسبۃً اللہ توجہ فرمائیں۔"

اسی طرح مختصر خبروں کا نمونہ دیا ہے۔ غالباً مولانا کو یہ دکھانا مقصود تھا کہ اُس وقت کا مذاق کیا تھا گلکدۂ ریاض کی کیا وقعت تھی۔ میں جس زمانے میں خلد آشیاں کا طلبیدہ رام پور گیا تھا۔ جناب داغ کا پہلا دیوان گلزار داغ زیر نگرانی امیر مینائی طبع ہو رہا تھا۔ جلال و تسلیم جبتک لکھنؤ میں تھے تسلیم سہسوانی و صبا البتہ رامپور میں تشریف رکھتے تھے۔ لکھنؤ میں تسلیم لکھنوی واشرف ہمیشہ ایک دوسرے کے ساتھ میں رہتے۔ کتابت میں دونوں ہم پیشہ دونوں نولکشور آنجہانی کی نظر میں وقیع۔ دونوں کو نسیم دہلوی سے تلمذ۔ باوضع بھی۔ خلیق بھی۔ سراپا عجز بھی کبھی کبھی شمس لکھنوی بھی ان کے ہمراہ نظر آجاتے۔ مشتری طوائف مشہور شاعرہ ان کی شاگرد تھی۔ اسکی شاگردی نے شمس کی شہرت کو چار چاند لگائے تھے۔ زہرہ ہمشیرہ مشتری بھی ان کی شاگرد تھی۔ یہ لوگ واقعی مرتبے کے تھے صحیح ہو یا غلط مندرجہ ذیل شعر میں نے شمس کے نام سے سُنا تھا۔

جینے نہ دینگی آنکھیں تری دلربا مجھے ان کھڑکیوں سے جھانک رہی ہے قضا مجھے

نواب آفتاب الدولہ بہادر قلق میرے جانے پر رام پور میں موجود تھے۔ قیام لکھنؤ کے زمانے میں بار بار اُن سے ملا تھا گو وہ زمانہ عسرت کا تھا۔ مگر آن بان پابندی وضع خود داری ان کا حصہ تھی۔ امیر مینائی کی وساطت سے خلد آشیاں

نے آپ کو رامپور طلب فرمالیا تھا۔ واپس آنے پر کچھ عرصے کے بعد میں نے سُنا کہ سرکاری مشاعرے میں وقت مقررہ پر نہ پہنچنے سے بعض معزز شعراء معتوب ہوئے۔ بغیر شرکت مشاعرہ واپس آنا پڑا۔ معمولاً بھی روزانہ دربار میں یاد فرمائی نہ ہوئی۔ دو چار روز کے بعد معذرت آمیز عرضداشتیں پیش ہونے پر سرکار نے عفو سے کام لیا۔ سب حضرات باریاب ہونے لگے۔ قلق نے نہ عرضداشت بھیجی نہ کسی کی وساطت سے عذر خواہی کی سرکار نے پوچھا تو معلوم ہوا۔ قیام گاہ پر بغیر شرکت مشاعرہ واپس جاتے ہی روانہ لکھنؤ ہوگئے۔ ؎

ریاض ایسا گیا گزرا نہیں ہوں شان جانے دے گدائی کیجئے وہ کیجئے جام جم نکلتا ہے

حسب ایمائے سرکار امیر و داغ نے محبت نامے بھیجے۔ عفو کا یقین دلایا تھا۔ سب کے جواب آتے رہے مگر قلق نہ آئے۔ بر ایمائے سرکار ماہوار تنخواہ لکھنؤ جانے لگی۔ کئی مہینے کے بعد خلد آشیاں کی دستخطی تحریر پہنچنے پر اسطرح آئے گویا گئے نہ تھے۔ گو لکھنؤ وہ اپنی پہلی حالت کی بازگشت کے ساتھ واپس ہوئے تھے۔ پھر بھی اپنی بات رکھی۔

میں منشی اسمٰعیل حسین صاحب منیر شکوہ آبادی سے جب ملنے جاتا یا وہ تشریف لاتے۔ میری درخواست پر کچھ سناتے ضرور۔ ہر سنگلاخ زمین میں خاک اڑانا انکا حصہ تھا ورنہ قادر وہ ہر رنگ پر تھے۔ غزل میں بہت شعر کہتے اور غزل اسیر کہتے۔ نزد و گوئی میں عجب نہیں اسیر کے بعد ان کا درجہ ہو۔ مجھے ان کی دو غزلوں کے دو شعر اب بھی یاد ہیں اور ایک زبان کا بھی۔ زبان پر بعض کے نزدیک قادر نہ تھے۔ میں نے ان کی کسی لغزش کا ذکر کسی سے سُنا نہیں۔ مرزا وزیر پر ناسخ کے اعتراضوں کا جواب انھوں نے دیا ہے۔ وہ رسالہ بھی شائع ہو گیا ہے۔ مگر میں رسالہ دیکھے بغیر اسوقت کچھ نہیں کہہ سکتا فرماتے ہیں ؎

داغ سجدہ ہے جبیں میں داغ نیں خاک سجود خط قسمت کی شکن میں گُل ہوگئی میں خاک ہے

اسمیں شکن قافیہ ہے۔ باقی ردیف دوسری زمین میں۔ نیل۔ بیل۔ قافیہ۔ (ہے) ردیف ہے۔

غلے ہماری خاک کے ہیں اُنکے ہاتھ میں اس وصل مختصر کی بھی دشمن غلیل ہے

بھولے سے پھانس نکالی نہ ہمارے دل کی ایک تنکے کے بھی شرمندہ تمہارے نہ ہوئے

رشک کے شاگرد تھے ان کا تتبع مایۂ ناز تھا۔ رعایت لفظی کے ساتھ اسی رنگ کے شعر زیادہ انکے دیوانوں میں ہیں ؎

ہاتھوں سے ناپتے ہیں راہ جنوں آستینوں میں کوس پڑتے ہیں،

کسی نمبر میں مولانا حسرت موہانی نے مربیان گلکدہ کے فہرستی اسمار بھی درج کئے ہیں۔ جو میں بھی یہاں لکھے دیتا ہوں کہ گلکدہ کی وقعت کا اندازہ ہو اور اس میں سے بعض کا ذکر بھی آئیگا۔

نواب کلب علیخاں والئی رامپور نواب علی مراد خاں (مرداخاں) والئی خیرپور سندھ۔ نواب صدیق حسن

خانصاحب بھوپال۔ نواب محمد عمر علی خاں والئ باسودہ۔ نواب عظیم جاہ پرنس آف ارکاٹ نواب عمدۃ الدولہ آف مدراس۔ نواب سلطان علی خاں آف ہرلو۔ نواب علاءالدین خاں رئیس لوہارو صاحبزادہ عبیداللہ خاں آف ٹونک امیرالدولہ سعید الملک راجہ محمد امیر حسن خاں بہادر سحر تخلص والی محمود آباد اودھ نواب صفدر علی خاں صفدر تخلص رامپور مہاراجہ ورنجی سنگھ صاحب والئ بلرامپور اودھ راجہ اندر بکرم سنگھ رئیس کھیری گڈھ راو منشر بخش صاحب تعلقدار ملا پور سیتا پور۔ یہ فقرہ بھی مولانا حسرت نے ان ناموں کے ساتھ تحریر کیا ہے "کہ ان میں سے اکثر مربی گلکدے کو یکمشت مالی امداد سے سرفراز کیا کرتے تھے۔"

انہیں نواب علی مراد خاں بہادر والئ خیرپور سندھ وہ ہیں جنکا ذکر بہ تقریب دربار قیصری کر چکا ہوں اور اُنکے عطیئے کا بھی اسی سلسلے میں یہ بھی یاد آگیا کہ ریاض الاخبار خیرآباد کی اشاعت کو چند روز ہوئے تھے کہ میں ترقی اشاعت کی غرض سے بستی حافظ تفضل حسین صاحب سررشتہ دار بستی رئیس گورکھپور اور منشی امیر سنگھ صاحب بہادر ڈپٹی کلکٹر بستی رئیس ہانسی بریلی سے ملنے گیا۔ دونوں حضرات نے مجھے آنکھوں پر لیا مجسٹریٹ ضلع نے انکی وساطت سے دو ہزار خبری اور مختلف کاغذات کے آرڈر دیئے۔ تمام ضلع کے حکام و وکلا نے بھی اخبار و پریس کی ترقی میں سعی فرمائی۔ حافظ تفضل حسین مرحوم کی مقتدر ہستی کیسی تھی۔ اور اُس زمانے کے یورپین حکام کیسے مزاج وطبیعت کے ہوتے تھے۔ اس واقعہ سے معلوم ہو سکے گا کہ حافظ تفضل حسین مرحوم کی رحلت پر اسی مجسٹریٹ ضلع نے جب وہ ذریعہ پنشن ولایت میں تھا کافی مقدار کی ماہانہ تنخواہ مرحوم کی بیوہ اور بچوں کے لئے مقرر فرمائی۔ میں بستی سے گورکھپور گیا۔ وہاں بھی زیادہ وقت صرف ہوا۔ کامیاب واپسی پر معلوم ہوا کہ پریس واخبار کے کارپردازوں نے اس بنا پر کہ پیکٹ دس تولے وزن کا۔ ایک آنے پر جا سکتا ہے۔ ہر مقام کے ایک ایک خریدار کے نام پیکٹ متعدد اخباروں کے بھیجنا شروع کر دیئے کہ مقامی خریداروں کو جن کے اسماء کی چٹیں چھپی ہوئی ان پر چپاں ہو دستی تقسیم کر دیں۔ ڈاکخانہ سے ہر پیکٹ بہ اندازہ محصول خط بیرنگ کر دیا گیا۔ اس وقت ایسی انکاری واپسی مہینوں میں ہوتی تھی اور پیکٹوں کے جانے کا سلسلہ برابر ہفتہ وار قائم تھا۔ یہاں تک کہ محصول ادا کرنا پریس کی استطاعت سے باہر ہو گیا اور ڈاک روک لی گئی۔ میں آیا تو رُکی ہوئی بند ڈاک ادائے محصول سے کھلوائی۔ اب اخبار کی روانگی باقاعدہ ہونے لگی۔ مگر پچھلے پیکٹوں کی واپسی اور ان کے بیرنگ محصول کا عارضہ لاحق رہا۔ بالآخر میں لکھنؤ جا کر پوسٹ ماسٹر جنرل سے ملا۔ جنھوں نے میری معروضات سُنکر دو سو روپے معاف کر دئے۔ جو ابتک ادا نہیں ہوئے تھے۔ لیکن وہ روپیہ جو ادا ہو چکا تھا واپس نہیں کیا۔ میں نے ایک عرضداشت اعلیٰ حضرت راجہ صاحب محمود آباد کو بوساطت استاد میر تجمل حسین مرحوم بھیجی۔ دو سو روپے ذریعہ مختار سیتا پور عطا ہوئے۔ میں خود راؤ صاحب تعلقدار ملا پور ضلع سیتا پور کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حکیم محمد عمر صاحب مرحوم نے بہ ایما۔ میری خاطرداشت میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ چار سو روپیہ بہ طرح لیتی

امداد مجھے دے گئے۔

پریس کے سلسلہ نقصان میں ایک واقعہ مابعد زمانے کا ہیں لکھ دینا چاہتا ہوں۔ ضلع گوڑگاؤں کے ایک مہربان ڈیلی و دیگر اطراف میں ترقی اخبار کے ساعی تھے اور بہ طور ایجنٹ کے کام کرتے تھے۔ اخبار کی قیمت کی وصولی کا تعلق بھی ان کے ذمہ رہتا تھا۔ دہلی اور گوڑگاؤں کے متعدد خریداروں کے نام قیمت طلب خطوط مع حساب یکجائی طور پر ایک پیکٹ میں ان کو بھیجدئے گئے۔ ایجنٹ صاحب حج کو جا چکے تھے۔ پیکٹ خیرآباد میری عدم موجودگی میں واپس آیا۔ سب پوسٹ ماسٹر نے باوصف اختیار، دو گواہوں کے روبرو خود نہیں کھولا سیتاپور بھیجدیا۔ پوسٹ ماسٹر سیتاپور نے بھی نہیں کھولا۔ انسپکٹر ڈاکخانجات کے پاس بھیجدیا جس نے دو گواہوں کے روبرو کھولا۔ حالانکہ اسے خود کھولنے کا اختیار تھا۔ وہ زمانہ موجودہ بم بازی کا نہ تھا۔ ورنہ خدا جانے پیکٹ کھولنے کا انتظام کیونکر کیا جاتا۔ اسمیں سے بجائے بم کے نکلے۔ ۳۲ خط۔ جو میرے لئے بم کا حکم رکھتے تھے۔ قانوناً ایسے ہر خط کے لئے جس سے سرکاری محصول کو نقصان پہونچانا مقصود ہو۔ سزائے جرمانہ ۵۰ تک تھی۔ وہ پیکٹ پوسٹ ماسٹر جنرل کے حکم سے لغرض کارروائی ڈپٹی کمشنر ضلع کو بھیجدیا گیا۔ ڈپٹی کمشنر نے فوجداری مقدمہ قائم کرکے یورپین جنٹ مجسٹریٹ ضلع کے سپرد کردیا۔ عدالت سے سرخ لفافہ بہ قائمی مقدمہ خیرآباد میرے پاس آیا۔ یہ میرے لئے اس بم سے زیادہ تھا جو مجھ پر پھینکا جاتا۔ اللہ اس عمر میں یہ وقت کبھی نہ لائے۔ خواہ وہ بم ہو یا سرخ لفافہ۔ میں نے ڈاکے قتل زنا بالجبر وغیرہ کے دیگر جرائم میں سرخ لفافے دیکھے سنے تھے۔ میں سرخ لفافہ کے رازوروں سے کیونکر واقف ہوسکتا تھا کہ اس کا تعلق ڈاکخانہ سے ہے۔ کون ڈاکخانہ جس سے ذریعہ منی آرڈر وغیرہ بارش زر ہوا کرتی تھی۔ آج الیاسخ لفافہ۔ تو میں رنگ گل کی مناسبت سے عزیز صاحب کا گلکدہ نہ سمجھوں گا۔ کاکر کسی خیال سے بم کدہ سمجھنے میں مجھ کو تکلف نہ ہوگا۔ نصیب دشمناں اب مجھ پر یہ وقت کیوں آنے لگا۔ اب تو میں صرف غالب کی مرگ ناگہانی سے ڈرتا ہوں جس کے ساتھ "اور بھی"۔ دوستوں کی عنایت سے شاخ کفن کی طرح لگا ہوا ہے۔ مجھے ڈاکخانے کے بعض دفعات کا جرم کے متعلق دیکھ لینا ضروری تھا۔ اسی طرح اُس قانونی دفعہ کا جو متعلق جرم تھی۔ دوستوں سے بھی مدد لی وکیلوں سے بھی۔ مولوی محمد صادق۔ مولوی عبدالغنی۔ آغا عبدالغنی مرحومین کے سوا اور بھی تمام وکلاء نے یہی رائے دی کہ آپ عدالت میں صرف یہی کہیں کہ ناواقفیت سے یہ قصور ہوا۔

تاریخ پیشی پر جرمانے کے متعلق یہ سے ساتھ چھ سو کی تعداد میں نوٹ کم روپیہ زیادہ تھا۔ اور ایک ممکن بھی ساتھ تھا کہ زیادہ تعداد جرمانہ پر وہ کام آئے۔ سب پوسٹ ماسٹر خیرآباد سے صرف یہ سوال ہے کیا۔ آپنے دو گواہوں کے روبرو پیکٹ کیوں نہیں کھولا۔ جب آپکو اختیار تھا۔ اسی طرح اور گواہان ڈاکخانہ یعنی انسپکٹر اور سیتاپور کے پوسٹ ماسٹر سے یہ پوچھا۔ آپنے دو گواہوں کے روبرو پیکٹ کیوں..... کھولا۔ جب آپ کو بغیر گواہوں کے اختیار تھا

واب میں سب نے اپنی غلطی تسلیم کی۔ میں نے جب مذکورہ بیان دیا تو عدالت نے بار بار پوچھا۔ آپ کا کام پیکٹ وغیرہ بنانا ڈاک کا روانہ کرنا نہیں ہوسکتا۔ آپ اڈیٹر ہے۔ ڈسپیچر نہیں۔ میں ڈسپیچر تو سمجھا نہیں۔ ہر بار یہی کہا نا واقفیت سے قصور ہوا۔ گو تماشائیوں اور دوستوں کا ہجوم تھا۔ مگر کسی نے ڈسپیچر کو سمجھانے میں مدد نہ دی۔ آخر عدالت نے کہا لصہ جرمانہ اس لئے کیا جاتا ہے کہ اپیل ہوسکے۔ کاش میں پیکنگ وغیرہ کا ملزم ہوتا کہ جواب نہ دیتا خاموش رہتا۔ خوشی میں ملازم کے ہاتھ سے رومال چھوٹ گیا۔ روپئے گر پڑے۔ لوگوں نے اُٹھانے میں مدد دی۔ میں اجلاسی کمرہ سے لصہ داخل ہوتے ہی باہر تھا۔ جان بچی لاکھوں پائے۔ اپیل کا کیا ذکر۔ جب سے کبھی آجتک کوئی خط کسی پیکٹ میں نہیں رکھا مجھے افسوس ہے جنٹ مجسٹریٹ کی تحریری شکایات پر افسران ڈاکخانہ سب پوسٹ ماسٹر خیرآباد سزائے سرشتہ سے نہ بچ سکے۔

جنگ روم و روس کے زمانہ میں۔ عام تحریک ٹرکی چندے کی بہ ایمائے گورنمنٹ تھی۔ منشی ولایت اللہ کاکوروی تحصیلدار صدر نے۔ مخدوم شیخ سعد قدس سرہ العزیز کی درگاہ میں بمقام خیرآباد جلسہ کیا صدر کی تقریر ختم ہوتے ہی سب سے پہلے میں پانچسو کی رقم کا پرچہ کیطرف سے اعلان کیا جسکا اثر بہت زیادہ ہوا ہر ایک نے حوصلے کیساتھ چندہ دیا تحصیلدار صدر جو بہت ہی پرجوش مذہبی خیال کے بزرگ اور ضلع میں با اثر شخص تھے میرے اعلان اور اُس کے اثر سے اپنی کامیابی پر بہت ہی خوش اور میرے مداح تھے۔ یہ فائدہ مجھے ہوا کہ خسرہ کھتونی جمعبندی اور دیگر پٹواری کاغذات کی چھپائی کا روپیہ جو تحصیل میں تھا۔ چندے کے پانچسو جمع ہوکر مجھے چند روز میں مل گیا۔ اور میں اُس بیجا صرف سے بھی بچ گیا جو وصول زر کیلئے مجھے ہر تحصیل اور خزانے وغیرہ میں پیش آتا۔

جنگ روم و روس کے زمانے میں اودھ اخبار لکھنؤ کے سوا کوئی اردو اخبار روزانہ نہ تھا۔ میں نے ایک ہاتھ پریس خیرآباد سے موسوم بہ روزانہ تار برقی نکالا تھا۔ جس کی ترتیب اور تار برقی وغیرہ کے تراجم کا انتظام پائنیر اور دیگر انگریزی اخبارات سے محمد نور خانصاحب رسالدار رسالہ دار و دیگر افسران رسالہ نے انگریزی اور فوجی کلب سے کردیا تھا اور سیتاپور میں اشاعت و فروخت کا انتظام مسٹر...... انسپکٹر لین نے اپنے ذمے لیا تھا۔ یہ سیتاپور میں جتنے گہرے دوست میرے تھے اتنے ہی دشمن گورکھپور جاکر بزمانہ سپرنٹنڈنٹی ہو گئے تھے۔ یہ پرچہ کتابی تقطیع کے دو ورق پر چھپتا تھا۔ قیمت ایک پیسے کے دو پرچے مگر سیتاپور و خیرآباد کے سوا اور مقامات پر ایجنٹ ایک ہی پیسے کو فروخت کرتے تھے۔ یا جیسا موقع ہو۔ زیادہ تر کام کرنیوالے احباب تھے بعض کے پاس ریاض الاخبار بھی بلا قیمت جاتا تھا۔ ہر گلی کوچہ میں مختلف مقامات پر ذریعہ پیکٹ کارپردازوں کی معرفت سے فروخت کا انتظام میں اولیت ریاض الاخبار پریس خیرآباد ہی کو ہے۔ ریاض الاخبار کو بھی ولایتی اور ہندوستانی انگریزی اخبارات کے چیدہ دلچسپ تراجم جنگ کے متعلق جیسے ملتے تھے شاید اسوقت کسی دوسرے ہفتہ وار اخبار کو نہ ملتے ہوں۔ غازی عثمان پاشا معروف بہ رستم پلونا کی آخری جنگ روس درومانیہ و بلگیریہ سرد یہ سے زار روس کی کمان میں جس تفصیل اور جس شان سے ریاض الاخبار میں چھپی ہے دیکھنے کے قابل ہے۔ مگر اسوقت کے پرچے اب کہاں؟

(باقی)

ریاض۔ خیرآباد

ہر زبان کا دامن (اگرچہ وہ کتنی غیر علمی۔ کم مایہ اور محدود کیوں نہ ہو) شاعری کے رنگیں نقوش سے بقدر استعداد ضرور منقش ہوتا ہے۔ پنجابی کو علمی زبان نہیں کہا جا سکتا۔ اس کی بے سروسامانی اور کم مائگی میں کلام نہیں۔ لیکن بہ لحاظ شاعری اس کا مرتبہ ہمارے نزدیک خاص ہے۔ سائیں بلھے شاہ کی کافیاں تصوف کی جان ہیں۔" واقعہ نگاری و کردار نویسی" میں جو قدرت فضل شاہ کو حاصل ہے۔ نقادوں سے پوشیدہ نہیں دقیق فلسفیانہ مسائل کو خوبصورتی کے ساتھ شاعرانہ رنگ میں ادا کرنا اور تخیل کی کرشمہ زائیاں محمد بخش صاحب سیف الملوک پر ختم ہو چکا ہے۔ مختلف جنگ ناموں کا طومار۔ فارسی رزمیہ شاعری کی ٹکر کا ہے۔ بھکر اور ملتان کے مرثیہ خوان مجالسِ عزا میں جو مراثی (دوہے) پڑھتے ہیں۔ ہفت بند محتشم ان کی گرد کو نہیں پہنچتا۔ اخلاقیات کے لئے عبد الستار اور دلپذیر کا نام ہی کافی ہے۔

پنجابی عشقیہ شاعری کا چمن ہیر رانجھا۔ سہتی مراد۔ سسی پنوں۔ مرزا صاحبان۔ سوہنی مہینوال کے حسین و جمیل افسانہ ہائے عشق۔ جھوک۔ بیٹے۔ دوہے۔ باران ماہ۔ سی حرفی۔ کافی۔ ڈھولا اور ماہیا کے گلہائے تر سے کشمیر نظر آتا ہے۔ اگر شاعری اظہارِ جذبات کا نام ہے۔ تو بلاشبہ اردو فارسی زبانیں اسکا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔

اس زبان میں تخاطب۔ اقتضائے فطرت کے عین مطابق ہوتا ہے۔ یعنی عورت کا مرد سے۔ اور مرد کا عورت سے" اردو۔ فارسی کے ان مہمل تعلقات سے اسے واسطہ نہیں۔ جن سے فطرتِ انسانی ابا کرتی ہے۔

پنجابی کو امتیازی شان بخشنے والی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ عام طور پر خطاب عورت کی طرف سے کیا جاتا ہے۔ اور یہی وہ بات ہے جس نے پنجابی کو یکسر سوز و گداز بنا دیا ہے۔ علاوہ اس کے یہ بھی اس کا مابہ الامتیاز وصف ہے کہ اس میں باتوں کو ایچ پیچ دے کر بیان نہیں کیا جاتا۔ عسیر الفہم تشبیہات۔ وہمی و خیالی استعارات سے کلام کو رنگین نہیں کیا جاتا۔ بلکہ سیدھی۔ سادی باتیں دلکش و دل آویز پیرائے میں ادا کر دی جاتی ہیں جو تیر بن کر دل میں پیوست ہو جاتی ہیں۔

علاوہ ازیں۔ اردو فارسی کی طرح اسے ایران و عرب سے۔ فرہاد و مجنوں نہیں لانا پڑتے۔ کہ انکی

زبان ہی کوئی نہ سمجھے - بلکہ راجھا - مہینوال ایسے دہقان زادوں نے اپنے نعرہ ہائے عشق سے اس کے دشت و جبل کو گونجا رکھا ہے۔ یہ کبک دری - وعندلیب غزل خوان سے واقف نہیں - بلکہ کاگا کی کائیں کائیں - بھورا بھورا کی بھنبھناہٹ اس کے دل فریب نغمے ہیں۔ آج کی صحبت میں ہم اس صنف سخن سے گفتگو کرتے ہیں - جسے ماہیا کہتے ہیں۔

ماہیا کی قائل الفطرت دہقان زادی ہے۔ وہ اپنی روزمرہ کی کرخت کاروباری زبان میں سیدھے سادے طور پر اپنے جذبات وواردات قلب کا اظہار کرتی ہے۔ جس طرح بلبل، تان، سُر، سے واقف نہیں ہوتی - لیکن اپنے سوز بھرے چہچہوں سے دنیا کے جذبات میں تلاطم پیدا کر دیتی ہے، اسی طرح یہ کوہ وصحرا کی لڑکی اپنے ترانوں سے باوجود لسانی وعروضی اسقام کے عالم احساس کو مضطرب بنا دیتی ہے۔ اس کے عاشقانہ جذبات پرجوش اور سچے ہوتے ہیں۔ اس کے اشعار اس کی اپنی داستان درد اور اپنا پیام فراق ہوتے ہیں۔ جن جذبات کا اظہار کرتی ہے۔ وہ حقیقت و واقعیت پر مبنی ہوتے ہیں۔ اس کی ہر آواز دل سے ٹکرا کر نکلتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ماہیا جوش وتاثیر میں ڈوبا ہوا ہے۔

دیہات کی بے پردہ بودوماند اسباب معاش کی کمی اور شدت افلاس کا تقاضا ہے کہ کسب معاش (کاشتکاری) میں جنس لطیف صنف کرخت کے ہمدوش رہے۔ باپ ہل چلاتا ہے ماں مویشیوں کے لئے چارہ فراہم کرتی ہے۔ بیٹے بیٹیاں گلہ بانی کرتے ہیں۔ فصل بہار (عنفوان شباب) تک گل وبلبل کا ساتھ رہتا ہے۔ ایک تو انسان کا لفظ ہی کہے دیتا ہے کہ اس کا خمیر موانست ومحبت سے اٹھایا گیا ہے۔ جہاں انسان ہوگا عشق ہوگا پھر چراگاہوں کی وسعتیں۔ کوہ وصحرا کی خلوتیں۔ بیابان کی تنہائیاں۔ اور شبانہ روز باہمی اختلاط وارتباط - نہ روک نہ مخالفت۔ آگ اور بارود کا کام کرتا ہے۔ ان کے ننھے ننھے سینوں میں جذبات محبت نامعلوم طور پر پرورش پاتے رہتے ہیں۔ ایک دوسرے کی طرف بے اختیار کھنچا جاتا ہے۔ جب نخل عمر میں بور آنے لگتا ہے۔ لڑکی کو دشت میں ریوڑ چرانے سے روک دیجاتی ہے۔ اور لڑکے کو تلاش معاش کا آہنی پنجہ جبری طور پر غریب الدیار بنا دیتا ہے۔ دکھیا کسان دوزخ شکم کا ایندھن فراہم کرنے کالے کوسوں دور چلا جاتا ہے وہ آتش جو غیرارادی طور پر اندر ہی اندر پڑی سلگ رہی تھی۔ دفعتاً بھڑک اٹھتی ہے۔ دغیراختیاری کشش و مقناطیسیت اب رنگ لاتی ہے، ان کی پرسکون اور جامد زندگی میں ہیجان واضطراب۔ قلزم حیات میں قیامت زا تلاطم ومحشر انگیز تموج پیدا ہو جاتا ہے۔ اُس وقت دشت الفت کے یہ باؤلے پپیہے بیتاب ہو ہو کر چیختے ہیں۔ انکی "پی کہاں" کائنات کے ذرے ذرے کو مضطرب و بیقرار بنا دیتی ہے۔ انھیں جذبات وتاثرات کا نام ماہیا ہے۔

ماہیا اسوقت تک وجود میں نہیں آتا۔ جبتک قلوب نشتر عشق سے مجروح نہ ہوں۔ دل کے سازسے

اس وقت نغمے نکلتے ہیں۔ جب اسے مضراب درد سے چھیڑا جائے۔
چونکہ اس میں درد مہاجرت کے سوا کسی چیز کا ذکر نہیں ہوتا۔ ہوتا ہے تو کم۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ

"ماہیا ایک مستقل پیام فراق ہے"

اسمیں دلبر۔ دلربا معشوق۔ محبوب وغیرہ الفاظ کی بجائے صرف تین الفاظ۔ ڈھول۔ ماہی۔ چن (چاند) مستعمل ہیں۔ سادگی تمدن کی بنا پر پنجابی کسانوں نے خوش آہنگ سازوں، دلکش آلات موسیقی میں سے صرف ڈھول منتخب کرلیا ہے۔ پیانو۔ طاؤس بربط۔ ستار۔ جلترنگ کی خوش نوائیاں بانگ دہل کا لگا نہیں کھاتیں ڈھول پر کی ایک تھاپ ان پر وجد طاری کردیتی ہے۔ ان کے نزدیک اس سے بڑھ کر کوئی مطبوع و مرغوب شے نہیں معشوق کو ہمیشہ دل پسند اشیاء سے تشبیہ دیجاتی ہے۔ اسی لئے ماہیا میں معشوق کا استعارہ ڈھول سے کیا جاتا ہے ماہیا کی وجہ بھی وہی ہے۔ جو ڈھول کی ہے۔ غریب دہقان۔ قلاش کسان۔ بجلی اور گیس سے بہرہ اندوز نہیں ہوسکتا بلکہ وہ تو ان کا نام تک نہیں جانتا۔ سورج کی جھلس دینے والی کرنوں اور شدت تمازت کے مقابلہ میں وہ چاند کی ٹھنڈی ٹھنڈی فرحت بخش روشنی پسند کرتا ہے۔ بنابریں اسی پیارے اور سکون ریز چاند کو ذکر رخ معشوق کا غازہ بناتا ہے
ماہیا:۔ ماہ (چاند۔ ماہی یعنی ماہ من۔ اور الف ندائیہ یا زائد)

باوجودیکہ ماہیا یکسر لبریز محاسن ہے۔ اس میں ایک دو ایسے عیب پائے جاتے ہیں۔ جو اس کی اُجلے اور خوشنما دامن پر بدنما داغ ہیں۔

(۱) تائے فوقانی کا قافیہ طا۔ ٹا۔ با۔ بائے فارسی۔ قاف قرشت۔ وغیرہ حروف سے۔ اور کاف فارسی کا جیم دال وغیرہ حروف سے کیا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں کئی حروف ہیں جن کا آپس میں قافیہ ناجائز ہے۔ لیکن یہاں بے تکلف باندھے جاتے ہیں۔

(۲) ماہیا ایک ایسا شعر ہے۔ جس کے تین جزو (مصرع) ہوتے ہیں۔ پہلا مصرع (جز) عموماً بے معنی اور قافیہ کی تک بندی کے لئے لایا جاتا ہے۔ شاذونادر ایسا ہوتا ہے کہ تینوں ہم معنی ہوں۔

(۳) بعض اوقات۔ پہلے بامعنی جزو میں ایسا اُلجھاؤ پایا جاتا ہے کہ سمجھنے میں وقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ وہ اشخاص جن کی زبان پنجابی نہ ہو۔ بسا اوقات سخت الجھن میں گرفتار ہوکر ان ژولیدہ تارہائے ریشم کے سلجھانے سے عاجز آجاتے ہیں۔ پنجابی زبان اور اگر یہ نقائص دور کردیں تو بلا خوف تردید کہا جاسکتا ہے۔ کہ دنیا کی کوئی زبان اس کی نظیر نہیں پیش کرسکتی۔

(۱)

برسات اور اس کی کیفیتیں دنیا کو سرمست نشاط کررہی ہیں۔ اُودے اُودے بنبا بدوش بادل صلائے

بادہ و عشرت بنے ہوئے اُمنڈ رہے ہیں۔ ایک فراق زدہ عورت کے قلب نازک سے ہوک اُٹھتی ہے۔

بَدلی ساوَن دِی۔ کدن اُمید رکھاں ماہیے دی آون دِی

(پیا اب کے برسات میں آنے کا وعدہ کرگئے تھے۔ دور افق پر) ساون کی بدلی (نمودار ہوکر آمدِ برشگال کا مژدہ سنا رہی ہے) میں اپنے (پیارے) چاند کے طلوع ہونے کی کب تک منتظر رہوں جانے کب آئیں گی!!!

یا پہلے استفہامیہ انداز میں

ساون کی اودی اودی گھٹاؤ، بتا سکتی ہو۔ مرا مہ نیم ماہ میرے سیاہ خانہ کو کب منور کرے گا؟؟

پھر مایوس ہو کر کہتی ہے۔

یہ گھٹا نہیں بلکہ صدمات مفارقت۔ دود آہ۔ اور میری سیہ بختی نے مل کر ابر سیاہ کی شکل اختیار کرلی اب کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ چاند کی پیاری پیاری نازک کرنیں ان تیرہ و تار گھٹاؤں کو چیرتی ہوئی میرے ظلمت کدہ تک پہنچ سکیں۔ آہ پیا اب کے بھی دن بہار کے یونہی گزر گئے۔

کدن اُمید رکھاں۔ کب امید رکھوں؟ یعنی ناامید ہو جاؤں۔

(۲)

ایک عورت کا پتی پرلوک سدھار چکا ہے لاشہ سپرد خاک کرنے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی شوہر پرست بیوہ کو اپنے خاوند کی موت کا یقین نہیں۔ بلکہ جھگڑ جھگڑ کر لوگوں کو اپنا ہم خیال بنانا چاہتی ہے۔ اسی اثناء میں چولھا جس پر غسل کا پانی گرم کیا جا رہا تھا۔ سرد ہو جاتا ہے۔ آگ بجھ جاتی ہے۔ پانی گرم ہونے سے رہ جاتا ہے۔ وہ یہ حالت دیکھ کر لوگوں سے مخاطب ہوتی ہے۔ ؎

پانی نہیں تپیا۔ کیوں نی خدائیے ہنڈا ماہیا نہیں بچیا؟

لوگو! کیا میرے پیارے کو اب بھی مردہ تصور کرتے ہو؟ غسل کا پانی کیوں گرم نہیں ہوا؟ اس سے زیادہ زندگی کی کیا دلیل ہو گی؟

(۳)

ایک مجبور بلا عورت کو جسے اپنے "پی" سے جبراً علیحدہ کر دیا گیا ہے۔ جب یقین ہو جاتا ہے کہ میرا ستم کیش قبیلہ مجھے اپنے "قیس" سے کبھی نہ ملنے دے گا۔ ایک تیز پرواز باز سے مخاطب ہوتی ہے اور ایک عجیب انداز سے کہتی ہے ؎

بازا اُڈ چٹیا۔ ملن نہ دیندے۔ ڈھول نصیباں نہیں لکھیا

اے سفید باز" للہ اڑ" پیا پاس جانا اور کہنا۔ میرا قصور نہیں۔ ناراض نہ ہونا۔ امکان بھر سعی کر چکی ہوں۔ کوئی سبیل ملاقات کی نظر نہیں آتی۔ اور میرا قبیلہ تجھ سے ملنے نہیں دیتا۔

(۴)

بہار اور اس کی رعنائیاں مہجور دل پر کیا کچھ بجلیاں گراتی ہیں۔ اس کا اندازہ ذیل کے شعر سے ہوگا ؎

بیری بُور ہووے نہیں دل مندا ماہی اکھیاں تھیں دُور ہووے

بُور ۔ مور کو کہتے ہیں۔

"خشک" بیری" سرسبز و شاداب ہوکر" پھلنے پھولنے لگی۔ اب دل نہیں مانتا کہ میرا پیارا ماہی آنکھوں سے اوجھل رہے۔ بہار کی عیسےٰ نفسی" روکھی سوکھی جلی سڑی" بیری کو حیاتِ تازہ بخش دے اور میرے چمن میں خاک اڑتی پھرے۔ بہار کی اس ریاکاری پر دل خون اور ماہی سے ملنے کے لئے مضطر نہ ہو۔ تو کیا کرے۔

(۵)

ایک عورت کا خاوند پردیس میں ہے۔ جاہل ہے۔ خط نہیں لکھ سکتی۔ مفلسی قاصد بھیجنے کے لئے مانع ہے۔ کوا جسے رفیق ہجر کہا جاتا ہے۔ طوطے کی طرح آنکھیں بدل گیا ہے۔ نسوانی شرم و حیا اس ہجوم بلا پر مستزاد ہے۔ ورنہ گھر والوں سے قصۂ غم بیان کرکے قدرے تخلصی پاتی۔ اس عالم یاس میں صرف ایک ذریعہ باقی ہے کہ دوشِ صبا پر پیامِ فراق روانہ کرے۔ لیکن یہ محال ہے کہ اتنے فاصلہ پر آواز۔ آواز بھی وہ جس سے اُس کے اپنے گوش آشنا نہیں ہو سکتے۔ پہنچ سکے۔ اسی کیفیت کو ذیل کے شعر میں بیان کیا گیا ہے ؎

کھلی ہوئی وِچ ویہڑے۔ نکے نکے صدماراں گھر ماہیئے دے اینیں نیڑے

صَدَّ ۔ صدا ۔ آواز

صحن میں کھڑی ماہیئے کو بلا رہی ہوں" گھر والوں کا ڈر اور نسوانی شرم و حیا کے سبب" آواز بے حد مدہم اور آہستہ نکلتی ہے۔ اُس کا گھر قریب نہیں کہ میری درد بھری آواز وہاں تک پہنچ سکتی۔

(۶)

ایک عورت پنگھٹ پہ کھڑی تھی کہ اُس کا پیارا اُس کے روبرو ندی عبور کر کے پردیس چلا جاتا ہے۔ وہ اس سے متاثر ہوتی ہے۔ گھر پہنچتے پہنچتے جذباتِ غم اس کے قلب پر مستولی ہو جاتے ہیں اس حالت میں ایک سہیلی سے کہتی ہے ؎

پانی بھر آئیاں۔ اکھیں تکیندیاں ڈھول مُسافر کر آئیاں ،

میں دیکھتی رہی۔ میری پھوٹی آنکھیں اُن کے سفر کا "حادثہ جانکاہ" دیکھتی رہیں۔ اور میں نے کچھ نہ کیا۔ کیا تو یہ۔ کہ پانی بھر کر گھر چلی آئی۔ کیا میں اُنھیں پردیس جانے سے روک نہ سکتی تھی۔ اگر وہ میرے روکے نہ رکتے۔ تو کیا میں پانی میں ڈوب کر جان بھی نہ گنوا سکتی تھی کہ یہ "دردناک منظر" نہ دیکھتی۔

(۷)

قریب قریب اسی مضمون کا ایک اور شعر ہے ؎

بُمبل نکّی ہوسی۔ وداع کریندیاں جندڑی نکل نہ گئی ہوسی ،

"نکی برسات کے شروع میں پھلتی پھولتی ہے۔ بمبل ان ریشوں کو کہتے ہیں جو پودے کی چوٹی پہ ہوتے ہیں۔ یہ نرم نرم کونپلیں اُسوقت پھوٹتی ہیں۔ جب پودے کا شباب ہوتا ہے۔"

نکی میں بھٹے لگنے شروع ہوگئے۔ برسات آگئی۔ اس طرب افزا موسم میں میں اُسے اجازتِ سفر دیدوں۔ کیا الوداع کہتے ہوئے میری روح پرواز نہ کر جائے گی؟

(۸)

؎ اُٹھ لدے سراواں چو۔ دل دے بندے شالا کدی نہ ٹرن گراواں چو ،

اٹھ۔ اونٹ۔ گراں گاؤں۔ کدی۔ کبھی۔ چو۔ بیچ۔ شالا۔ خدا کرے۔ شاید انشاء اللہ کا مخفف ہو۔ کارواں آمادۂ سفر ہے۔ سراؤں میں سے چیزیں نکال کر اونٹ پر بار کیجا رہی ہیں۔ خدا کرے میرے پتیم کو گاؤں سے باہر (قافلہ کے ساتھ پردیس) کبھی نہ جانا پڑے!!!

(۹)

؎ سُتی نوں خواب آیا تا ئیاں پئی روندی مُکھ ماہیے دا یاد آیا ،

تائیاں - تپ ہی -
میں اس لئے رو رہی ہوں کہ اچانک کسی کی یاد نے میرے دل میں چٹکی لی - اور اُن کے "دور دست چہرہ" کی
تصویر میری آنکھوں میں پھر گئی - گویا میں سوتی اور ایسا خواب دیکھا جس کی تعبیر محال ہے -

(۱۰)

ے لیاں کپ رہیاں - آمل ماہیا اکھیاں تک تک تھک گیاں ،

کپ، کٹ - کاٹ - لئی ایک درخت کا نام ہے -
اے دوست لیاں کاٹ چکی ہوں (بہار جانے کو ہے) میری آنکھیں تمہارا انتظار کرتے کرتے
سفید ہوگئیں کیا اب بھی نہ آؤ گے !!!

(۱۱)

ے کانیاں دی اگ بالیں - میریا ماہیا ہُن لگیاں دی لج پالیں ،

کانا - سرکنڈا - خس وخاشاک - ہُن (ہنوز) اب، لج - لاج - لگی - محبت - آگ کا روشن ہونا یا کرنا -
پریتم - تم نے میرے دل میں محبت کی مقدس آگ روشن کر دی - اب اس کی لاج رکھنا - ایسا نہ ہو یہ آگ
خس وخاشاک کی آگ کی طرح وقتی و آنی ہو - اس آتش کدہ کو روشن رکھنا - تم پر فرض ہو چکا ہے -

(۱۲)

ے گجرا ونگ نال اے - نظر نہ آندے ساجھ جنہاں دے دم نال اے

گجرا - کانچ کی پھولدار چوڑی - ونگ - سادہ چوڑی - یہ دونوں دیہاتی عورتوں کی زینت کے لئے مخصوص ہیں
نال اے - ساتھ ہے - ساجھ - شرکت - بھروسہ اعتماد -
وہ نظر نہیں آرہے - جو ہماری زندگی کا باعث ہیں - حالانکہ گجرے اور ونگ کے درمیان تفریق نہیں ہوتی
کیا ان کی طرح ہم بھی لازم و ملزوم نہ تھے ؟

(۱۳)

ے چولے دی بانہہ ماہیا - ٹر نہیں ڈھولا - توڑے روٹھے رواں ماہیا

توڑتے۔ اگرچہ
پہلا جزو تک بندی کے لئے ہے۔ گو ہم روٹھے ہی رہیں۔ لیکن سفر پہ نہ جاؤ۔

فضل حسین تبسم۔ کیمبل پوری (منشی فاضل۔ ادیب فاضل)

کاجل۔ سُرمہ۔ چورن۔ منجن

(ایڈیٹر صاحب نگار نے خود ان کا استعمال کر کے اور اُنکا اطمینان کر کے اپنی رائے انکے مفید ہونے پر اکتوبر کے ملاحظات میں ظاہر کی ہے)

صرف یہ چار چیزیں میرے پاس ہیں۔ اور اگر آپ اعتبار کریں تو میں کہوں کہ اُن میں سے ہر ایک چیز پوری بیس سال سے میرے خاندان کی تجربہ میں ہے

کاجل۔ جو آنکھوں کے تمام امراض کیلئے بیحد مفید ہے۔ سلائی لگاتے ہی ٹھنڈی ٹھنڈی نیند سی آنے لگتی ہے۔ جنکی آنکھیں آشوب کرتی رہتی ہیں یا میلی ہو جاتی ہیں۔ یا سُرخی پیدا ہو جاتی ہے۔ یا نزلہ کا پانی آتا رہتا ہے۔ یا ضعف بصارت پیدا ہو چلا ہے۔ اُنکے لئے ہر روز رات کو ایک سلائی لگا لینا چند دن میں تمام شکایتیں دور کر دیتا ہے۔ ایک ڈبیہ جو ایک شخص کے لئے سال بھر کو کافی ہے۔ قیمت (عمر) علاوہ محصول۔

سُرمہ یہ بیش بہا سُرمہ ۲۰ دن میں تیار ہوتا ہے۔ اسمیں نہ ممیرہ ہے نہ کوئی جواہر، بلکہ معمولی سرمہ ہے جسکو جڑی بوٹیوں کے عرق میں پیسکر تیار کیا جاتا ہے۔ اس کے فوائد کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جالا، دھند، موتیا بند اور ضعف بصارت صرف ایک ماہ کے استعمال سے جاتا رہتا ہے۔ اور بارہا آزمایا ہوا ہے۔ قیمت فی پڑیا (عمر) علاوہ محصول

چورن یہ وہ اکسیری چیز ہے جسکا ہر گھر میں رہنا ضروری ہے۔ پیٹ کا درد، قبض، نفخ، ریاح کا پیدا ہونا، سوء ہضم، دستوں کا آنا سب بیک لخت اسکے استعمال سے جاتا رہتا ہے۔ کیسا ہی شدید درد پیٹ میں ہو فوراً ایک چٹکی کھانے سے جاتا رہتا ہے۔ قیمت فی ڈبہ ۲ تولہ عہ علاوہ محصول

منجن۔ اسکی ادنےٰ خوبی یہ ہے کہ ہلتے ہوئے دانت جم جاتے ہیں۔ قیمت فی ڈبہ ۲ تولہ (عمر) علاوہ محصول۔

نوٹ۔ سب چیزیں منگانیوالوں کو محصول ڈاک معاف۔

م۔ بیگم۔ نمبر ۲۴۔ نظیر آباد۔ لکھنؤ

باب المراسلۃ والمناظرۃ

منظور سروش (بھوپالی)

جنوری ۱۹۳۱ء کے نگار میں "ہمارے علمائے کرام کا عجیب و غریب نظریۂ دینی" کے عنوان سے جو مقالہ شائع ہوا ہے۔ اسے دیکھ کر بظاہر یہی خیال دل میں پیدا ہوتا ہے کہ مسئلہ زیر بحث یعنی جزا و سزا کے متعلق مولانا نیاز فتحپوری اور دیگر علمائے کرام کے درمیان اختلاف کی ایک ایسی وسیع خلیج حائل ہے جو کسی صورت سے نہیں مٹائی جا سکتی۔ اور میرے خیال میں اس سے زیادہ افسوسناک بات اور کیا ہوگی کہ ایک ہی مقدس مذہب کے پیرو اصولی مسائل میں انتہا درجہ کا اختلاف و تضاد رکھتے ہوں۔

یہ واقعہ محتاج بیان نہیں ہے کہ فرزندانِ توحید اسوقت دو گروہوں میں منقسم ہو چکے ہیں۔ ایک طرف قدیم الخیال طبقہ حضرات کا وہ طبقہ ہے جو "علما" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اور جسے یہ گوارا نہیں کہ اس کے مسلمہ اور قدیم معتقدات مذہبی میں کسی قسم کی مداخلت یا تبدیلی کیجائے۔ اس طبقہ کے نزدیک "کل بدعۃ ضلالۃ" کے ماتحت کم از کم مذہب میں کسی تغیر و اصلاح کی گنجائش نہیں ہے اور "الیوم اکملت لکم دینکم" کے ارشاد کے بعد عقائد و اعمال مذہبی میں جو تبدیلی بھی کیجائیگی وہ روحانی طور پر مہلک اور تباہ کن ہوگی۔

دوسری جانب جدید خیال اور جدید تعلیم سے متاثر ہو کر ایک ایسا فرقہ پیدا ہو چکا ہے جو جدید تمدن اور جدید تخیلات کے ساتھ ایک نیا "نظریۂ مذہب" بھی اختیار کرنا چاہتا ہے اور سابقہ اعتقادات و فلسفہ مذہب کو قطعاً نہیں تو بڑی حد تک موجودہ ضروریات کے لئے ناکافی بلکہ آجکل کی فضا کے مخالف تصور کرتا ہے۔ اور اسی کا نتیجہ ہے کہ وہ قدیم اصول معتقدات کو جدید لباس میں پیش کر کے انھیں نئے ماحول سے مطابقت دینے کی کوشش کر رہا ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں کے یہی دو مختلف الخیال فرقے "علمائے کرام اور مولانا نیاز" کی صورت میں "نگار" کے صفحات پر مصروفِ پیکار نظر آتے ہیں۔ اس جنگ کے اسباب کی ذمہ داری کچھ قدامت کی بیجا سخت گیریوں اور تنگ خیالیوں اور کچھ تجدد کی بے اعتدالیوں اور سینہ زوریوں کے سر عائد ہوتی ہے۔

میں اس وقت اس امر سے بحث نہیں کروں گا کہ ان دو فریقین کون صداقت پر ہے اور کس فریق کی رائے میں خود غرضی اور سخن پروری کا عنصر غالب ہے۔ بلکہ میں ایک "فرد مسلم" ہونے کی حیثیت سے

اپنا یہ فرض محسوس کرتا ہوں کہ مسئلہ زیر بحث میں فریقین کی آراء اور ان کے استدلالات کو بغور مطالعہ کرکے کوئی ایسی راہ پیدا کروں جس پر دونوں فریق کسی نہ کسی حد تک متفق ہو سکیں۔ اور اگر اختلاف بھی باقی رہے تو حتی الامکان کم سے کم درجہ تک باقی رہے۔

چنانچہ میں نے اس جذبہ کے ماتحت مذکورہ مضمون کو بغور پڑھا اور مجھے یہ عرض کرنے میں تامل نہیں کہ اس خاص مسئلے (یعنی اعمال حسنہ سے نجات کے تیقن یا عدم تیقن) میں دونوں فریق کے خیالات میں کافی یکساں اور اتحاد پایا گیا۔ سطور ذیل میں اسی احساس اتحاد کی وضاحت کرنا چاہی ہے۔ اور یہی اس مضمون کے لکھنے کی نہایت اصلی ہے۔

میرے خیال میں مولانا نیاز کی قائم کردہ تنقیحات میں سے تنقیح نمبر (۳) پر غور کرنے اور اس کے متعلق موصوف کے اور دوسرے علماء کرام کے خیالات معلوم کرنے کے بعد صاف واضح ہو جاتا ہے کہ خوش اخلاق غیر مسلم اور بد اخلاق مسلمان کی جزا و سزا کے بارے میں فریقین کی آراء ایک مرکز پر جمع ہو سکتی ہیں۔

ظاہر ہے کہ خوش اخلاق مشرک کو اس کے اخلاق حسنہ کا انعام کسی نہ کسی صورت سے ملنا ضروری ہے، اسی طرح بد اخلاق مسلمان کو بھی اس کے غیر مستحسن افعال کی سزا ضرور بھگتنا چاہیئے، یہاں قدرتاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اول الذکر کو جزا اور آخر الذکر کو سزا کس صورت سے ملیگی؟ اسی سوال کے حل پر فیصلہ کا دارو مدار ہے۔

مولانا نیاز فتحپوری نے اس مسئلے کے متعلق مضمون زیر بحث میں اپنے دو خیال ظاہر کئے ہیں ایک جگہ تو صفحہ ۱۰۵ پر فرماتے ہیں:۔

"......... میں اس وقت اس بحث میں نہیں پڑوں گا کہ مرنے کے بعد سزا یا جزا کا مفہوم نتیجہ خیز اور قابل یقین امر ہے یا نہیں؟ بلکہ میں اس کو حرف بحرف صحیح ماننے کے بعد ناجی و ناری کے مفہوم پر ایمان لاتا ہوں ...."

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کا یہ "ایمان مفروضہ" زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکا۔ چنانچہ اس کے بعد ہی دوسری جگہ صفحہ ۱۰۷ پر یہ الفاظ ادا کئے گئے ہیں:۔

"....... اس کا اثر ہماری ہی دنیاوی زندگی پر پڑنا چاہیئے" "دنیاوی زندگی" کی تخصیص میں نے اسلئے کی کہ اخروی زندگی کے ماننے کیلئے کوئی معقول وجہ موجود نہیں ہے۔ "

لڑکی نے ہندوستانی یا غیر ہندوستانی ہونیکے متعلق کچھ نہیں کہا۔ لیکن مادہابی کے سوال کے آخری حصہ کا جواب دیتے ہوئے اُس نے کہا "ہم ہندی اپنا پہلا میم صاحب کا پاس سیکھا"۔

اُس کی ٹوٹی پھوٹی زبان اور لب و لہجہ سے بالکل واضح تھا کہ وہ ہندوستانی نہ تھی۔

"تم کیا کام کر سکتی ہو؟" مادہابی نے پوچھا "میں برتن دھو سکتی ہوں"۔ اُس نے جواب دیا۔ اب اُس کے ساتھی نے بڑھ کر کہا "حضور جو کچھ آپ چاہیں گی وہ کرے گی"۔

سمارش بیتاب ہو رہا تھا بول اٹھا "نوکروں کا شہر میں کال نہیں ہے جو تم سڑک پر بات چیت کر رہی ہو۔ اب ہملوگوں کو جلدی چلنا چاہیئے"۔

مادہابی نے جواب دیا "ٹھہرو! چونکہ وہ خود آئی ہے۔ اس لئے وہ زیادہ نہیں مانگیگی۔ کھو کھا کو کھلانے والا کوئی نہیں ہے۔ یہ لڑکی مضبوط معلوم ہوتی ہے"۔

سمارش نے غصہ سے کہا "تمہارا جو جی چاہے کرو تم ہمیشہ روپیہ برباد کرنیکی فکر میں لگی رہتی ہو"۔

مادہابی نے اُس کے غصہ کا کوئی خیال نہیں کیا اور لڑکی سے پوچھا "تم کیا لوگی؟"

اُس نے جواب دیا "جو آپ کی خوشی"۔

مادہابی نے کہا "میں تمکو تین روپیہ اور کھانا دونگی"۔

"میں چاول نہیں کھاؤں گی میم صاحب" لڑکی نے کہا۔

"تو کیا چاہتی ہے بتاؤ؟" مادہابی نے مذاق کے لہجہ میں پوچھا۔

لیکن لڑکی نے بغیر مسکرائے ہوئے کہا "آپ مجھکو چاول دیدیا کیجیئگا میں خود پکا لونگی۔ ہملوگ باورچی کے ہاتھ کا پکا ہوا نہیں کھاتے ہیں"۔

سمارش نے ہنس کر کہا "اوہ! یہ ذات کے بارے میں بڑی کٹر معلوم ہوتی ہے۔ ہملوگ آریا النسل ہونے کے باوجود بھی ایسی سنتھال لڑکی کے لئے کافی نہیں ہیں"۔

"بہت اچھا میں تمکو بغیر کا ہوا کھانا دوں گی اور تین روپیہ مہینہ" مادہابی نے کہا۔

لڑکی بالکل مطمئن معلوم ہوتی تھی۔ مادہابی نے کہا "میں تم کو اپنا پتہ دونگی اور تمکو وہاں ٹھیک ۶ ربجے پہونچ جانا چاہیئے۔ ہاں تمہارا نام کیا ہے؟"

"بھٹکی" لڑکی نے جواب دیا اور مادہابی سے پتہ لیکر چلی گئی۔

مادہابی نے سمارش سے کہا "تم ہمیشہ میرے روپیہ برباد کرنے کی شکایت کرتے ہو۔ اگر اُس نے رہنے کا فیصلہ کر لیا تو ایسا معلوم ہوگا کہ وہ خدا کی طرف سے بھیجی ہوئی ہے۔ کلکتہ میں اگر تم ایک آیا رکھنا چاہو تو فوراً

بیس روپیہ مشاہرہ مانگیگی اور کھانا اور رہنے کی جگہ۔ بجائے اس کے اگر کوئی خادمہ تمکو تین روپیہ ماہوار پر ملتی ہو۔ تو یہ فضول خرچی ہے۔"

"تمہاری مرضی جو چاہو کرو۔ میرے پاس جو کچھ تھا وہ سب تمہارا ہو چکا ہے یہانتک کہ میں بھی، کیا میں کچھ اس سے بھی زیادہ دے سکتا تھا؟"

"میں امید کرتی ہوں کہ تم اس کو یاد رکھو گے۔" ماوا بی نے کہا "اگر میں پہلے مرجاؤں تو میری ملکیت جا کر کسی دوسری عورت کو نہ دیدینا۔"

جواب میں سمارش صرف ہنسا۔

(۴)

دوسرے دن علی الصباح ٹھیک ۸ بجے بھٹکی اپنے کام پر پہونچ گئی۔ اس کے گلے میں تسبیح والی دتیوں کا چار لڑا مالا تھا اور اُس نے مضحکہ خیز اور تعجب انگیز طریقہ پر بہت سا سرخ فیتہ لپیٹ رکھا تھا۔ ماوا بی بلدی سے اپنی خمار آلود آنکھوں کو ملتی ہوئی اُٹھی اور اُس نے اپنے شوہر سے کہا "دیکھو وہ کیسی وقت کی پابند ہے گرچہ وہ صرف تین روپیہ مشاہرہ پاتی ہے۔ برعکس اس کے تمہارا بیرا جو بارہ روپیہ پاتا ہے اب تک سو رہا ہے۔ کھوکھا کو صبح کی ہوا خوری کیلئے ۹ بجے سے قبل کبھی نہیں لیجا سکا۔ میں یوں ہی فضول کھوکھا کے لئے آیا نہیں چاہتی تھی۔ یہ نکمے نوکر مجھکو پاگل کئے ہوئے ہیں۔"

جیسے ہی بھٹکی اندر داخل ہوئی کھوکھا نے اُسکی طرف تعجب کی نظروں سے دیکھا اور پوچھنے لگا۔ "یہ کون ہے اماں!"

"وہ تمہاری آیا ہے" ماں نے جواب دیا۔

کھوکھا نے ماں کا منھ دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا اور اپنی طرف گھما کر پوچھنے لگا "آیا کیا کریگی؟"

"وہ تمہارے ساتھ کھیلے گی، باہر ٹہلانے کو لیجائے گی اور تمکو اچھے اچھے قصے سنائیگی۔" کھوکھا خوشی کے مارے اُچھلنے لگا اور ہمہ تن متوجہ ہو کر پوچھنے لگا "کون قصہ وہی بلی اور سیار والا۔"

اُسکی ماں نے تنگ آکر جواب دیا "جاؤ اسی سے پوچھو۔"

کھوکھا پہلے پہل کچھ شرمایا اُس نے اپنی ماں کی ساری کے آخری حصہ کو زور سے پکڑ لیا اور گھٹنوں کے بل کھڑا ہو گیا۔ لیکن وہ رہ رہ کر بھٹکی کی طرف توہم کی نگاہوں سے دیکھتا جاتا تھا۔ گرچہ بھٹکی بہت متین معلوم ہوتی تھی لیکن وہ بھی مشکل سے ہنسی کو روک سکی۔ اس نے "آؤ بابو" کہتے ہوئے اپنے ہاتھوں کو پھیلا دیا۔

یہ ایک پکار کھو کھا کے دل پر فتح پانیکے لئے کافی تھی وہ اس کے بازوؤں پر اُچھل کر چلا آیا اور چمٹکر کہنے لگا "مجھکو اچھے اچھے قصّے سناؤ۔"

(۳)

بھبکی اپنے کام کو عبادت کی طرح انجام دیتی تھی، صبح کی تاریکی دور ہونے سے پہلے ہی بھبکی کھو کھا کے استعمال کے برتنوں کو اکٹھا کرتی اور اپنی کلائیوں سے جھن جھن کا شور برپا کر دیتی۔ کتنا ہی سویرا کیوں نہ ہو ماما بی اُسکو اپنی خوابگاہ کے دروازہ، کھو کھا کو لینے کے لئے مستعدی کے ساتھ کھڑا ہوا پاتی تھی۔ اُس کی سخت پابندی کی وجہ سے ماما بی اور سارش کو مجبوراً معمول سے پہلے اُٹھنا پڑتا تھا۔ سارش نے پہلے تو اس پر اعتراض کیا گر وہ ماما بی کا مقابل نہ تھا "نہیں! نہیں!! یہ اچھا نہیں ہے۔" وہ کہیگی "تم گرم کملوں کے نیچے سوتے رہتے ہو، جبکہ اللہ کی ایک مخلوق تمہارے حکم کی تعمیل کے انتظار میں تمہارے دروازہ پر سردی سے ٹھٹھر رہی ہے!" تمکو یورپشینوں کے بُرے اطوار کی نقل اتارنے کی ضرورت نہیں ہے۔

ان کے کمرہ سے متصل دکھن جانب ایک بڑا برآمدہ تھا۔ سرد ہوا کے جھونکے باغ کے سارے درختوں کو ہلاتے ہوئے تیر کی طرح کمرہ کے اندر رہنے والوں کے جسموں کو چھیدتے ہوئے اندر گھس آتے تھے۔ بھبکی کے پاس سوتی ساری کے سوا کوئی گرم کپڑا نہ تھا۔ اس لئے سارش کو اپنا سرخ کمل چھوڑ کر اٹھنا پڑتا تھا اگرچہ بہت ہی بیدلی کے ساتھ۔

جیسے ہی وہ اٹھتا کو کھا بھی اُچھل کر کھڑا ہو جاتا۔ اُس کے لئے بھبکی کی دل موہ لینے والی باتوں کی یاد جادو کی اُس سنہری چھڑی کا کام دیتی تھی، جس کے مس کر دینے سے شاہزادی اپنی دائمی نیند سے بیدار ہو گئی تھی۔ وہ بستر پر سیدھا کھڑا ہو جاتا اور اپنے گھونگھر والے بالوں کو اپنے منہ پر سے ہٹاتے ہوئے چلاتا "بابا مجھکو نیچے اتار دو میں بھبکی کے پاس جانا چاہتا ہوں۔"

اُسکی ماں کہتی "کیا احسان فراموش لڑکا ہے۔ رات بھر مجھکو دیکھنا پڑتا ہے کہ کمل کو بدن سے علحدہ نہ کر دے ...... میں بہلاتی ہوں، پیار کرتی ہوں، لیکن جیسے ہی صبح ہوتی ہے یہ سب کچھ بھول جاتا ہے اور چلاتا ہے، میں بھبکی کے پاس جانا چاہتا ہوں، جا چلا جا بد معاش میں تیرے پاس پھر نہیں آؤں گی اور دیکھیں رات کو تیرے ساتھ کون سوتا ہے!"

کھو کھا اپنے مچھلی جیسے ہاتھوں کو ہلا ہلا کر کہتا "بہت اچھا ہم بھبکی کے ساتھ سو دیں گے۔"

اسکی ماں کہتی "بندر کہیں کا۔"

کھوکھا فوراً ٹھبکی کے بازوؤں پر اُچھل کر چلا جاتا اور کہتا "میں آگیا ٹھبکی مجھے پیار کرو"
ٹھبکی چاروں طرف ایک دزدیدہ نگاہ ڈالتی اور کھوکھا کا منھ چومنے لگتی وہ خوفزدہ تھی کہ کہیں ماد بابی دیکھ نہ لیں کیونکہ انھوں نے بچہ کا منھ چومنے کی ممانعت کردی تھی کیونکہ یہ حفظان صحت کے اُصول کے خلاف تھا۔
کھوکھا جب ناشتہ کرلیتا تو وہ اور اُسکی کھلائی دونوں باہر چلے جاتے اور باغ میں بڑے نیم کے درخت کے نیچے بیٹھتے ۔ بعض مرتبہ مالی، ہیرا، اور مہترانی بھی آکر بیٹھتے اور کھوکھا کو پھول اور پھل پیش کرتے ۔
ٹھبکی ایک بانس کے بنے ہوئے اسٹول پر بیٹھتی۔ آفتاب پوری آب وتاب کے ساتھ اُس کے منھ پر چمکتا اور کھوکھا ایک چھوٹی سی پہیہ والی کرسی پر بیٹھتا۔ اور آفتاب اُس کی پیٹھ پر پڑتا تھا۔ بڑی سردی ہے کھوکھا بابو اور میرے پاس کپڑے نہیں ہیں"
کھوکھا کا دل فوراً رحم کے مارے پگھل جاتا اور وہ اُسکو تسلی دیتے ہوئے کہتا "میں کل تمہارے لئے دوکان سے کپڑے خرید دونگا۔ میں تمہارے لئے ایک نیا کوٹ لا دونگا۔ پھر تم اپنے ہاتھوں کو جیب کے اندر رکھکر سڑک پر ٹہلنا۔ اور اپنے پرانے کپڑے پھینکدینا"
ٹھبکی پھر پوچھتی "اور کیا لادوگے کھوکھا بابو"
"میں تم کو دونگا۔ آلو چاپ ۔ نارنگیاں۔ مٹھائی اور سب چیزیں"
چھوٹا سخی داتا جواب دیتا۔
مالی پانی چھڑکنے کا برتن لئے ہوئے آتا اور پوچھتا "مجھکو کیا دیجیگا مالک"
کھوکھا کے چہرہ پر متانت آجاتی اور کہتا "ماما تمہارے لئے چیزیں خریدینگی"
ہیرا پوچھتا "میرے لئے کچھ نہیں کھوکھا بابو"
کھوکھا تنگ آجاتا اور چلاتا "جاؤ میں تمہیں نہیں چاہتا"
ٹھبکی فاتحانہ انداز سے دیکھتی اور بچے کو اپنی آغوش میں کھینچ لیتی۔

(۴)

شام کے وقت کھوکھا ہوا خوری کے لئے قریب کے میدانوں میں گیا تھا۔ مادھابی موسم خزاں کے سہ پہر کی مختصر نیند سے بیدار ہوئی اور اُس نے دیکھا کہ کھوکھا اُس کے کمرہ میں نہ تھا لیکن تمام

بکس کھلے ہوئے تھے۔ جب کھوکھا یہاں نہیں ہے تو کس نے ایسا کیا ہوگا؟ وہ باہر آئی اور اُس نے نوکروں سے دریافت کیا لیکن اُسکو کوئی تشفی بخش جواب نہ مل سکا۔

جاڑے کی مختصر شام جلدی سے ختم ہو گئی۔ راستے اور میدانوں کو نرم اور سرد چھوڑ کر اور درختوں کے سروں سے روشنی کا تاج چھین کر سورج ڈوب رہا تھا۔ مادہابی نے دہان کے کھیتوں کی طرف نظر کی اور دیکھا کہ راستہ کا کنارہ خیموں سے بھرا ہوا ہے جس کو ایک خانہ بدوش جماعت نے نصب کیا تھا۔ عورتوں نے آگ جلا رکھی تھی اور مٹی کے برتن میں کھانا پکا رہی تھیں۔ مادہابی نے خیال کیا کہ غالباً یہی لوگ آئے ہونگے کہ موقع ملے تو کچھ چرالیں اور خوفزدہ ہو کر چیزوں کو الٹ پلٹ چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ وہ یہ معلوم کرنے کے لئے کہ وہ اپنی کسی چیز کو پہچان سکتی ہے یا نہیں۔ کھڑکی کے باہر مدابر دیکھتی رہی۔ جھمکی کا سر جو سرخ فیتوں سے سنوارا ہوا تھا سڑک پر نمودار ہوا۔ لیکن کھوکھا کی گاڑی پر کون بیٹھا ہوا ہے؟ ..... وہ قوس وقزح کے تمام رنگوں کی پوشاک پہنے ہوئے نظر آتا تھا لیکن جب وہ نزدیک پہونچے تو مادہابی صاف دیکھ سکی کہ یہ کھوکھا کے سوا کوئی دوسرا نہ تھا۔ وہ ایک سرخ مخمل کا پتلون اور ساٹن کا کوٹ پہنے ہوئے تھا۔ اوس کے اوپر وہ ایک چمکدار گلابی اونی چادر اوڑھے ہوئے تھا اور اُس کے چھوٹے چھوٹے پیر سبز موزوں اور سفید جوتے سے ڈھکے ہوئے تھے۔ ایک ٹوپی جس پر سنہرے کلابتوں کا کام بنا ہوا تھا اُس کے سر پر تھی۔ جھمکی نے تمام بکسوں کو چھان مارا تھا اور کھوکھا کو پہنانے کیلئے جو چیز اُس کی نظر میں بھڑکیلی معلوم ہوئی اُس نے اُس کو نکال لیا تھا۔ خوبصورت خوبصورت کپڑے جن کو مادہابی نے بڑی جانفشانی سے جمع کیا تھا سارے کے سارے غارت ہو گئے تھے۔ مادہابی غضبناک ہو گئی اور جیسے ہی قصوروار کمرے میں داخل ہوئی وہ اس پر برس پڑی "بدمعاش! تونے یہ کیا کیا؟" وہ چلائی "پہنانے کے لئے اس گرم سوٹ پر تیری نظر نہ پڑی"

جھمکی نے متانت سے جواب دیا "کھوکھا بابو میلے کپڑے نہیں پہننا چاہتے .... مجھکو شرم آتی ہے"

مادہابی نے کہا "اوہو بڑا نواب بنا ہے ...... اُسکو میلی چیزوں سے شرم معلوم ہوتی ہے ...... چلی جا بدذات .... میرے بچے کو مت چھو"

جھمکی نے بچے کو رکھ دیا اور کہتا ہے بیٹھ گئی "جھمکی! جھمکی!!" چلا کر کھوکھا نے سارے گھر کو سر پر اُٹھا لیا۔ اس پر بھی جھمکی کو اس کے قریب آنے کی ہمت نہ پڑی۔ شدت غم سے کھوکھا زمین پر لوٹنے لگا۔

"کیسا بندر ہے"۔ مادہابی نے کہا "اب اس کے ڈر سے ٹھبکی کو کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا ہے ۔ اس کو لیجا۔ مگر میرے بکس کو چھونے کی پھر جرات نہ کرنا"

ٹھبکی نے حسب دستور اپنے متین چہرہ کے ساتھ کھوکھا کو گود میں لے لیا اور باہر چلی گئی ۔ جب وہ اتنی دور چلی گئی کہ جہاں سے مادہابی تک اُسکی آواز نہیں پہونچ سکتی تھی تو اُس نے آہستہ سے کان میں کہا "کھوکھا بابو تم بہت امیر ہو۔ جب تم بڑے ہو جاؤ گے تو منوں سونا اور چاندی پہنو گے ۔ تم بادشاہ ہو جاؤ گے ۔ بیرسٹر ہو جاؤ گے"

"نہ ام ۔ نہ ام" کھوکھا نے کہا "میں کھوکھا رہوں گا"

جیوں جیوں دن گذرتا گیا مالی روز بروز کھوکھا کی محبت کا زیادہ دلدادہ ہوتا گیا ۔ وہ شاید ہی اُس کے نزدیک سے غیر حاضر رہتا ۔ صرف ایک نوکر کلکتہ سے ساتھ آیا تھا ۔ لیکن وہ بہت سست تھا ۔ کلکتہ میں مادہابی کو برآمدہ اور کمروں کو صاف کرنے کے لئے روزانہ ڈانٹ ڈپٹ کی ضرورت پیش آتی تھی لیکن اُس نے محسوس کیا کہ یہاں ایک وسیع باغ کی خبر گیری اُس کے لئے ناممکن ہوگی کیونکہ تنبیہ اور ترغیب دونوں بیکار ثابت ہو چکے تھے ۔ اب اُس کو شوہر کے ساتھ ایک جنگ کرنی پڑی کیونکہ وہ ایک مالی رکھنا چاہتی تھی اور حسب معمول آخر کار اُسی کی بات رہی ۔

شروع شروع میں مالی بہت کم کام کرتا تھا ۔ وہ پودوں اور درختوں میں پانی دیتا اور ڈرائنگ روم کے گلدانوں کو بہت سے پھولوں سے سجاتا ۔ کمرہ تازہ پھولوں کی خوشبو سے مہک اُٹھتا اور پرانی دیواروں اور پرانے فرنیچر میں ایسی شان رعنائی پیدا ہو جاتی کہ سارش بھی ایک ضرورت سے زیادہ نوکر رکھ لینے کی شکایت کو بھول جاتا ۔ لیکن مادہابی اُن نوکروں کو پسند نہیں کرتی تھی جو ہمیشہ اپنے جائز فرائض سے پہلوتہی کرتے تھے ۔ مالی گھر کا ایک کام بھی نہیں کرتا تھا اور صاف صاف زور سے کہدیتا تھا کہ وہ باغ کی دیکھ بھال کے لئے مقرر کیا گیا ہے نہ کہ دوسرے نوکروں کا کام کرنے کے لئے ۔

لیکن دفعتاً اُس کو ایسا محسوس ہونے لگا کہ اُسکو بہت فرصت ہے ۔ اُسکو پرانے نیم کے درخت کے نیچے کھوکھا کے پاس بیٹھے ہوئے یا کھوکھا کو کندھے پر چڑھا کر اِدھر اُدھر لئے پھرتے دیکھا جاتا تھا ۔ ٹھبکی ایک شاہانہ انداز کے ساتھ اُس کے پیچھے پیچھے رہتی اور اُس کے ہاتھوں میں کھوکھا کی ٹوپی یا گرم چادر ہوتی ۔ وہ آقا معلوم ہوتی اور اُدریا مالی اُس کا خادم معلوم ہوتا ۔

مادہابی اس نظارہ کو دیکھ کر بھڑک اُٹھتی "دیکھو اس آدمی کو" وہ کہتی "میں نے اسکو رکھا تھا کہ باغ کے کاموں سے فراغت کر کے کھوکھا کو تھوڑی دیر کے لئے کھلایا کرے ۔ لیکن وہ میری کبھی نہیں سنتا ۔

پودوں میں پانی دینے اور پھولوں کے چھانٹنے میں معلوم ہوتا ہے جیسے دن بھر کی محنت کی ضرورت ہے۔ لیکن وہ اس سنتھالی لڑکی کے پیچھے پیچھے دن بھر پھرا کرتا ہے۔ میں عنقریب اُس کو ایکدن لات مار کر باہر کردونگی میں اس قسم کے رابطہ کو برداشت نہیں کرسکتی"۔

"تم بیکار کیوں غصہ ہوتی ہو؟" اُس کا شوہر کہتا "وہ بھی انسان ہیں اور اپنے اندر فطرتی محبت اور دوستی کا جذبہ رکھتے ہیں"۔

"لیکن یہ بالکل ان ہونی بات ہے"۔ اُسکی بیوی جواب دیتی " وہ لڑکی ایک سنتھال ہے اور مالی اُوڑیا ہے۔ ان کی دوستی کا فائدہ ہی کیا ہے؟"

"لیکن تم تو سوشل ریفارم کی بہت بڑی مبلغ تھیں"۔ سمارش نے کہا" اگر وہ غریب اور غیر متمدن ہیں تو یہ کوئی وجہ نہیں ہے کہ وہ تمہاری ہمدردی سے فائدہ نہ اُٹھائیں"۔

لیکن مادھابی کو یہ امر تسلیم کرنا پڑا کہ مالی نے کام میں نمایاں ترقی کی ہے۔ آج کل کھوکھا کے نہلانے کا پانی لانیکے لئے کسی کو چلانا نہیں پڑتا تھا۔ جیسے ہی ٹھبکی کھوکھا کو نہلانے کے لئے تیار کرتی اودے مالی پانی لے کر فوراً حاضر ہوجاتا۔ اگر مادھابی ٹھبکی کو کچھ لانے کے لئے کہتی، اودے ٹھبکی کے اُٹھنے سے پہلے ہی دوڑ پڑتا جب ٹھبکی کھوکھا کو نیچے اتار دیتی، اودے فوراً اُٹھالیتا۔ کھوکھا بہت ضدی اور ہٹی ہوگیا تھا اور لباوتی ٹھبکی بھی تنگ آجاتی۔ مگر اودے کو کبھی جبر نہ ہوتا وہ لڑکی کو مصیبت سے چھڑانے کے لئے اپنی پوری طاقت کے ساتھ چھوٹے ظالم کو بہلانے کی ان تھک کوشش کرتا۔ ٹھبکی کو خوش کرنیکی کوشش کرتے ہوئے اس نے ایک ایک کرکے سب کو خوش کرنیکی کوشش کی۔

(۵)

ہاٹ کے دنوں میں لباوتی ٹھبکی اپنی ضرورت کی چیزیں خریدنے کی غرض سے چند گھنٹوں کی اجازت لیتی۔ اس اثناء میں کھوکھا بے صبری کے ساتھ اس کا انتظار کرتا اور اپنی ماں سے ہزار بار پوچھتا "اماں ٹھبکی کہاں گئی؟"

ہر ہفتہ قریہ میں بازار لگا کرتا تھا۔ درمیان میں ایک برگد کا درخت تھا جس کے نیچے چھوٹی دکانیں لگائی جاتی تھیں۔ بیچنے والے زمین پر اپنی چٹائیاں بچھاتے تھے جن کے اوپر وہ اپنی چیزیں قرینے سے سجا دیتے تھے۔ چاول، دال، مچھلی، سبزی اور مختلف قسم کی چیزیں وہاں مہیا ہوتی تھیں۔ رنگین ساریاں۔ چھپی ہوئی اور سادی، خوشنما، موتیوں کی لڑ، کانچ کی چوڑیاں، بال میں لگانے کے کانٹے اور

کنگھیاں، غرضکہ دیہاتی حسن کی زیبائش کا سب سامان موجود تھا۔ اُودے باورچیخانہ کے لئے مچھلی اور ترکاری لیکر واپس آرہا تھا۔ کھبکی ایک کنگھی، ایک بوتل ریندی کا تیل، اور ایک ٹین کی ڈبی لئے جارہی تھی۔ یکایک ایک عورت اُس کے سامنے نمودار ہوئی۔ وہ ایک سرخ ساری جس کے اوپر بڑے بڑے زرد پھولوں کے بوٹے تھے پہنے ہوئے تھی اور اپنے سر پر کانچ کی چوڑیوں کا ایک ٹوکرا لئے جارہی تھی "چوڑی لوگی؟" اُس نے پوچھا۔

کھبکی نے رنگ برنگ کی چوڑیوں کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا اور فوراً ہی اپنی آنکھیں پھیر لیں۔ "تم چوڑی کیوں نہیں لیتی ہو؟" عورت نے پوچھا۔

"میرے پاس پیسہ نہیں ہے" کھبکی نے کہا۔ اُودے نے ایک شرمیلی مسکراہٹ کیساتھ کہا "چوڑی ضرور لو۔ میں قیمت دیدونگا"

کھبکی کے جذبۂ خودداری کو ٹھیس لگی اور وہ آگے چلی گئی "کون مانگتا ہے" اُس نے غصہ سے پوچھا "کیا تم سمجھتے ہو کہ میں تمہارے دو پیسہ کی سنگار کی چیزیں لیکر شاہزادی ہو جاؤں گی؟" وہیں سامنے ایک دوکاندار چاندی کی زنجیریں، کڑے، اور ربچوبخیاں بیچ رہا تھا۔ اودے دوکان میں داخل ہوا اور اس نے زنجیر اُٹھالی "یہ لوگی؟" اُس نے پوچھا۔

کھبکی اور زیادہ غضبناک ہوگئی "جا! بدمعاش کہیں کا" اُس نے کہا "میں تجھ سے تحائف کیوں لینے لگی؟"

اودے نے اُس کے کان میں کچھ آہستہ سے کہا۔ انداز سے معلوم ہوا کہ اس سے کھبکی کچھ نرم ہو گئی اور وہ ایک مربیانہ انداز سے مسکرائی۔ اودے نے زنجیر کی قیمت دیدی اور زنجیر اُس کے گلے میں ڈالدی۔

جیسے ہی وہ گھر پہونچے کھوکھا نے ایک طوفان برپا کر ڈالا۔ وہ کھبکی کی زنجیر مانگتا تھا۔ کھبکی اُسس کو بہلاتے ہوئے شرماتی تھی مگر چھوٹا ظالم اس کے بغیر مانتا نہ تھا۔ آخرکار مادہابی آگئی اور اُس نے پوچھا "یہاں کیا ہو رہا ہے؟ میں نے اس کے قبل زندگی میں کبھی ایسا شور نہیں سنا تھا"

"کھوکھا بابو یہ زنجیر مانگتے ہیں" کھبکی نے اپنی شرمائی ہوئی آنکھوں کے ساتھ کہا۔

"کھوکھا چھی! چھی!!" اُس نے کہا "تم ایسی چیزیں کیوں مانگتے ہو؟ تم بہت بیوقوف ہو۔ تم کو کھبکی کا زیور نہیں پہننا چاہیئے"

"مہربانی کرکے کھوکھا کے لئے ایک خرید دیجئے میم صاحب" کھبکی نے بزدلانہ انداز سے کہا۔

"پاگل ہوئی ہے" مادہابی نے کہا "ایسی چیز و نکے خریدنے کا فائدہ کیا ہے؟"

یکایک اُس نے کچھ محسوس کیا" تو یہ زنجیر کہاں سے لائی ہے؟" اُس نے لڑکی سے دریافت کیا "تجھکو صرف تین روپیہ ملتا ہے۔ تو اسباب زینت کیونکر خرید سکتی ہے؟"

ٹھبکی خاموش رہی" جواب کیوں نہیں دیتی ہے؟" مادہابی نے پوچھا۔

ٹھبکی نے تامل کیا اور پھر بولی"۔ کسی نے مجھکو دیا ہے۔"

مادہابی کو شک ہوا اور اُس نے جرح کرنا شروع کی۔"وہ کسی نے کون ہے؟"

"اودے" ٹھبکی نے شرماکر جواب دیا۔

مادہابی غضبناک ہو گئی کہ تجھکو اودے کی تحفہ کو میرے سامنے اکڑکر دکھلانیکی کیسے جرات ہوئی؟ وہ تیرا کون ہے؟"

ٹھبکی چپ چاپ کھڑی رہی" تو سیدھے جہنم میں جارہی ہے۔" مادہابی نے اپنی گرج کو جاری رکھتے ہوئے کہا "تجھکو اُس کے ساتھ اِدھر اُدھر جاتے ہوئے ڈر نہیں معلوم ہوتا ہے؟ وہ تیرے ساتھ کبھی شادی نہیں کرے گا؟"

"ہاں! میم صاحب"۔ٹھبکی آخرکار خوفزدہ ہوکر بولی" اس نے میرے ساتھ شادی کرنے کا وعدہ کیا ہے۔"

"وہ کچھ نہیں کرے گا" مادہابی نے کہا" تجھکو ذات کھو جانے کے خوف سے میرے یہاں کا پکا ہوا کھانے میں ڈر معلوم ہوتا ہے..... تو اس اوڑیا کے ساتھ شادی کرنے پر کیسے راضی ہو سکتی ہے؟"

ٹھبکی کی آنکھیں آنسو سے ڈبڈبا گئیں" میرا کوئی دوست یا رشتہ دار نہیں ہے میم صاحب۔"

اُس نے کہا"۔ اس لئے ذات کا کیا فائدہ ہے؟ اگر وہ میرے ساتھ شادی کرے گا اور مجھکو اوڑیا بنائے گا تو میں کسی کو اپنا کہہ سکوں گی۔"

مادہابی کچھ اور زیادہ نہ کہہ سکی۔ ٹھبکی نے کھوکھا کو گود میں لے لیا اور باہر چلی گئی۔ باغ میں کوئی نہ تھا۔ وہ ایک پھول کے درخت کے نیچے بیٹھ گئی اور اپنی زنجیر اُتار کر اس نے کھوکھا کے گلے میں ڈالدی۔ کھوکھا نے اپنی باہیں اُس کے گلے میں ڈالدیں اور اُس سے چمٹ گیا۔ ٹھبکی نے کہا" تم بہت اچھے کھوکھا ہو۔"

(۶)

رات کو مادہابی اور سمارش میں اس مسئلہ پر گفتگو ہوئی۔" تم نے اپنے مالی کی بہادری کے متعلق کچھ سنا؟" مادہابی نے کہا" اس نے ٹھبکی کے لئے ایک چاندی کی زنجیر خریدی ہے اور وہ سب کو دکھلاتی

پھرتی ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ یہ لوگ کیا خیال کر رہے ہیں؟"
"شاید سول قانون کے مطابق شادی!" اُس کے شوہر نے جواب دیا۔
"بیوقوف مت بنو" مادہابی نے اُس کو آہستہ سے دھکا دیتے ہوئے کہا "تم کو چاہیئے کہ کل اُسکو ڈانٹ دو۔"

دوسرے دن اودوے بلایا گیا۔ سمارش نے پوچھا "کیا تم نے کہا ہے کہ تم ٹھبکی سے شادی کرو گے؟"
اودوے اس اچانک سوال پر بھوچکا ہو گیا۔ آخر اس نے ہوش و حواس بجا کئے اور گھبرا کر بولا۔
"ایسا کیونکر ہو سکتا ہے حضور؟ اگر میں ایک سنتھال لڑکی کے ساتھ شادی کروں گا تو میری ذات چلی جائے گی۔ پھر یہ کہ میں شادی شدہ ہوں اور میرے گھر پر بال بچے اور سب لوگ ہیں۔"
سمارش نے غصہ ہو کر پوچھا "تب تم نے اُسکو تحفہ کیوں دیا؟"
اودوے نہیں جانتا تھا کہ کیا کہے۔ کچھ توقف کے بعد وہ انتہائی حماقت کے ساتھ بولا "حضور میں نے اُسکو کوئی تحفہ نہیں دیا ہے۔ کسی اور نے دیا ہوگا۔"
سمارش نے غصہ میں آکر ایک تھپڑ اُسکو مارا اور بولا کہ "میرے گھر سے ابھی چلا جا۔ میرے منھ پر جھوٹ بولنے کی جرات کرتا ہے؟ ابھی اسی وقت چلا جا۔"
اودوے ایک لمحہ کے اندر غائب ہو گیا۔ یہ دغا دیکھ کر ٹھبکی زمین میں سما جانیکو تیار معلوم ہوتی تھی۔ لیکن وہ اُس کے پیچھے پیچھے جانے سے اپنے کو باز نہ رکھ سکی۔ وہ اُس سے کچھ کہنا چاہتی تھی۔ اودوے نے غصہ سے پھر کر اُسکی طرف دیکھا اور سخت سست الفاظ کہے۔
لیکن ٹھبکی کھوکھا کو گود میں لئے ہوئے اب تک اُسکا پیچھا کر رہی تھی۔ مادہابی اپنے کمرہ سے باہر نکل آئی اور ڈانٹ کر بولی "دروازہ سے باہر جانیکی جرات نہ کرنا ورنہ میں تجھے پولیس کے حوالہ کر دونگی۔"
ٹھبکی واپس چلی آئی۔ "تجھکو شرم نہیں آتی ہے" مادہابی نے پوچھا "اگر اس طرح تو اس کے پیچھے پیچھے دوڑے گی تو تجھکو کسی اچھے گھر میں جگہ نہیں ملے گی۔"
ٹھبکی کھڑی روتی رہی مگر اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔ اُس نے کھوکھا کو ایک لمحہ کے لئے بھی گود سے اتارنے کے لئے انکار کر دیا۔ خود مادہابی بھی کھوکھا کو اُس سے نہ لے سکی۔
شام کو اُس نے کھوکھا کو کھانا کھلایا اور اُسکو سُلا دیا۔ تب اُس نے چپ چاپ اُس کے پھولے پھولے گالوں کا بوسہ لیا اور غم کے آنسو بہاتے ہوئے سرہانے بیٹھ گئی۔
جب مادہابی کمرہ میں داخل ہوئی تو وہ کھڑی ہو گئی اور اُس نے کہا "میم صاحب! مہربانی

فرما کر مجھکو معاف کر دیجئے اور اُس کے علاوہ بھی اگر میں نے کبھی قصور کئے ہیں تو اُن کو بھی مہربانی کر کے معاف کر دیجئے۔"

(۷)

صبح کو مادہابی بہت دیر میں اُٹھی کیونکہ آج برتن مانجنے کی آواز اُس کو بیدار کرنے کے لئے پیدا نہ ہوئی تھی۔ جب صبح کی روشنی کھڑکی کے پردوں سے چھن چھن کر آنے لگی۔ تو مادہابی بیدار ہوئی اور فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔ "ٹھبکی اتنی دیر تک دروازہ پر اس سردی میں کھڑی ٹھٹھر کر رہ گئی ہوگی" اس نے دل میں کہا۔

اس نے دروازہ کھولا اور یہ معلوم کر کے متعجب ہوئی کہ ٹھبکی وہاں نہ تھی۔ شمال کی سرد ہوا اُجڑے ہوئے باغ میں زور شور کے ساتھ چل رہی تھی۔ اُس نے دوسرے نوکروں کو بلایا مگر ٹھبکی کی کوئی خبر اُن سے نہ ملی۔ وہ پھر اپنے کمرہ میں داخل ہوئی اور بولی "ٹھبکی وہاں نہیں ہے۔ شاید آتے ہوئے شرماتی ہے"

"کون جانتا ہے" اُس کے شوہر نے کہا "کہ وہ بدمعاش اُس کو بہکا کر لے بھاگا ہو"

مادہابی کھوکھا کو بستر پر سے لانے کے لئے گئی۔ جیسے ہی اُس نے اُسکو کھینچا اُس نے دیکھا کہ اُس کا ایک سونے کا کڑا غائب ہے "کس نے اس کا کڑا لیا ہے؟ وہ چلائی۔ اُسی کمینہ نے چرا لیا ہوگا۔ اب میں سمجھی کہ وہ کیوں غائب ہے۔ اُس نے زیور لے لیا اور اُس بدمعاش کے ساتھ چلی گئی۔

"یہ بالکل ممکن ہے" اُس کے شوہر نے کہا "لیکن اُس نے صرف ایک کڑا کیوں چرایا اور دوسرا کیوں چھوڑ دیا؟ یہ تعجب انگیز امر ہے۔

"اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں ہے" اُس کی بیوی نے جواب دیا "وہ دونوں ہی کڑے لینے کو تھی کہ میں اندر آ گئی۔ اور اُس کی دیدہ دلیری تو دیکھو کہ مال غنیمت کے ساتھ چلتے وقت اس نے مجھ سے معافی مانگی۔

مادہابی نے کھوکھا کو زمین پر اتار دیا اور فوراً ہی ایک جھنجھناہٹ کی آواز آئی اور وہ زنجیر جس کا آنا چرچا تھا، ٹھبکی کے چند کم قیمت زیورات، اور تین چاندی کے سکے نیچے آ گرے۔ "یہ اور زیادہ تعجب کی بات ہے" سمارش نے کہا۔ "اپنی چیز چھوڑ دینا اور دوسروں کی چرا لینا۔ لیکن زنجیر نقلی چاندی کی بنی ہوئی ہے۔ بدمعاش نے اُسکو ہر طرح دھوکا دیا۔"

"یہ صرف اشک شوئی کے لئے ہے" اُسکی بیوی نے کہا "وہ ہم لوگوں کو حیرت میں ڈالنا نہیں چاہتی تھی۔ اس لئے اُس نے یہ سب فضول چیزیں چھوڑ دیں۔ لیکن اس مرتبہ میں اس کو آسانی سے نہیں جانے

دو نگی۔ تم کو ضرور بھانہ پر جانا چاہیئے۔"

سمارش نے چائے پی اور بھانہ کا قصد کر کے روانہ ہوا۔ سب سے پہلی چیز جو اُسکی آنکھوں کے سامنے آئی وہ ٹھبکی کا کالا سر تھا۔ وہ سر جھکائے ہوئے دروازہ سے لگی ہوئی کھڑی تھی۔ اس لئے پہلے پہل سمارش پر اُس کی نظر نہ پڑی۔ اس نے دیکھا کہ لڑکی رو رہی ہے۔

اُس کو لڑکی کی اس بیکسی پر ترس آگیا۔ وہ کانسٹبل کے پاس گیا جو دروازہ کے قریب کھڑا تھا اور بولا۔ "تم اس لڑکی کو کہاں سے لائے ہو؟ کیا کسی نے اُس کے خلاف رپورٹ لکھوائی ہے؟ اسکو چھوڑ دو۔"

جب ٹھبکی کی نظر بولنے والے پر پڑی تو وہ دروازہ کے اوٹ آڑ میں آگئی۔ "ہم لوگ اسکو یہاں نہیں لائے ہیں حضور۔" کانسٹبل نے کہا "وہ خود آئی ہے۔ اور کہتی ہے کہ ایک اودے نامی مالی نے اُسکے آقا کے لڑکے کا طلائی کڑا چوری کر لیا ہے۔ اسی سلسلہ میں وہ سب انسپکٹر سے ملنا چاہتی ہے۔"

"ہاں! یہ ٹھیک ہے" سمارش نے کہا "لیکن اس کا کیا ثبوت ہے کہ مالی نے چُرایا ہے؟"

اس مرتبہ ٹھبکی بولی۔ "ہاں حضور۔" اُس نے کہا "میں نے کڑا لیا تھا۔ لیکن میرا منشاء چرانے کا نہ تھا۔ کھوکھا بابو ایک سونے کی زنجیر مانگتے تھے لیکن میم صاحب نے نہیں خریدی۔ کھوکھا بابو اس کے لئے چیختے اور چلاتے تھے۔ تب اودے نے کہا کہ وہ ایک چیز کو دو چیز بنانے کا عمل جانتا ہے اور اگر میں اُسکو ایک کڑا دیدونگی تو وہ دو کڑے بنا دے گا۔ مجھے اُس پر پورا یقین نہ آیا تاہم میں نے اُسکو ایک کڑا آزمانے کی غرض سے دیدیا۔ لیکن کل جب وہ چلا گیا تو اُس نے ہر بات سے انکار کر دیا۔ اُس نے کہا کہ کڑے کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتا۔ میں نہیں جانتی حضور کہ اتنی بڑی حماقت کے بعد کیونکر سر اونچا کروں۔ اگر پولیس اُسکو نہیں پکڑ سکتی تو میں اُس کی جگہ پر جیل جاؤں گی۔ میں ذات کھو سکتی ہوں، حضور مگر میں کوئی پاپ کرنا نہیں چاہتی۔"

اتنا کہ کر وہ پھر رونے لگی۔ "حضور میں کھوکھا بابو کے بغیر نہیں رہ سکتی۔" اُس نے کہا "مہربانی کر کے اس مرتبہ مجھکو معاف کر دیجئے۔"

سمارش نے کھوکھا کو ٹھبکی کے لئے روتے ہوئے سُنا اور بولا۔ "اچھا" جا! جلدی جا! کیونکہ دیر ہو رہی ہے؟"

(سری متی شانتی دیوی)

شبلی ابراہیمی (ایم۔ اے)

اقبالنامہ جہانگیری کا ایک قلمی نسخہ

اور

عہد مغلیہ کے ایک درباری اہل قلم کی چشمدید بیانات

زیر تبصرہ نسخہ اس وقت میرے سامنے اقبالنامہ جہانگیری کا ایک قلمی نسخہ ہے، اور اسی پر میں تبصرہ کرنا چاہتا ہوں
یہ نسخہ ۲۰۰ صفحات پر مشتمل ہے، ہر صفحہ میں ۱۳ سطریں ہیں۔ ۲ ذیقعدہ ۱۲۲۱ھ میں اسکی
کتابت ہوئی، یعنی آج سے ایک سو ستائیس سال قبل یہ کتاب لکھی گئی، کاتب کا نام رام سکھ پنڈت ہے۔
میں ہندو اہل قلم کے ان خدمات کا معترف ہوں جو انھوں نے مسلمانوں کے ساتھ اپنی دوستی
کے ثبوت میں فارسی ادب کے متعلق انجام دی ہیں، چنانچہ شاہ عالم ثانی کے زمانہ (۱۲۲۹ھ) میں بھگوان داس
نے تذکرۂ شعرا کے متعلق ایک کتاب "سفینۂ ہندی" لکھی۔ اس کا ایک قلمی نسخہ جو آزاد بلگرامی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے
پٹنہ لائبریری میں موجود ہے، اسی طرح بندرابن داس نے بھی "سفینۂ خوش گو" کے نام سے فارسی زبان کے اُن
شعرا کا تذکرہ لکھا جو اکبر کے بعد ہندوستان میں تھے۔ یہ شخص سراج الدین علی خاں آرزو کا شاگرد تھا اور یہی
وجہ ہے کہ جس طرح محمد حسین آزاد مرحوم نے "آب حیات" میں ذوق کے ساتھ اپنی روحانی وابستگی اور عقیدت
دنیالیش کا حال لکھا ہے، اسی طرح اس ہندو ادیب نے بھی اپنے لائق استاد خان آرزو کے ساتھ اپنی شاعرانہ
عقیدتمندیوں کا اظہار کیا ہے، چنانچہ خان آرزو کے حالات اگر تفصیل کے ساتھ کہیں ملیں گے تو اسی ہندو
شاگرد بندرابن داس کے "سفینۂ خوش گو" میں، مگر ساتھ ہی اس کے اس صف میں بعض وہ حضرات بھی نظر
آتے ہیں جو صرف شوق میں علمی کام تو کرنا چاہتے تھے، لیکن علمی بے مائگی کے باعث وہ کوئی قابل قدر خدمت
انجام نہیں دے سکے۔ چنانچہ اسی صف میں نسخۂ ہذا "اقبالنامہ جہانگیری" کے کاتب رام سکھ پنڈت بھی ہیں۔

اس میں شک نہیں یہ کتاب خط نستعلیق میں ہے، اور کاتب نے بڑے استقلال کے ساتھ نقل کی ہے، ظاہری نمائش بھی نظر فریب ہے، لیکن جب میں نے اس کا بالاستیعاب مطالعہ کرنا شروع کیا تو میری حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہی کہ اول سے آخر تک اس میں کتابت کی ایسی فاحش غلطیاں رہ گئی ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کاتب فارسی زبان سے بالکل نابلد تھا، اس لئے تبصرہ کرنے سے قبل مجھے بڑی عرق ریزی کے ساتھ کتابت کی غلطیوں کو دور کرنا پڑا۔ جو سخت صبر آزما کام تھا، لیکن تصحیح کرتے وقت میرے پاس کوئی دوسرا نسخہ نہ تھا کہ مقابلہ کرتا اس لئے متن کی صحت میں مجھے اپنی ہی ذات پر اعتماد کرنا پڑا۔ رائل ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ نے اقبالنامہ جہانگیری کا نسخہ بڑے اہتمام سے شائع کیا ہے،

اصل کتاب

اقبالنامہ کا مصنف معتمد خاں عہد جہانگیری کا ایک درباری اہل قلم تھا، کتاب کے اندر جستہ جستہ اس نے اپنے حالات بھی لکھے ہیں، قدیم مورخین اسلام کی طرح مصنف نے سال کے اعتبار سے اس کتاب کی ترتیب دی ہے، اس میں ابو المظفر نور الدین محمد جہانگیر بادشاہ خاندان مغلیہ کے چوتھے فرمانروا کے عہد سلطنت کے حالات سے بحث کی گئی ہے، ابتدا میں ایک مختصر سی تمہید ہے اس کے بعد اول سال جلوس سے لیکر بائیس سال تک کے حالات قلمبند کئے ہیں، یعنی ۱۰۱۴ھ سے ۱۰۳۷ھ کے درمیان سلطنت مغلیہ میں جو سیاسی و ملکی واقعات رونما ہوئے اُن کے چشمدید حالات اس کتاب میں ملتے ہیں، اس سلسلہ میں مصنف نے اس عہد کی سیاسیات کے علاوہ بہتیری ایسی باتیں لکھی ہیں جو عام مذاق کے لئے بھی دلچسپ ہیں، مثلاً اس عہد کے علما و فضلا، صوفیہ و درویش، عمارات و آثار آرٹ و صنعت طیور و حوش، سیر و شکار، نذر و پیشکش، عجائب و غرائب کے متعلق نہایت دلکش انداز میں روشنی ڈالی ہے، اور میں ان تمام عنوانوں پر ایک تفصیلی بحث کرنا چاہتا ہوں،

حالات مصنف

کتاب کا تمام و کمال مطالعہ کرنیکے بعد مصنف کے ذاتی حالات کے متعلق بھی بہت سے واقعات مل جاتے ہیں، چنانچہ یہ شخص اپنی اعلےٰ قابلیت، وفاداری اور اطاعت شعاری کی بدولت "بخشی" کے معزز عہدہ پر پہونچ گیا تھا، جلوس کے چودھویں سال بادشاہ کے سفر کشمیر کے سلسلہ میں اس نے ایک نہایت ہی دلچسپ واقعہ لکھا ہے، اثنائے سفر میں ایک منزل ایسی ملی جسکی راہ بالکل دریا کے کنارہ واقع تھی، اور اُس کے ہر دو جانب بڑے بڑے پہاڑوں کا سلسلہ تھا، یہاں پر بادشاہ نے مصنف کو ٹھیرا دیا، اور کہا کہ میرے چلے جانے کے بعد تمام فوج عقب سے آئے، مصنف نے اپنا خیمہ و خرگاہ پہلے ہی سے روانہ کر دیا تھا، اس لئے اپنے آدمیوں کو پیام بھیجا کہ جس منزل پہ پہونچ چکے ہو وہیں ٹھہر جاؤ ادھر بادشاہ چلے رستہ میں زور کا طوفان آیا، بجلی کی چمک، رعد کی گرج، برف و باراں کی صعوبت سے

بادشاہ کی طبیعت سخت پریشان ہوئی، خیمہ و خرگاہ پیچھے تھا، نور جہاں بیگم، خواص، اور خواجہ سرا ساتھ تھے، منصبداروں کو عقب سے آنے کا حکم مل چکا تھا، یکایک مصنف کے آدمی جہاں ٹھہرے تھے، وہ خیمہ نظر آیا، شاہی خاندان نے اسی میں پناہ لی، اس کے بعد بادشاہ نے مصنف کو بلا بھیجا اور تمام نذر و پیشکش جو حضور میں موجود تھا سب اُسے عطا کیا، چنانچہ مصنف لکھتا ہے:-

"آنچہ در لباط بود از نقد و جنس .... بہ تفصیل بہ رسم پیش کش و پائے انداز معروض داشت ہمہ را باین غلام بخشیدند، و فرمودند کہ متاع دنیا در چشم چہ نماید جواہر اخلاص را بہ بہائے گران خریدارم الحق این اتفاق از اثر اخلاص و تائیدات طالع اوست کہ مثل من بادشاہے با اہل حرم خود یک شبانہ روز در خانہ او بہ راحت و آسودگی بسر بردہ او را در امثال و اقران و اہل جہان چنین روئے سرفرازی شود"

اس کے بعد لکھتا ہے:-

"روز پنجشنبہ در موضع کہانی نزول موکب منصورہ اتفاق افتاد سروپائے کہ پوشیدہ بودند بہ کمترین بندہا مرحمت فرمودند، و منصب این فدوی از اصل و اضافہ ہزاری و پانصدی ذات و پانصد سوار حکم شد"

جلوس کے تیسرے سال مصنف کو "معتمد خاں" کا خطاب ملا، چنانچہ خود لکھتا ہے:-

"در چہارم ربیع الاول راقم اقبالنامہ بہ خطاب "معتمد خانی" ممتاز گشت"

جلوس کے نویں سال جب خبر آئی کہ فدائی خان شہزادہ خورم (شاہجہاں) کے بخشی نے انتقال کیا تو یہ خدمت مصنف کو ملی اسی طرح جلوس کے گیارہویں سال مصنف کو "بخشی گیری" کی خدمت، منصب ہزاری اور خلعت اور فیل ملا۔

کشمیر اور اس کے نزہت افزا مناظر کے متعلق روشنی ڈالنے میں مصنف نے جس طرح اپنی لطافت بیان اور نزاکت حس و اثر پذیری کا اظہار کیا ہے قابل تعریف ہے، اسی سلسلہ میں ایک جگہ "کوہ مارون" کا (جسے اہل ہند "ہری پربت" کہتے ہیں) تذکرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:-

"بر سمت مشرقی آن کوہ دل واقعست .... حضرت عرش آشیانی (یعنی اکبر) انار اللہ برہانہ حکم فرمودہ اند کہ درین مقام قلعہ از سنگ و آہک و سنایت استحکام بنند و در عہد دولت جہانگیری قریب الاختتام شدہ چنانچہ کوہچہ مذکور درمیان حصار واقعست و دیوار قلعہ بر دور آں گشتہ و کوہ مذکور بہ حصار پیوستہ و عمارات دولت خانہ مشرف بر آب است و در دولت خانہ باغچہ

واقعست با مختصر عمارتے کہ حضرت عرش آشیانی اکثر اوقات درآنجا می نشستہ اند چوں دریں
مرتبہ سخت بے طراوت و افسردہ بہ نظر اشرف درآمد بہ راقم اقبالنامہ حکم شد کہ در ترتیب
ایں باغچہ و تعمیر منازل آں غایت جد و جہد بہ تقدیم رسانید در اندک فرصت بخشش اہتمام
ایں فدوی رونق تازہ گرفت و در باغچہ چبوترۂ عالی سی درعہ مربع مشتمل بر سہ طبقہ آراستہ
شد و عمارات از سر نو تعمیر فرمودہ نادرہ کار رشک نگارخانہ چین ساخت و ایں باغچہ
را از سر نو "نور افزا" نام فرمودند"

خلاصہ یہ ہے کہ "ہری پربت" کے پورب طرف ایک چھوٹی سی پہاڑی "کوہ دل" ہے، اکبر نے یہاں پتھر اور چونے کا ایک قلعہ بنانے کا حکم دیا تھا جو جہانگیر کے زمانہ میں ختم ہوا، چنانچہ یہ پہاڑی قلعہ کی دیواروں کے اندر داخل ہوگئی ہے، یہاں پانی پر ایک عمارت بنائی گئی ہے، جس میں چھوٹا سا ایک باغ ہے، اور اس میں چھوٹی سی ایک کوٹھی ہے، جہانگیر نے اس سفر میں دیکھا کہ یہ باغ بہت ویران اور بے رونق نظر آتا ہے، اس لئے مصنف کو حکم ملا کہ شروع سے اس باغ کی ترتیب دے، اور اسکی عمارتیں تعمیر کرائے، مصنف نے تھوڑے ہی دنوں میں اس طور سے باغ کو آراستہ کر دیا اور اسکی عمارتیں درست کرائیں کہ نگارخانہ چین کے لئے باعث رشک بن گیا، جہانگیر نے اسکا نام "نور افزا" رکھا۔

جہانگیر اور اسکی سیرت

گیارہویں جمادی الثانی ۱۰۱۴ھ جمعرات کے دن جہانگیر آگرہ میں تخت پر بیٹھا، اور یہ ماہ صفر ۱۰۳۷ھ اتوار کے دن بوقت چاشت جلوس کے بائیسویں سال دنیا سے رحلت کی، بائیس سال کے اس عرصہ میں سیاسی نقطۂ نظر سے چند انقلابات ضرور ہوئے، مثلاً رانا امر سنگھ کی اطاعت، قلعہ کانگڑہ کی فتح، جو فیروز شاہ اور اکبر کو بھی باوجود سعی نصیب نہ ہوسکی، شاہجہاں کی بغاوت، نورجہاں بیگم کی سیاسی حکمت عملی، فارس کے خاندان صفویہ سے ازدواجی تعلقات، ان میں ہر مسئلہ سیاسی زاویہ نظر سے بہت کچھ اپنے اندر اہمیت رکھتا ہے، لیکن میں یہاں سیاسیات کو بالکل نظرانداز کر دیتا ہوں، چونکہ عوام کے ذوق جمالیاتی کی نزاکت سیاسیات کے خشک مباحث کی گرانیاں برداشت نہیں کر سکتی۔

جہانگیر فطرت کی طرف سے جمالیات پرستی کا ایک ایسا ارفع ذوق لیکر آیا تھا کہ اس کی کوئی دوسری مثال شاہان مغلیہ کی زندگی میں نہیں ملتی، معتمد خاں نے نورجہاں سے شادی کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ طلسمی حیثیت رکھتا ہے، میں بھی اس وقت اس افسانہ کہنہ کا اعادہ بہتر نہیں سمجھتا، ہر چند تاریخی اعتبار سے اس افسانہ کے اندر جو ژولیدگی ہے، اسے سلجھانا بھی ارباب نظر کا فرض ہے، بہرحال میں اس وقت اپنے مصنف

اقبالنامہ کے بیانات پر تبصرہ کرنا چاہتا ہوں اس لئے یہی مناسب ہے کہ صرف انھیں کے "خوان لیغما" پر لوگوں کو دعوت نشاط دوں۔

جہانگیر کو سیر و شکار سے خاص دلچسپی تھی، چنانچہ سطور ذیل سے پتہ چلے گا، کہ وہ شیر کے شکار کا مہلک حد تک دلدادہ تھا، شکار ماہی، شکار فیل، شکار آہو و طیور ہمیشہ اسکی تفریح کا مشغلہ تھا سیر و سیاحت سے بھی اسے خاص لگاؤ تھا، چنانچہ ہر سال کشمیر جانا اس کا فرض تھا، صوفیہ اور فقرا سے اسی بڑی موانست تھی، خود انکی خانقاہوں اور ان کے معابد میں جاتا، پہروں ان سے باتیں کرتا، علما و فضلا، شعرا و اہل کمال ہمیشہ اس کی زینت دربار تھے، اس نے بہت سی عمارتیں بنوائیں، شکستہ آثار کی مرمت کرائی، اس کے پانچ بیٹے سلطان خسرو، سلطان پرویز، سلطان خورم، سلطان جہاندار، سلطان شہریار اور دو بیٹیاں سلطان نثار بیگم، سلطان بہادر بانو بیگم ہوئیں، خسرو اور پرویز نے جہانگیر کی زندگی ہی میں وفات پائی خسرو کے دو لڑکے ہوئے اور ایک لڑکی، سلطان پرویز کے بھی ایک لڑکا ہوا تھا لیکن اس نے باپ ہی کی زندگی میں انتقال کیا اسکی ایک لڑکی زندہ رہی جو شاہزادہ داراشکوہ کے عقد میں آئی، شاہزادہ خورم کے چار بیٹے اور تین بیٹیاں ہوئیں داراشکوہ، شاہ شجاع، اورنگ زیب، مراد بخش پربر بانو بیگم، روشن آرا بیگم، جہاندار کے کوئی اولاد نہیں ہوئی شہریار کی نسل سے جسکی شادی نورجہاں کی لڑکی (جو شیر افگن خاں سے ہوئی تھی) سے ہوئی صرف ایک بچی زندہ رہی،

سیر و سیاحت

معتمد خاں نے جہانگیر کے سفر کشمیر کے سلسلہ میں وہاں کے سبزہ زار، چمنستان، اور تختۂ گل و لالہ پر بھی دلفریب انداز میں روشنی ڈالی ہے، اور ابتدائے مملکت کشمیر پر جغرافی اور عمرانی حیثیت سے بھی بحث کی ہے، ابوالقاسم فرشتہ نے اپنی تاریخ کے دسویں مقالہ میں تاریخی واقعات کے ضمن میں ادبی داد سخن سنجی دی ہے، اور دل کھولکر، چنانچہ فیضی اور عرفی کے قصائد بھی درج کئے ہیں، عرفی نے کشمیر کی تعریف میں ایک قصیدہ کہا جسکے دو بیت یہ ہیں۔

ہر سوختہ جانے کہ بہ کشمیر درآید — گر مرغ کباب است کہ با بال و پر آید
بنگر کہ ز فیضش چہ بود گوہر یکتا — جائیکہ خزف دررود آنجا گہر آید

اسی طرح فیضی نے بھی کشمیر کی تعریف میں لطیف خیالات کا اظہار کیا ہے، فرماتے ہیں۔

ہزار قافلۂ شوق می کند شبگیر — کہ بار عیش کشاید بہ عرصۂ کشمیر
تبارک اللہ ازاں عرصہ کہ دیدن او — ورق نگار خیال است نقشبند ضمیر
ہوائے او متنوع چہ فکرت نقاش — زمین او متلون چہ صفحۂ تصویر

به پیش فیض نسیمش دم مسیح سموم | به نزد آب زلالش زلال خضر غدیر
فضول او متشابه ز اعتدال ہوا، | بہم یکے دی وار دی بہشت و بہمن و تیر
درو بجائے علف زعفران ہمی روید | کہ آبِ خاک ورا اینچنیں بود تاثیر
بہر طرف روی از بحرِ فیض مالا مال | ہزار چشمہ جوشندہ چوں دلِ تحریر

فیضی کے اشعار میں "صورِ شعریہ" کی خصوصیت پائی جاتی ہے، تاریخ فرشتہ کے اندر اس کی جغرافی حالت کے متعلق مفصلہ ذیل تبصرہ کیا گیا ہے:۔

"و مختصر آنچہ در ظفر نامہ مسطور است اینست کہ کشمیر از مشاہیر امکنہ معمورہ عالی است و موضع غریب واقع شدہ آں ولایت در وسط اقلیم چہارم است .... و عرصہ آں ولایت طولانی افتادہ زمین کوہ جنوبی بہ جانب دہلی و زمین کوہ شمالی بہ طرف بدخشاں و خراساں و جانب غربیش بہ صوب مواضع است کہ محلِ اقامت و سکونت اقوام افاغنہ می باشد، و طرف شرقیش منتہی می شود بہ مبادی اراضی تبت و ساحت طول آں عرصہ دآنچہ ہموار واقع شدہ از حد شرقی تا جانب غربی قریب چہل فرسخ است و عرض آں از جانب جنوبی تا حد شمالی بیست فرسخ و در وسط آں دشت ہموار کہ میان کوہسار واقع شدہ ہزار قریہ معمورہ است و مشحون بہ چشمہ ہائے خوشگوار و سبزہ ہائے لطافت آثار و از شواہد جودت آب و ہوائے آں دیار است کہ حسن صورت و لطف شمائل خوباں آنجا در السنہ سخنوراں فرس مشہور شدہ (جسکی ایک مثال "سیہ چشماں کشمیری" کی شہرت ہے) و در کوہ و دشتش انواع درختاں میوہ دار است و اثمارش بہ غایت خوب و سانہ گار۔"

اس کے بعد اور بھی مفصل واقعات درج ہیں جنمیں بعض اہم یہ ہیں:۔

"یہاں شہر کے درمیان ایک نہر جاری ہے، جس کا سوت دریائے دجلہ سے ملا ہوا ہے یہاں سے تین رستے نکلے ہیں ایک راہ خراسان کی طرف گئی ہے، اور یہ بہت دشوار ہے، اس طرف سے مال و اسباب چار پایہ پر بھی نہیں لیجا سکتے ہیں، بلکہ آدمی مقرر ہیں جو بار برداری کا پیشہ کرتے ہیں، اور مسافروں کو اس منزل تک پہونچا دیتے ہیں۔ جہاں سے چارپایہ اور سواری پر اسباب و سامان رکھکر سفر کیا جا سکے، دوسری راہ ہندوستان کی طرف گئی ہے اور یہ بھی بہت سخت اور دشوار ہے، ایک رستہ تبت کی طرف گیا ہے، جو سابق الذکر دو راہوں سے آسان ہے۔"

زبانِ اُردو کے تنزل کے اسباب اور ہندوستانی اکاڈمی

دنیا میں جس طرح اور زبانیں عالم وجود میں آئیں ۔ اُسی طرح زبان اردو نے بھی تدریجاً ایک ایسی صورت اختیار کرلی ہے کہ اب اُس کا شمار دنیا کی شستہ زبانوں میں ہونے لگا ہے ۔ البتہ فرق یہ ہے کہ دنیا کی دیگر زبانوں کی طرح اُردو کی ابتدا پردۂ خفا میں نہیں ہے ۔ قدما کی نظم ونثر کے جستہ جستہ ٹکڑے ابتک موجود ہیں جن سے اُردو کی ابتدائی کیفیت اب بھی معلوم کیجاسکتی ہے ۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس زبان نے اور زبانوں کی بہ نسبت بہت جلد ترقی کی ہے ۔ اور ترقی کرنے کے بعد اتنی زیادہ مقبول خاص و عام ہوئی کہ آخرکار مادری زبان بن گئی ۔

اب اگر غور سے دیکھا جائے تو اس میں وہ تمام لوازم زبان موجود ہیں جن سے ایک زبان زبان کہی جاسکتی ہے ۔ اس زبان میں اپنے مافی الضمیر کو ادا کرنے کے لئے ہر طرح کی بندشیں موجود ہیں ۔ اور شعرا اور ادبا کی نکتہ سنجی اور دقیقہ رسی نے فصاحت کے معیار کو بہت بلند کر دیا ہے ۔

چونکہ یہ زبان اور زبانوں کے مقابلہ میں بہت نئی ہے اور بہت سی زبانوں کے امتزاج سے بنی ہے ۔ اس لئے اگر اس کو خاتم السنۂ ہند کہا جائے تو چنداں ناموزوں نہ ہوگا ۔ وہ تمام خوبیاں جو اور زبانوں میں فرداً فرداً موجود ہیں وہ سب کی سب اجتماعی حیثیت سے اُردو زبان میں موجود ہیں ۔ اس میں قریب قریب ہر مخرج کی آوازیں موجود ہیں جن کی وجہ سے اس زبان کا بولنے والا اور زبانوں کے تلفظ کو باسانی سیکھ سکتا ہے ۔ اس سے میرا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ اُردو زبان میں کوئی خامی نہیں ۔ ایک ہندوستانی کو یقیناً فرانسیسی A جرمنی O و Z و CH وغیرہ کے تلفظ ادا کرنے میں دقت پڑے گی ۔ مگر دوسرے ملکوں کے باشندوں کے مقابلہ میں وہ یقیناً ایک غیر مادری زبان کا تلفظ اچھی طرح ادا کر سکے گا ۔

ہر زبان میں چند خصوصیات ہوا کرتی ہیں جن کی وجہ سے وہ زبان اور زبانوں سے درجۂ امتیاز رکھتی ہے ۔ اسی طرح اُردو زبان میں بھی چند خصوصیات ہیں ۔ اور انھیں خصوصیات کا جاننا اردو زبان کا جاننا ہے ۔ ان خصوصیات کے اعتبار سے ہندی اور اردو میں بجز اس کے کوئی فرق نہیں ہے کہ اُردو میں فارسی اور عربی الفاظ کی کثرت ہے اور ہندی میں سنسکرت کے الفاظ کی ۔ مگر جہاں تک جملوں کی بندش اور نشست الفاظ

کا تعلق ہے دونوں زبانیں بالکل ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہیں۔ اس لئے اردو کی ترقی ہندی کی ترقی ہے اور اردو کا تنزل ہندی کا تنزل ہے۔ رسم خط سے زبان نہیں بدل سکتی ہے۔ اور نہ اُسکے محاورات بدل سکتے ہیں۔ البتہ اگر جہلا کی دستبرد سے محاورات اور انداز بیان میں فرق آیا تو چاہے ہم اُن جملوں کو خط نسخ میں لکھیں یا خط نستعلیق میں۔ دیوناگری کے خط میں لکھیں یا مرہٹی میں۔ ہر حالت میں زبان میں ایک ایسا نقص عظیم پیدا ہو جائے گا جس سے ہمارے بزرگوں کی سالہا سال کی محنت اور مدت دراز کی عرق ریزی جس سے اُنھوں نے اس ننھے پودے کو سینچکر پروان چڑھایا تھا۔ خاک میں ملجائیگی۔

زبان اردو کی خصوصیات حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ الفاظ کی تذکیر و تانیث۔ یہ فرانسیسی زبان سے ملتی جلتی ہے۔ عربی زبان میں بھی ہے مگر بہت کم جرمنی میں تذکیر و تانیث کے علاوہ ایک تیسری نوعیت بھی ہے اور الفاظ کی تذکیر و تانیث محض استعمال پر ہے یا یوں کہئے کہ یہ امر سماعی ہے۔

۲۔ صیغوں کا استعمال۔ صیغوں کا استعمال بھی اردو زبان کے لئے مخصوص ہے۔ اور اگر غور سے دیکھا جائے تو کسی دو زبانوں میں صیغہ کا استعمال ایک نہ ملے گا۔ ایک معمولی سی مثال یہ ہے:۔

اردو۔ میں نے آپ سے کہدیا تھا

انگریزی۔ I HAD TOLD YOU

۳۔ حرف جار کا استعمال۔ اس میں بھی زبان اردو کی خصوصیت نمایاں ہے۔

اردو۔ میں سڑک پر جا رہا تھا۔

انگریزی۔ I WAS GOING BY ROAD

۴۔ محاورات زبان۔ مثلاً مجھکو یہ بات ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ اُس کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے اُس نے دیکھا نہ سُنا۔

۵۔ بندش الفاظ۔ اُردو زبان کی بندش ایک خاص طرح کی ہے۔ صلہ اور موصول کا استعمال بہت کم ہے۔ جملے مختصر ہوتے ہیں۔ الفاظ میں روانی ہوتی ہے۔

۶۔ نشست الفاظ۔ وہی لفظ ایک جملے میں فصیح ہوتا ہے اور دوسرے میں غیر فصیح۔ حضرت انیس فرماتے ہیں:۔ "کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہو" یہاں شبنم کتنا غیر فصیح ہے۔

۷۔ معانی الفاظ۔ جس طرح لاطینی زبان کے الفاظ جب انگریزی فرانسیسی جرمنی زبانوں میں داخل ہوئے ہیں تو اُنکا مفہوم کچھ بدل گیا ہے۔ اسی طرح جو عربی اور فارسی الفاظ اُردو میں داخل ہوئے اُنکا مفہوم بھی استعمال کی بنا پر بدل گیا ہے۔

انگریزی COMPLIMENTS - سلام
فرانسیسی COMPLIMENTS (تلفظ CONPLIMAN) مبارکباد-
اسی طرح اُردو زبان میں بھی مفہوم بدلا ہے-
اردو- گلاس - پانی پینے کا برتن جو استوانہ کی مخروطی صورت کا ہوتا ہے-
انگریزی - GLASS - شیشہ
فارسی - غصہ - پریشانی جس میں غم غالب ہو-
اردو - غصہ - خشم-
عربی - غصہ - گلے میں پھنسنا - ضبط کرنا-

۸- تبدیلی الفاظ - جس طرح انگریزی فرانسیسی وغیرہ میں بعض لاطینی الفاظ ایک بدلی ہوئی صورت میں استعمال ہوئے ہیں- اسی طرح اُردو زبان میں بھی بعض الفاظ بدلی ہوئی صورت میں استعمال ہوئے ہیں-
عربی - کیفیت - خیریت - بہ تشدید یا
اردو - کیفیت - خیریت - بغیر تشدید یا
انگریزی - LANTERN اردو لالٹین
انگریزی - BISCUIT (تلفظ بسکٹ) اردو بسکٹ-
انگریزی - ENGINE (تلفظ انجن) اردو انجن

۹- جاذبیت الفاظ - چونکہ اُردو زبان میں قریب قریب ہر مخرج کی آواز موجود ہے- اس لئے ہر زبان کا تلفظ بہت آسانی سے اُردو زبان میں شامل کیا جا سکتا ہے- ایسے الفاظ بہت کم نکلیں گے- جو اردو زبان میں بہت زیادہ ناموزوں معلوم ہوں- اگر ترجمہ کرنے کی کوشش نہ کی جائے تو...... (AEROPLANE ، THERMOMETER) وغیرہ اردو زبان میں نئے نہیں معلوم ہوتے-

۱۰- تغیر الفاظ - بعض الفاظ جو پرانے زمانے میں فصیح تھے اب متروک ہو گئے ہیں- مثلاً اپنے تئیں ٹک - پس - (لہذا کے معنی پر) بن وغیرہ-

لہذا میرے خیال میں اُردو زبان اُسی شخص کو آتی ہے جسکو محاورات زبان پر عبور ہو- جو صیغوں کا صحیح استعمال جانتا ہو- جملوں کے تناسب سے واقف ہو اور اُردو کی صحیح بندش کو سمجھتا ہو- ساتھ ہی کے یہ بھی جانتا ہو کہ جو الفاظ اُردو زبان میں استعمال ہو رہے ہیں خواہ وہ عربی زبان کے ہوں یا کسی اور زبان

کے اُن کا مفہوم اُردو میں کیا ہے نیز انکا صحیح تلفظ کیا ہے۔ ساتھ ہی اس کے یہ بھی جانتا ہو کہ کون کون سے الفاظ و محاورات متروک ہو گئے ہیں۔

یہ کوئی ضروری بات نہیں ہے کہ ایک زبان کا لفظ جب دوسری زبان میں استعمال ہو تو اُسکا مفہوم وہی ہو جو اُسکی اصل زبان میں تھا۔ ہر شخص جانتا ہے کہ زبان اردو میں چراغ کا مفہوم فارسی کے چراغ یا عربی کے سراج سے بالکل مختلف ہے۔ اردو کا چراغ ایک مدور برتن ہوتا ہے۔ جس میں کڑوا تیل بھرا ہوتا ہے اور ایک فلیتہ پڑا ہوتا ہے۔ فارسی میں ہم فارسی مفہوم کے اعتبار سے چراغ ہدایت کہہ سکتے ہیں۔ مگر اردو میں اگر کسی آدمی سے کہا جائے کہ آپ ہدایت کے چراغ ہیں تو وہ اسکو یقیناً مذاق سمجھیگا۔ اردو کی فکر اور فارسی کی فکر میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اسی طرح قریب قریب ہر اُس لفظ کے مفہوم میں جو اردو اور فارسی دونوں میں استعمال ہوتا ہے نمایاں فرق ہے۔

غالباً اس تحریر سے یہ پوری طرح واضح ہو گیا ہو گا کہ اگر کوئی شخص مندرجہ بالا باتوں سے واقف نہیں ہے۔ تو اُسے ہم کسی حالت میں اردو داں نہیں کہہ سکتے ہیں۔ عربی اور فارسی پڑھ جانے سے کوئی شخص اُردو داں نہیں ہو سکتا۔ اگر ایسا ہوتا تو ہر عرب کا باشندہ اپنے آپ کو اُردو کا ایک بہترین زباندان تصور کرنے لگتا۔ اصل تو یہ ہے کہ عربی دانی اور فارسی دانی سے چند مشکل لغتوں کے معنی ضرور معلوم ہو جاتے ہیں، مگر ثقیل اور نامانوس لفظوں کے معنی جان لینا اردو دانی نہیں ہے۔ زیادہ عربی دانی سے یہ نقص پڑتا ہے کہ انسان اس بات کو بالکل بھول جاتا ہے کہ عربی اور فارسی الفاظ کا مفہوم زبان اردو میں کیا ہے اردو زبان کو جاننے کے لئے اصل میں پہلی چھ خصوصیات بہت ضروری ہیں۔ جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ مگر ہم آج کل یہ دیکھ رہے ہیں کہ لوگ اُنھیں خصوصیات کو بالائے طاق رکھکر محض الفاظ کے جھگڑوں میں پڑے ہوئے ہیں۔ اسکی وجہ بظاہر یہ معلوم ہوتی ہے کہ مختلف زبانوں کے پڑھنے سے چند الفاظ کا مفہوم جو دوسری زبانوں میں ہے معلوم ہو جاتا ہے۔ لہذا نزاع لفظی کی سوجھتی ہے۔ باقی رہے محاورات زبان۔ صیغوں کا استعمال۔ بندش الفاظ ان سے قطعاً نابلد رہتے ہیں۔

جن حضرات کا یہ خیال ہے کہ بعض اُردو الفاظ کی تشریح جان لینے سے انسان اردو دان ہو سکتا ہے وہ سراسر دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں۔ فیلولوجی کسی زبان کا ادب سیکھنے کے لئے بالکل غیر ضروری ہے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ فیلولوجی سے صحیح ادبی مذاق بالکل مفقود ہو جاتا ہے۔ مثلاً شمشیر کی تشریح۔ سم = ناخن اور شیر سے ایک فیلولوجی جاننے والے کا خیال لفظ شمشیر کو سُن کر فوراً شیر کے ناخن کی طرف منتقل ہو گا۔ لہذا وہ شمشیر کے ادبی مفہوم کے سمجھنے میں قاصر رہے گا۔ اور اُس کا طرز تخئیل ایک اردو داں کے طرز تخئیل سے

کچھ مختلف ضرور ہوگا۔

دوسری مثال یہ ہے۔ اگر کسی شخص کو معلوم بھی ہو گیا کہ خندق کندک سے نکلا ہے اور اُسکو یہ نہیں معلوم کہ خندق کا اطلاق کس چیز پر ہوتا ہے تو بہت ممکن ہے کہ وہ خندق کو کنوئیں یا تالاب کے معنوں میں استعمال کرنے لگے۔ ساتھ ہی اس کے اگر خندق کی اصلیت کندک معلوم بھی ہو گئی تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کندک کہاں سے آیا اور اگر اس کا مخرج بھی معلوم ہو گیا تو وہ لفظ کہاں سے نکلا۔ وہمچنیں مسلسل بہرحال اس جھگڑے میں پڑ کر زبان اُردو پس پشت پڑ جاتی ہے اور ایک انسان غیر ضروری باتوں میں اُلجھ جاتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ جب کوئی شخص زبان اُردو میں گفتگو کرتا ہے اُس وقت وہ ہر لفظ کو اردو سمجھتا ہے۔ عام اس سے کہ وہ لفظ عربی سے مشتق ہو یا لاطینی سے اور اُس کا خیال بھی فیلولوجی کی طرف نہیں پہونچتا ہے۔

اس موقع پر یہ بیان کر دینے کی ضرورت ہے کہ زبان اُردو میں اس وقت کون سی خامیاں ہیں۔ اردو کے خزانہ میں اسوقت ادبی حیثیت سے ہر قسم کی نظم و نثر موجود ہے۔ اگر نثر میں غور کیا جائے تو جتنی صورتیں نثر کی تمام روئے زمین کی زبانوں میں ہیں وہ سب اردو میں موجود ہیں۔ نظم میں کوئی ایسی صنف نظم کی نہیں جو اردو میں نہ ہو۔ بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اگر ہم اردو کی صرف ایک بحر متدارک پر غور کریں۔ تو یہ معلوم ہوگا کہ روئے زمین کی شاعری زیادہ تر اسی بحر میں ہے۔

LIVES OF GREAT MEN ALL REMIND US
WE CAN MAKE OUR LIVES SUBLIME

فعل فعولن فعلن فعلن فعل فعولن فعلن فاع مع زحافات

مضمون کے اعتبار سے اب بھی اردو کی شاعری کسی طرح دنیا کی تمام شاعری سے کم نہیں۔ البتہ زبان اردو میں جس بات کی کمی ہے وہ موجودہ سائنس کے علمی مضامین ہیں۔ اسکی وجہ بہت کچھ تو نامساعدت وقت ہے اور کچھ ہم لوگوں کی کوتاہی ہمت۔ اس کے متعلق صرف اتنا کہنا کافی ہے کہ جب وہ وقت آئے گا کہ سائنس زبان اردو میں پڑھائی جائے گی تو لامحالہ ہم کو بعض الفاظ زبان اردو میں داخل کرنا پڑیں گے۔ مگر یہ کام صرف وہی حضرات کر سکتے ہیں جنھیں اردو کا صحیح مذاق ہو۔ جو زبان اردو پر عبور رکھتے ہوں اور یہ سمجھتے ہوں کہ کون لفظ زبان اردو کے لئے موزوں ہے اور کون سا ناموزوں۔ ہر شخص کا کام نہیں کہ وہ اس دشوار مسئلہ میں رائے زنی کرے اور ایک نیا لفظ زبان اُردو میں داخل کر کے زبان کے مذاق کو خراب کرے۔

آج کل تو یہ حالت ہے بقول غالب ؎

ہر بوالہوس نے عشق پرستی شعار کی اب آبروئے شیوۂ اہل نظر گئی

ہر شخص اپنے آپ کو زبان اردو کا مسلم الثبوت اوستاد سمجھتا ہے۔ اور بعض حضرات کا تو یہاں تک دعوےٰ ہے کہ دنیا میں کوئی آدمی اُس کا مقابلہ نہیں کرسکتا ہے۔ مگر جب ہم غور سے دیکھتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعض حضرات جو زبان اُردو کی توسیع میں پڑے ہوئے ہیں اُن کی وہی حالت ہے جو انگریزی مدارس کے آٹھویں درجہ کے طالب علموں کی ہوتی ہے۔

ایک طالب علم جب زبان انگریزی سیکھنا شروع کرتا ہے تو وہ اردو میں سوچتا ہے اور اپنے مفہوم کا ترجمہ زبان انگریزی میں کرتا ہے۔ اُس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اُس کو زبان انگریزی میں الفاظ ہی نہیں ملتے ہیں اور وہ غیر مانوس الفاظ استعمال کرنے پر مجبور ہوجاتا ہے مثلاً FAT فیٹ کے معنی موٹا یا پڑھنے کے بعد جب وہ موٹی کتاب کا ترجمہ کرتا ہے تو بے تکلف A FAT BOOK لکھدیا کرتا ہے۔ جب اُسے یہ معلوم ہوتا ہے کہ END OF THE ROOM کے معنی مکان کا کنارہ ہیں۔ وہ سمجھنے لگتا ہے کہ کنارے کے لئے زبان انگریزی میں END لکھتے ہیں۔ پس کچھ تعجب نہیں اگر وہ دریا کنارے کے لئے زبان انگریزی میں END OF THE RIVER لکھدے۔ ابھی حال ہی کا واقعہ ہے کہ مجھے ایف اے کے ایک طالب علم کے انگریزی مضمون دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اُس بیچارے نے زبان انگریزی کی یوں توسیع کی تھی۔

SO FAR THE REFORMATION WAS PURGATIVE IN THE OLD RELIGION

اس جملہ میں لفظ (PURGATIVE) اردو تخیل اوا کرنے کے لئے استعمال ہوا ہے۔ اب آپ ہی بتائیں کہ اس لفظ کے استعمال سے اُردو داں حضرات کہاں تک بہرہ یاب ہوئے۔

چونکہ آج کل انگریزی مدارس میں تعلیم زبان انگریزی ہی میں دیجاتی ہے اور طالب علموں سے اس بات کی مشق کرائی جاتی ہے کہ وہ زبان انگریزی ہی میں سوچیں اور اپنا مفہوم زبان انگریزی میں ادا کریں۔ اس لئے کچھ عرصہ کے بعد جب زبان انگریزی کی مہارت بڑھجاتی ہے اور انگریزی میں سوچتے سوچتے زبان اردو کے محاورے بالکل بھول جاتے ہیں۔ اُسوقت ایک ہندوستانی آدھی اپنی زبان کو خیرباد کہہ کے زبان انگریزی میں سوچتا ہے لکھتا ہے اور اپنی تقریر میں آدھے الفاظ انگریزی کے استعمال کرتا ہے۔ اُس کے جملوں کی بندشیں بالکل انگریزی ہوجاتی ہیں اور اُسے ہر جملے کو مکمل کرنے کے لئے زبان انگریزی کی خوشہ چینی کرنی پڑتی ہے اور اردو کے صرف وہ الفاظ یاد رہجاتے ہیں جن کے مترادف زبان انگریزی میں ایک حد تک موجود ہیں اور وہ تمام الفاظ و محاورات جو زبان اردو کے لئے مخصوص ہیں بالکل بھول جاتے ہیں۔ چونکہ دو مختلف زبانوں میں

ایک ہی مفہوم ادا کرنے کے لئے مترادف و ہم معنی الفاظ کا ملنا بہت مشکل ہے۔ اسلئے ایسے اردو الفاظ کی تعداد جن کا مترادف زبان انگریزی میں موجود ہو۔ قاعدے سے بہت کم ہونا چاہیئے۔ مگر چونکہ اردو بہت وسیع زبان ہے اور اس میں زبان انگریزی سے کہیں زیادہ الفاظ موجود ہیں۔ اس لئے کچھ مترادف الفاظ انگریزی مفہوم ادا کرنے کے لئے مل جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان اردو الفاظ کی تعداد جنکا مترادف زبان انگریزی میں موجود ہو زبان انگریزی کے مقابلہ میں یقیناً کم ہو گی۔ اس لئے ایسے انگریزی داں حضرات کو زبان اردو بالکل محدود نظر آتی ہے۔ اُن کو قدم قدم پر اپنا خیال ادا کرنے کے لئے اُردو الفاظ نہیں ملتے اور وہ اُسے اپنا فرض منصبی سمجھتے ہیں کہ جسطرح ممکن ہو زبان اردو کی توسیع کیجائے اور توسیع بھی یوں ہو کہ انگریزی الفاظ کا ترجمہ زبان اُردو میں کر دیا جائے۔ عام اس سے کہ وہ اردو الفاظ جو انگریزی الفاظ کے مترادف قرار دئے جائیں اُنکا مفہوم زبان اردو میں چاہے کچھ ہی ہو۔ اگر ایسے حضرات کو زبان اردو پر عبور ہوتا اگر وہ محاورات زبان سے واقف ہوتے اور اگر وہ زبان اردو میں بھی سوچنے کی قابلیت رکھتے ہوتے تو غالباً ان کو الفاظ ملنے میں بالکل دقت نہ ہوتی۔

مجھے معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ بعض قابل ہندوستانی انگریزی داں حضرات کو جب کبھی اردو یا ہندی میں تقریر کرنی پڑی یا خطبہ صدارت پڑھنا پڑا تو انھوں نے اپنی تقریر پہلے انگریزی میں لکھ کر اُردو یا ہندی میں ترجمہ کرایا۔ ایک مترجم نے بھولے سے کچھ ٹھیٹ اردو الفاظ استعمال کر دیئے۔ یعنی ایسے الفاظ استعمال کئے جس کے مترادف زبان انگریزی میں نہیں ہیں۔ بس کیا تھا بگڑ گئے اور اُن پر یہ الزام لگایا کہ تم نے عربی اور فارسی الفاظ کی بھرمار کر دی ہے۔

آپ لوگ اگر غور سے دیکھیں گے تو یہ صاف ظاہر ہوگا کہ ہر اُس شخص کے اُردو مضامین میں جو زبان انگریزی میں سوچنے کا خوگر ہے صرف وہ الفاظ ملیں گے جنکے مترادف زبان انگریزی میں موجود ہیں۔ ایسے حضرات کے مضامین میں وہ الفاظ قطعاً نہ ملیں گے جن کا مفہوم ادا کرنے کے لئے زبان انگریزی میں کوئی لفظ نہیں۔ مثلاً آن۔ بان۔ ناز۔ ادا۔ ناداں ادا وغیرہ۔ اس حیثیت سے اگر دیکھا جائے تو انگریزی داں حضرات کی اُردو دانی اُن کی انگریزی قابلیت کی وجہ سے محدود ہو گئی ہے۔ اور اُن کو محض تھوڑے سے اردو الفاظ معلوم ہیں۔ جن کی تعداد اُن انگریزی الفاظ سے یقیناً کم ہے جو انھیں باوجود ہندوستانی ہونے کے معلوم ہیں۔

ایسے لوگوں کی عبارت میں زیادہ تر خود ساختہ الفاظ ملیں گے جو اُن کے خیال میں زبان انگریزی کے الفاظ کے مترادف ہیں۔ مثلاً زبان انگریزی میں PRODUCT OF THE FIELD کے معنی ہیں

کھیت کی پیداوار۔ لہذا انھوں نے سمجھ لیا کہ جہاں کہیں لفظ PRODUCT ہو اُس کے معنی پیداوار ہوں گے۔ اس قاعدے سے PRODUCT OF THE BRAIN کا ترجمہ دماغ کی پیداوار ہوا۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ ویسی ہی غلطی ہے جیسے ایک بچہ نے موٹے کے معنی FAT سمجھکر موٹی کتاب کا ترجمہ FAT BOOK کردیا۔

جیسا میں پہلے کہہ چکا ہوں دو زبانوں میں ایسے الفاظ کا ملنا ایک حد تک ناممکن ہے۔ جنکا مفہوم ہر نوعیت سے ایک ہو۔ یہ ممکن ہے کہ چند محاورات میں دو مختلف زبانوں کے الفاظ ایک ہی مفہوم ادا کرنے کے لئے استعمال ہوں مگر ضرور کوئی نہ کوئی ایسا محاورہ مل جائے گا جس میں صرف ایک ہی زبان کا لفظ استعمال ہوتا ہوگا۔ مگر دوسری زبان کا نہیں۔ ایک معمولی لفظ GOOD ہے جسکا مفہوم قریب قریب وہی ہے جو اردو میں لفظ اچھے کا ہے۔ مگر پھر بھی اُردو کے لفظ اچھے میں COMPARISON کی شان موجود ہے۔ جو انگریزی لفظ (GOOD) میں نہیں۔ اُردو میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں "ان سب میں یہ کتاب اچھی ہے۔ مگر انگریزی میں ایسا نہیں کہہ سکتے۔ علاوہ بریں انگریزی میں ایک خاص محاورہ FOR GOOD ہے۔ جس میں GOOD اور اچھے کے مفہوم میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اس لئے یہ اصولی غلطی ہے کہ پہلے ایک انگریزی لفظ کے کسی خاص مفہوم کا ترجمہ زبان انگریزی میں کیا جائے۔ پھر اُس اُردو لفظ کا اطلاق ہر اُس مفہوم کے ادا کرنے کے لئے ہو جہاں ہم اُس کے انگریزی مترادف کو استعمال کرسکتے ہیں۔ یہ وہ غلطی ہے جو انگریزی خواں حضرات نادانستہ کرتے ہیں اور جسکو وہ اپنی اصطلاح میں توسیع زبان کہتے ہیں۔

اسکے علاوہ انگریزی قواعد پر عبور ہو جانے کی وجہ سے انگریزی داں حضرات یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ اردو زبان کے بھی وہی قواعد ہیں جو انگریزی کے۔ چنانچہ اس زعم میں محاورے بدلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ صیغوں کا غلط استعمال کرتے ہیں اور اپنی غلطی کو نہیں محسوس کرسکتے۔ مثلاً اردو کا محاورہ ہے "ہمارے وہاں ایسا ہوا" ایک انگریزی داں شخص یہ کہے گا کہ بولنے والا تو واحد ہے۔ اس لئے میرے لکھنا چاہیئے علاوہ بریں وہاں میں بُعد کے معنی ہیں۔ اسلئے یہاں ہونا چاہیئے۔ اس لئے میرے یہاں زیادہ فصیح ہے۔ مگر یہ استدلال سراسر غلط ہے۔ ایک دوسرا اُردو کا محاورہ ہے "دیکھا نہ سنا" جسکے معنی ہیں "نہ دیکھا نہ سُنا" ایک انگریزی داں شخص یہ کہے گا چونکہ ابتدا میں علامت نفی نہیں ہے جیسے اس انگریزی فقرے (NEITHER HE SAW NOR DID HE HEAR) میں ہے۔ اس لئے اس کے معنی ہیں دیکھا مگر نہیں سُنا۔

اصلیت یہ ہے کہ انگریزی میں مہارت تامہ حاصل ہونے کے بعد زبان اُردو سے اس حد تک بیگانگی پیدا ہو جاتی ہے کہ سلاست زبان اور فصاحت تو در کنار اُردو کے معمولی معمولی جملے بھی لکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔

شخصیت کی یہ اتنی بڑی فتح ہے کہ مشکل ہی سے اس کی کوئی دوسری نظیر مل سکتی ہے

جن شرائط پر یہ صلح طے پائی تھی، ان کی توثیق کے لئے ضرورت تھی کہ کانگرس کا اجلاس جلد سے جلد منعقد کیا جائے، اور غالباً اس سے زیادہ اہل کانگرس کی زندگی اور قوت عمل کا ثبوت اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ گاندھی ارون مصالحت کے تقریباً بیس دن کے اندر ہی کراچی میں چالیس پچاس ہزار نفوس کا اجتماع ہو گیا۔

ہر چند مہاتما گاندھی نے یہ صلح جمعیت عاملہ کے مشورہ سے کی تھی، لیکن اس کا یقین کامل نہیں تھا کہ کانگرس کے کھلے اجلاس میں آسانی کے ساتھ شرائط صلح کو تسلیم کر لیا جائے گا۔ اور اس اندیشہ کو بھگت سنگھ کے قصاص نے اور زیادہ قوی بنا دیا۔ چنانچہ جو خدشہ تھا وہ ظاہر ہو کر رہا۔ اور ایک جماعت ایسی رونما ہو گئی جو صلح کے شرائط پر راضی نہ تھی اور اس نے مہاتما گاندھی کا خیر مقدم کراچی میں سیاہ جھنڈوں، گو بیک کے نعروں سے کیا اور انسانی خون کا بھرا ہوا پیالہ اُن کے سامنے پیش کر کے انتہائی بیزاری کا اظہار کیا۔ لیکن اس کوہ راسخ اور آہنی عزم والے انسان نے جس کا نام گاندھی ہے، ایک لمحہ کے لئے بھی مایوسی کو راہ نہ دی اور آخر کار یہاں بھی فضا کے بادل چھٹ کر رہے اور کانگرس کے کھلے اجلاس نے شرائط صلح پر توثیق ثبت کر دی۔

لیکن ٹھیک اسی وقت جبکہ کراچی میں آزادی ملک کا فیصلہ ہو رہا تھا۔ دہلی میں بدنصیب مسلمانوں کے بعض ناعاقبت اندیش افراد آل پارٹیز مسلم کانفرنس کے نام سے آزادی کی قبر کھودنے میں مصروف تھے، حریت کا جنازہ نکالنے کی طیاریاں کر رہے تھے۔ انھوں نے یہاں کیا کیا۔ اس کی داستان گو طویل ہے لیکن جدید نہیں ہے، وہی مطالبات کا رونا، وہی در پردہ حکومت کی کاسہ لیسی اور وہی بزدلی و کم ہمتی جو ہمیشہ اس رجعت پسند جماعت نے ظاہر کی۔ کراچی سے مہاتما گاندھی کو بھی شرکت کی دعوت دی اور جب انھوں نے نہایت صفائی کے ساتھ کہدیا کہ میں ہر اس مطالبہ کے ماننے کے لئے تیار ہوں جس کو مسلمان متفقہ طور پر پیش کریں، تو ان کے تمام جوش و خروش پر اوس پڑ گئی اور یہاں سے نکلکر بمبئی وغیرہ میں پھر وہی کائیں کائیں شروع کر دی جو اس جماعت کی قدیم بزدلانہ عادت ہے۔

یقیناً بنارس اور خصوصیت کے ساتھ کانپور کے فسادنے اس جماعت کی امیدوں کو تھوڑے دنوں کے لئے اور زندہ کر دیا اور اس میں شک نہیں کہ ملک کی جس آبادی نے یہ فساد برپا کیا وہ سخت ملامت کے قابل ہے۔ لیکن کیا یہ واقعات ملک کا صحیح نصب العین بدل سکتے ہیں، کیا ہم چند درندوں کی وحشیانہ حرکات سے متاثر ہو کر آزادی ملک کے حصول سے باز رہ سکتے ہیں

ج ب

کسی ملک میں انقلاب رونما ہونے لگتا ہے تو ضعیف ترین عناصر کو بھی ایک بار خروش میں آنے کا موقعہ ملجاتا ہے اس لئے اس نوع کے ہنگامے قابل افسوس ضرور ہیں، لیکن ہم کو منزل مقصود سے تو علیحدہ نہیں کرسکتے۔ ایسے وقت میں ہمارا فرض یہ ہونا چاہئے کہ ہم اس نوع کے اختلافات سے بالکل بے نیاز نہ گزر جائیں۔ اور جلد سے جلد اس سررشتہ کو اپنے ہاتھ میں لیلیں جو ہمیشہ کے لئے اس اختلاف و تصادم کو مٹا دینے والا ہے۔ لیکن ہمارے بعض نا عاقبت اندیش اکابر نے ان واقعات سے ناجائز فائدہ اٹھاکر نہایت سخت مکروہ و مسموم قسم کا پروپاگنڈا شروع کر دیا جو اختلاف کی خلیج کو اور زیادہ وسیع کر دینے والا ہے۔ یہ حضرات ان واقعات کو اس امر کی دلیل میں پیش کرتے ہیں کہ اگر مخلوط انتخاب تسلیم کر لیا گیا تو ہندوؤں کی اکثریت ہمیشہ مسلمانوں کو اسی طرح تباہ و برباد کرتی رہیگی۔ اور ان کی تمام مذہبی و معاشری آزادیاں چھن جائیں گی۔ حالانکہ اگر نگاہ غور سے دیکھا جائے تو ہندو مسلم اتحاد کی صورت اگر کوئی نظر آسکتی ہے تو وہ صرف مخلوط انتخاب ہے۔

اب سے تقریباً ایک ربع صدی قبل جب منٹو مارلے رفارم ہندوستان کو مرحمت نہ ہوا تھا یہاں جداگانہ انتخاب کا خیال تک کسی کے ذہن میں بھی نہ تھا اور اسوقت کی فضا جیسی صلح کوش اور امن پرور تھی کسی سے مخفی نہیں۔ نہ باہم قربانی پر کہیں جھگڑا ہوتا تھا، نہ مسجد، و مندر کے سامنے باجہ و ناقوس پر کوئی نزاع ہوتی تھی، ہر فریق نہایت امن و سکون کے ساتھ زندگی بسر کر رہا تھا، لیکن جب جدید رفارم کے سلسلہ میں مسلمانوں کے وفد کو شملہ بلاکر ان کے کانمیں جداگانہ انتخاب کا افسوں پھونکا گیا، تو دفعتاً صورت حال بدل گئی اور پھر گزشتہ بیس سال کی تاریخ ہند اٹھاکر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ سب سے زیادہ فساد و ہنگامہ اسی زمانہ میں ہوا اور ہندو مسلمانوں کے درمیان باہم اختلاف و عصبیت پیدا ہونے کا دور یہی تھا۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جب اقلیت کے لئے مخصوص و متعین نشستیں طے کر دی گئی ہیں تو مخلوط انتخاب سے کیوں خوف کھایا جاتا ہے، ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے لئے جتنی جگہیں مقرر ہیں وہ انھیں سے پر کی جائیگی اور مخلوط انتخاب انمیں کوئی کمی نہیں کرسکتا۔ اس سلسلہ میں سب سے بڑا فائدہ جو ملک کو پہونچے گا وہ یہ ہے کہ ہر ہندو اور ہر مسلمان باہمدگر تعلقات صلح و آشتی قائم کرنے پر مجبور ہوگا، کیونکہ نہ کوئی ہندو بغیر مسلمانوں کی رائے کے ممبر منتخب ہوسکیگا۔ اور نہ کوئی مسلمان بغیر ہندو آراء کے۔ اسطرح گویا دونوں قومیں ایک دوسرے کے ساتھ مل کر رہنے اور معاشری، مذہبی، تمدنی جذبات کا احترام کرنے پر مجبور ہوں گی اور رفتہ رفتہ وطنیت کی وہ صحیح روح پیدا ہو جائیگی، جس کو اس وقت تک جداگانہ انتخاب کی لعنت نے فنا کر رکھا تھا۔

جداگانہ انتخاب کی سب سے بڑی مضرت جس کو نظر انداز کیا جا رہا ہے یہ ہے کہ جب ہر فریق

کے رائے دہندگان جدا جدا ہونگے تو ہر ممبر اپنی جماعت کے سامنے اسباب تفوق میں سب سے زیادہ جس استحقاق کو نمایاں کریگا وہ فریق ثانی کی مخالفت ہو گی، یعنی ایک مسلمان صرف اس دلیل کی بنا پر کثرت رائے حاصل کریگا کہ وہ مسلمانوں کے حقوق کی پوری حمایت کرے گا اور اسی طرح ایک ہندو صرف اس حجت پر نامزد کیا جائیگا کہ وہ مسلمانوں کو اُبھرنے نہ دیگا۔ اسکا نتیجہ یہ ہوگا کہ دونوں جماعتوں کے صرف وہی افراد نامزد ہونگے جو حد درجہ متعصب اور فرقہ وارانہ جذبات رکھنے والے ہیں اور اس طرح ملک میں رفتہ رفتہ ایسا اختلاف و انشقاق پیدا ہو جائیگا کہ ایک لمحہ بھی امن و سکون کا ملنا دشوار ہو جائے گا۔ برخلاف اسکے مخلوط انتخاب ہمیں مجبور کریگا کہ ایک دوسرے کے جذبات کا خیال رکھیں اور تدریجاً وہ ذہنیت محو ہو جائے جو "ہندو چاء" اور "مسلمان پانی" کے وجود کا باعث ہوئی ہے۔

ایک شبہ مخلوط انتخاب کے مخالفین کا یہ بھی ہے کہ اس صورت میں جو مسلمان نامزد ہونگے وہ ہندوؤں کے کثرت رائے کی وجہ سے وہی ہونگے جو ہندوؤں کا ساتھ دیں۔ اول تو یہ الزام ایسا ہے جو بجائے ہندوؤں کے خود اپنے ہی افراد پر قائم ہوتا ہے اور خود ہمیں اپنے آپ سے اس باب میں شرم کرنا چاہیئے اور دوسرے یہ کہ وہ کون سے ایسے مسائل ہیں جن کے طے کرنے کے لئے ہمکو نہایت سخت کٹر قسم کے مسلمان ممبروں کی ضرورت ہوگی، ظاہر ہے کہ کونسل میں اکثر مسائل وہ ہونگے جن میں ہندو و مسلم مفاد مشترک ہوگا۔ اگر پانچ فی صدی ایسے مسائل پیش بھی ہوئے جنکا تعلق خالص مذہب سے ہے تو کیا کسی مسلمان کی طرف سے یہ اندیشہ پیدا ہو سکتا ہے کہ وہ مذہب کے خلاف کوشش کریگا۔ خواہ وہ ہندوؤں ہی کی کثرت آراء سے کیوں نہ منتخب ہوا ہو۔ پھر اسی کے ساتھ یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ اگر یو۔پی کے مسلمان اپنی اقلیت کی وجہ سے اس امر کا اندیشہ کرتے ہیں تو کیا پنجاب، بنگال، سندھ، اور سرحد کے ہندوؤں کو یہ اندیشہ نہ پیدا ہوگا اور کیا ہندو مسلمان دونوں کے لئے یہ قدرتی تحفظ پہلے سے موجود نہیں ہے۔ اگر یوپی کے ہندو یہاں کے مسلمانوں کے حقوق پامال کرینگے کیا تو انھیں یہ خوف نہ ہوگا کہ اسکی پاداش میں پنجاب وغیرہ کے ہندوؤں کے حقوق اسی طرح تلف کئے جا سکتے ہیں۔

الغرض میری سمجھ میں یہ بات کسی طرح نہیں آتی کہ مخلوط انتخاب سے مسلمانوں کو کیوں خائف ہونا چاہیئے۔ اور جداگانہ انتخاب میں ان کے لئے کیا نفع ہے۔ پھر اسی کے ساتھ جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ یہ اندیشہ مسلمانوں میں کس رکیک و ادنیٰ ذہنیت کے ماتحت پیدا ہوا ہے اور انکے مستقبل کو کس درجہ تاریک اور پُر از خوف بنا دینے والا ہے تو میرے سامنے اسی جماعت کے وہ پُر جوش اقوال و مواعظ سامنے آجاتے ہیں جب وہ اپنی قوم کے دس افراد کو بھی فریق مخالف کے ہزار نفوس پر بھاری ظاہر کرتے تھے۔

کیا دنیا میں کوئی قوت ایسی ہو سکتی ہے جو ۸ کروڑ نفوس کو تباہ و برباد کر دے، کیا یہ ممکن ہے کہ مسلمان ہندوؤں کے دوش بدوش پورے جوش وطنیت کے ساتھ آمادۂ پیکار ہو جائیں۔ اور وہ

سارے ملک پر نہ چھا جائیں، حیرت ہے کہ مسلمانوں کی عزت و خودداری کیا ہوئی، ان کی شجاعت و بسالت کی روایات کیونکر محو ہو گئیں اور وہ کیوں اسقدر بزدل و ذلیل ہو گئے ہیں، کہ اپنی نجات صرف جداگانہ انتخاب کے ذریعہ سے چاہتے ہیں، جسکی بنیاد ہی خوف و تذبذب، کم ہمتی اور جبن پر قائم ہوتی ہے۔

ہمکو معلوم ہے کہ جو جماعت آجکل مسلمانوں میں اس تحریک کو قوی کر رہی ہے وہ نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کی بدخواہ ہو بلکہ حکومت کی طرفدار ہے اور محض اغراض ذاتی و نفسانی کی بنا پر ملک و قوم کو تباہ کرنے کے لئے آمادہ ہو گئی ہے۔

یہ وقت وہ ہے کہ مسلمانوں کو صرف یہ درس دینا چاہیئے کہ

شیر شو شیرانہ، در صحرائے شیریں پائی نہ

تاکہ وہ دوسری بیدار قوموں کے ساتھ زندہ رہنے کے اہلیت پیدا کر سکیں، لیکن ہمارے بعض ناعاقبت اندیش اور خود غرض اکابر یہ درس دے رہے ہیں کہ نجات صرف اسی میں ہو کہ حکومت کے ہات کو قوی بنایا جائے اور حکومت ہی سے طلب امن و نجات کیجائے۔ درآنحالیکہ کانپور کے ہنگامہ نے اس خواب کی تعبیر کو بھی جن الفاظ میں پیش کیا ہے، وہ بہت کچھ درس عبرت اپنے اندر پنہاں رکھتا ہے۔

جداگانہ انتخاب والوں کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ ہندو افراد بہت زیادہ عصبیت سے کام لیتے ہیں۔ اور جن محکموں میں وہ پہونچ جاتے ہیں، وہاں مسلمانوں کے ساتھ برا سلوک ہونے لگتا ہے۔ اس لئے آئندہ مخلوط انتخاب کے سلسلہ میں ان سے کیا توقع قائم کی جا سکتی ہے۔ اول تو اس دلیل کے دونوں اجزار میں باہم کوئی ربط نہیں اگر وہ عصبیت سے کام لیتے ہیں تو مخلوط انتخاب کیوں مضر ثابت ہوگا، بلکہ وہ تو مفید ثابت ہوگا کیونکہ ہندو بھی مسلمان آرا کے محتاج ہوں گے اور مجبوراً ان کو اپنی عصبیت ترک کرنا پڑے گی۔ علاوہ اس کے یوں بھی اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہندو عصبیت اسی وقت سے پیدا ہوئی ہے جب سے منٹو مارلے اسکیم کا نفاذ ہوا ہے اور جداگانہ حق انتخاب پر عملدرآمد ہو رہا ہے۔ اس لئے یہ کہاں کی دانشمندی ہے کہ اختلاف کے اصل سبب کو تو قائم رکھا جائے اور اس کے دور کرنے کی بھی خواہش کیجائے۔

حال ہی میں جو جلسہ نیشنلسٹ مسلم پارٹی کا لکھنؤ میں منعقد ہوا تھا اور جس میں میں بھی شریک تھا، متفقہ طور پر مخلوط انتخاب کو منظور کر لیا گیا ہے اور مسلمانوں کو اسی پر اخیر وقت تک قائم رہنا چاہیئے۔

بعض مخالفین جماعتوں کی طرف سے جو پروپاگنڈا کیا جا رہا ہے وہ سخت غیر دانشمندانہ ہے ور مسلمانوں کو اس میں حصہ لینے، یا اس پر عمل کرنے سے سخت احتراز کرنا چاہیئے۔

جب تک ہندوستان کی آبادی قائم ہے۔ ہندو مسلمانوں کو باہم ملکر یہیں زندگی بسر کرنا ہے

اور وہ مجبور ہیں کہ ایک دوسرے کے ساتھ رواداری اور صلح و آشتی کے ساتھ برادرانہ سلوک کو روا رکھیں۔ اس لئے نہ یہ عارض ہنگامے قابل لحاظ ہیں اور نہ ایسی تحریکیں جو نفاق و اختلاف کی پرورش کرنیوالی ہیں۔ اُن کو بھی آخر کار مٹ کر رہنا ہے اور اِن کو بھی فنا ہو جانا۔ اس لئے آپ آج ہی وہ کام کیوں نہ کریں۔ جیسے کل مجبوراً اختیار کرنا ہے۔

فلسفۂ مذہب مولوی سید مقبول احمد صاحب بی۔اے کی وہ معرکتہ الآرا تصنیف ہے جس نے تمام ملک کو اپنی طرف متوجہ کر لیا ہے۔ معہ محصول (عہ/۱)

(مینجر نگار بک ایجنسی لکھنؤ)

کاجل۔ سُرمہ۔ چورن۔ منجن

(اڈیٹر صاحب نگار نے خود ان دواؤں کا اطمینان کرکے اپنی رائے اُنکے مفید ہونیکی اکتوبر کے ملاحظات میں ظاہر کی ہے)

صرف یہ چار چیزیں میرے پاس ہیں اور اگر آپ اعتبار کریں تو میں کہوں کہ اُن میں سے ہر ایک چیز پورے بیس سال کے تجربہ سے خاندان کی تجربہ میں رہی ہے

کاجل جو آنکھوں کے تمام امراض کیلئے بیحد مفید ہے۔ سلائی لگاتے ہی ٹھنڈی ٹھنڈی سی نیند سی آنے لگتی ہے۔ جنکی آنکھیں آشوب کرتی رہتی رہتی ہیں۔ یا میلی ہو جاتی ہیں۔ یا سُرخی پیدا ہو جاتی ہے یا نزلہ کا پانی آتا رہتا ہے یا ضعف بصارت پیدا ہو چلا ہے انکے لئے ہر روز رات کو ایک سلائی لگا لینا چند دنوں میں تمام شکایتیں دور کر دیتا ہے۔ ایک ڈبیہ جو ایک شخص کیلئے سال بھر کو کافی ہے قیمت عمہ/۔

سُرمہ یہ بیش بہا سُرمہ ۴۰ دن میں تیار ہوتا ہے۔ اسمیں نہ ممیرہ ہے، نہ کوئی جواہر بلکہ معمولی سرمہ ہے جس کو جڑی بوٹیوں کے عرق میں پیسکر طیار کیا جاتا ہے۔ اسکے فوائد کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جالا، دھندل موتیا بند اور ضعف بصارت صرف ایک ماہ کے استعمال سے جاتا رہتا ہے اور بارہا آزمایا ہوا ہے۔ قیمت فی پڑیا (عمہ) علاوہ محصول

چورن یہ وہ اکسیری چیز ہے جسکا ہر گھر میں رہنا ضروری ہے۔ پیٹ کا درد، قبض، نفخ، ریاح کا پیدا ہونا، سوء ہضم دستوں کا آنا سب بیکلخت اسکے استعمال سے جاتا رہتا ہے کیسا ہی شدید درد پیٹ میں ہو فوراً ایک چٹکی کھانے سے جاتا رہتا ہے قیمت فی ڈبیہ ۲ تولہ (عمہ) علاوہ محصول

منجن۔ اسکی ادنےٰ خوبی یہ ہے کہ ہلتے ہوئے دانت جم جاتے ہیں۔ قیمت فی ڈبہ ۲ تولہ (عمہ) علاوہ محصول۔

نوٹ۔ سب چیزیں منگانیوالوں کو محصول ڈاک معاف۔

م۔ بیگم۔ نمبر ۲۴۔ نظیر آباد۔ لکھنؤ،

"ہنگامۂ کانپور"

اسقدر بیداد، اتنا ظلم، ایسا قتل عام
کاش دُنیا اژدہا بن کر چبا لیتی تجھے
ننگ ہے اقدام عالم کے لئے تیرا وجود
جانتا ہے قلعۂ ظلمات کو قصرِ ضیا
آہ، بیجرم و خطا بچوں کی یہ چیخیں نہیں
خاکِ خوں میں یہ نہیں غلطاں شہیدانِ ستم
خونِ انسانی کی یہ موجیں نہیں، اے بد شعار
سُن کہ ہر ذرے سے اُٹھتی ہی صدائے الاماں
عقل کے دشمن، رہینِ جہل، معمورِ جنوں
اُڑ رہی ہیں جامۂ قومی کی پیہم دھجیاں
ہر قدم، وحشت خرامی، کج نگاہی، خودسری
دوسری اقوام چھیڑیں نغمۂ شانِ وطن
اس کمال بزدلی پر خواہشِ فتح مبیں
کسکا شکوہ، دہر میں جب آپ تو پامال ہے

خوابِ آزادی کی یہ تعبیر! اے ہندی غلام
آسماں سے برق گرتی اور جلا دیتی تجھے
موت سے بدتر، تری خوابیدہ ہستی کی نمود!
ستم قاتل پر گمانِ بادۂ نابِ بقا
ترے قدموں پر نہیں مظلوم ماؤں کی جبیں
روئے گردوں پر نہیں یہ تیرہ تر گردِ الم
جن سے تونے دامن گیتی کیا ہے داغدار
ہیں یہ آزادی کی ظالم! حشر پرور سسکیاں
کر رہا ہے اپنے ہاتھوں آپ آزادی کا خون
تو کہاں، نادان! اور پیکارِ آزادی کہاں!
اس قدر گمراہیوں پہ نازشِ منزل رسی
اور تو ہو مجرم خونِ عزیزانِ وطن
بھائیوں کے خون سے رنگیں ہے تیری آستیں
تجھسے کیوں دُنیا کو ہمدردی ہو، گر چال ہے

تو اورِ آزادی کے ایوان گرامی کیلئے
تو بنا ہے حلقۂ دامِ غلامی کیلئے

علی اختر

جھوٹ اور سچ کا مناظرہ

چاہا جو جھوٹ نے کہ کروں سچ کو لاجواب
کہنے لگا کہ آج کہاں ہے مرا جواب

ذرہ سے آفتاب تلک راج ہے مرا
دیکھو جسے جہان میں محتاج ہے مرا

امکاں مری کمندِ رسا میں اسیر ہے
عالم مرے وجود سے رونق پذیر ہے

اس انجمن میں اہلِ سخن کی زبان ہوں
ایمان واعظوں کا حسینوں کی جان ہوں

بازارِ زندگی میں مرا فیضِ عام ہے
کاریگروں کو شام و سحر مجھ سے کام ہے

کس مولوی کے واسطے روزی رساں نہیں
کس نکتہ رس وکیل کا زورِ بیاں نہیں

سلطاں مری مدد سے رعیت فریب ہے
مزدور مجھ سے واقفِ اوج و نشیب ہے

بزمِ حیات میں مرے جلوے ہزار ہیں
میں ایک چیز نام مرے بے شمار ہیں

طرزِ عمل کہیں ہوں کہیں ہوں طریقِ کار
الہام ہوں کہیں کہیں پیغامِ کردگار

دینِ مبیں کہیں، کہیں مذہب ہے میرا نام
مہر و وفا کہیں، کہیں الفت ہے میرا نام

پیرانِ خانقاہ کا ارشاد ہوں کہیں
عطار اور طبیب کا استاد ہوں کہیں

معشوق کی زبان کا پیغام ہوں کبھی
عاشق کی جانِ زار کا آرام ہوں کبھی

کرتا ہوں اک نگاہ سے روباہ کو پلنگ
پاتا ہوں فتح جنگ میں بے تیغ و بے تفنگ

قانون میرے بحر کی موجِ تپاں ہے ایک
تاریخ میرے دشت کی جوئے رواں ہے ایک

میری ہی چاشنی سے فسانے ہیں دلپسند
مجھ سے ہی پُر اثر ہے سخنور کا بند بند

ملتا نہیں نشان مرا کس دیار میں
دنیا کا خشک و تر ہے مرے اختیار میں

تو ہے کہ جانتا ہی نہیں دوستی ہے کیا
غم سے کسی غریب کی جاں پر بنی ہے کیا

افعی ہے تو عتاب ہے شاہیں ہے سر بسر
تیرا لباس خون سے رنگیں ہے سر بسر

شمشیر زن ہے تو کبھی مذہب کے نام پر
خنجر بکف کبھی ہے حلال و حرام پر

انصاف کے لباس میں جنگ آزما کبھی
رحمت تری زبانیں ہے تیغ دو دم کا نام
مجرم کی بے بسی پہ نہیں اشکبار تو
تعزیر سے کسی کو بچایا بھی ہے کبھی
کوئی ستم نصیب ترا مدح خواں نہیں
شر سے قریب لطف و مروت سے دور ہے
تیرے جلو میں آگ ہے آبِ بقا نہیں
تیرے سبب سے طوق و رسن کا رواج ہے

اخلاق کے جنوں میں غضب آشنا کبھی
رکھا ہے تو نے حق کی حمایت ستم کا نام
ناصح تو ہے نہیں ہے مگر غمگسار تو
تو نے کسی کا عیب چھپایا بھی ہے کبھی
تیری زباں پہ دار و رسن ہے اماں نہیں
ہر روز تیرے واسطے یوم النشور ہے
تیرے عمل میں قہر ہے لطف و عطا نہیں
گر تو نہ ہو تو جیل کی کیا احتیاج ہے

ساری زمیں ہے تیری عنایت سے لالہ گوں
دنیا میں تیرے نام پہ بہتا ہے کتنا خوں

یہ بات سن کے سچ نے کہا اے شریر جھوٹ
یہ کیا کہا کہ کوئی مرا قدر داں نہیں
میں روح کائنات ہوں تو ایک مشتِ گل
رہتا نہیں ہے تیری امانت میں ایک تار
اس کو کبھی جہاں میں نہ دیکھا فروغ پہ
کاریگروں نے لی جو مدد تجھ سے ایک بار
عشرت کا بیج دہر میں بوتا ہے اور کون
تیرے سبب سے دامنِ آفاق ہے سیاہ
دنیا میں باعثِ ستم و جور کون ہے
عزت اسی کی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے
تجھ سے تو اضطراب میں ہے پیر زال بھی
جس شعر یا خیال کی تو نے رکھی بنا
دنیا میں مولوی کبھی ہوتا نہ کامگار
کچھ روز کے لئے ہے وہاں تیرا احترام
گر ہے تو میرے بھیس میں اہلِ حشم ہے تو

آتا نہ سر اٹھا کے گردوں حقیر جھوٹ
دوزخ سے کم نہیں وہ زمیں ہے جہاں نہیں
بزدل ترے غلام مرے دوست شیر دل
دنیا میں کس غریب کو ہے تجھ پہ اعتبار
جس کام کی اساس ہے کذب و دروغ پہ
پھر عمر بھر چلا نہ کبھی ان کا کاروبار
تجار کے جہاز ڈبوتا ہے اور کون
پلتا ہے تیری گود میں ہر جرم ہر گناہ
زندانیوں میں تیرے سوا اور کون ہے
کیا اس کا احترام کہ جھوٹا کہیں جسے
بچتا نہیں ہے تجھ سے یتیموں کا مال بھی
فطرت کے ذوق نے اسے اچھا نہیں کہا
کرتا نہ گر تجھے مرے پردہ میں آشکار
جس جا گیا ہے ہنس پڑے تجھے دیکھ میرا نام
کیا اپنے نام سے بھی کہیں محترم ہے تو

کب ہے کسی کے وعدہ پہ عاشق کو اعتماد
تجھ کو نہیں ہے حضرتِ غالب کا قول یاد
یعنی کسی کے وعدہ پہ ہوتا جو اعتبار
فرطِ خوشی سے مرگئے ہوتے وفا شعار
زیرِ فلک ہوا و ہوس میں ہے تو اسیر
پیدا ہوئے ہیں تیرے ہی دم سے تفنگ و تیر
ہوتا ہے جب جہاں میں تیرا فریب عام
مجبور ہو کے تیغ کو کرتا ہوں بے نیام
تیرے ستم سے امنِ جہاں میں خلل ہو جب
ہر سمت شش جہات میں تیرا عمل ہو جب
اُس وقت میں تفنگ سے خنجر سے نار سے
کرتا ہوں ہمکنار جہاں کو بہار سے

اصغر حسین خاں نظیر لودہیانوی

پرانے گراموفون ریکارڈ پھینکو مت

کیونکہ وہ پھر نئے ہو جاتے ہیں

سائنسدانوں نے حال میں ایک حیرتناک شے دریافت کی ہے جسے کیمیائی اصطلاح میں زیڈ کہتے ہیں۔

زیڈ کی ایک شیشی سے کم و بیش چالیس پرانے گھسے ہوئے ریکارڈ درست ہو جاتے ہیں۔ وہی دلکش نغمے جو کانوں کو بہت بھلے لگتے تھے، جو کثرتِ استعمال سے ماند پڑ گئے، اصلی حالت پر عود کر آتے ہیں۔ زیڈ ریکارڈ کی کھڑکھڑاہٹ دور کر دیتا ہے، ایک شیشی کی قیمت صرف (۱۲ / ۱)

ZED

ملنے کا پتہ:۔ حسن برادرز اینڈ سنز، پندرنی، سی، پی، ہندوستان

محبت کی شام!

(۱)

جبرِ دنیا ئے تمنا پر کئے بیٹھا ہوں میں!
حسرتوں کے داغ — پہلو میں لئے بیٹھا ہوں میں!
نامرادی! — خون کے آنسو پئے بیٹھا ہوں میں!
ہائے کیا جانے! وہ اب کیوں یاد آتے ہیں مجھے؟

(۲)

وہ فریبِ غمزہ ہائے حسنِ بے پروا کہاں؟
وہ طلسمِ انتظار و عدۂ فردا — کہاں؟
میری دنیا اب "نیازِ عشق کی دنیا — کہاں؟
ہائے کیا جانے! وہ اب کیوں یاد آتے ہیں مجھے؟

(۳)

اب کہاں؟ وہ محشرِ امید و بیم آرزو!
اب کہاں؟ جذبات کو بیتابیوں کی جستجو!
اب تو میں ہوں، اور گریباں کے لئے شغلِ رفو!
ہائے کیا جانے! وہ اب کیوں یاد آتے ہیں مجھے؟

(۴)

التفاتِ حسنِ ہرجائی کو — مدت ہو چکی!
حسرتوں کی محفل آرائی کو — مدت ہو چکی!
داغِ الفت — تیری رسوائی کو مدت ہو چکی!!
ہائے کیا جانے! وہ اب کیوں یاد آتے ہیں مجھے؟

(۵)

آہ! وہ آغازِ الفت کا زمانہ ــــ اب کہاں؟
اور انجامِ محبت کا فسانہ ــــ اب کہاں؟
وہ "محبت"! وہ "محبت کا بہانہ"!! اب کہاں؟
ہائے کیا جانے! وہ اب کیوں یاد آتے ہیں مجھے؟

(۶)

شعلہ ہائے شمع ہستی میں تپش باقی نہیں!
کائناتِ دل کو ارمانِ خلش ــــ باقی نہیں!
"درد" میں میرے لئے کوئی کشش باقی نہیں!!
ہائے کیا جانے! وہ اب کیوں یاد آتے ہیں مجھے؟

(۷)

منظر بربادیٔ دُنیائے الفت! یاد ہے!
کسطرح سے ہو گیا تھا خونِ حسرت! یاد ہے!!
یاد ہے ــــ وہ "اُنکا انکارِ محبت"! یاد ہے!!!
ہائے کیا جانے! وہ اب کیوں یاد آتے ہیں مجھے؟

(۸)

روح افسردہ ہے ــــ ارمانِ محبت کی طرح!
دل ہے ٹکڑے ٹکڑے، پیمانِ محبت کی طرح!
جی رہا ہوں! اک پشیمانِ محبت کی طرح!
ہائے کیا جانے! وہ اب کیوں یاد آتے ہیں مجھے؟

روش صدیقی

قطعاً تعمیل نہیں ہوسکتی

اگر آپ نے اپنا نمبر خریداری خط و کتابت میں درج نہیں کیا۔ ــــ مینیجر "نگار" لکھنؤ

تیتری

اے حسن کی شانِ اجتماعی
نقاش کی صنعتِ مکمل
یہ نقشِ حسیں پر دل پہ تیرے
بے باک چمن میں گھومتی ہے
یہ بادِ صبا کے نرم جھونکے
ایسے میں ترے پروں کی جنبش
پھرتی ہے چمن کی ہر روش پر
اللہ رے ترا غرور کافر
شفاف بدن۔ لباس زریں
اک پیکرِ حسنِ رنگ و بو ہے
بدمست شمیم ہو نہ جانا

پروردۂ صد بہارِ خوبی
اے پیکرِ جنبشِ مسلسل،
جیسے کوئی حور مسکرا دے
پھولوں کے لبوں کو چومتی ہے
فردوس کے کھل گئے دریچے
ہوتی ہے بجلیوں کی بارش
شبنم سے بدن بچا بچا کر
رکھتی نہیں پاؤں بھی زمیں پر
اُس پر یہ ترا خرام رنگیں
یا با ہمہ آب و تاب تو ہے
دامن میں گلوں کے سو نہ جانا

منظور حسین ماہر انصاری

دردِ زندگی

(۱)

یہ مانا رازِ ہستی فہم انسانی سے باہر ہے
مگر بھولے سے بھی درماں نہ دنیا سے طلب کرنا
تو آخر میرے دردِ زندگی کی ہو دوا کیونکر؟
مجازیؔ، یاد رکھ، ایسی دوا سے درد ہی بہتر!

(۲)

گر تجھ کو میں چاہوں، اے دنیا، تو تیری مری سب جھگڑے ہیں
ہے تیری خمیر سے یہ فطرت، فطرت نے مجھے مجبور کیا
گر تجھ کو میں چھوڑوں، اے دنیا، تو چھوڑ کے تجھکو جاؤں کدھر؟
ہستی ہی نہ ہوتی کاش مری، یا تو ہی نہ ہوتی فتنہ گر!!

مجازی لکھنوی

میکشانِ فطرت

شراب نابِ تجلی کے پینے والے ہیں!
وہ رند ہم ہیں مہ و مہر جنکے پیالے ہیں

ہمارے حلق میں گرتی ہے تاک انجم سے
ہمارے عیش کے سامان ہی نرالے ہیں

خزاں کے نام سے ناآشنا ہے جنکی بہار
ہمارے سامنے شام و سحر کے لالے ہیں

ستارہ صبح کا رقصاں ہے جنکو سُن سُن کر
ربابِ دل ہی کے وہ پُر سرور نالے ہیں

ہمیں زمان و مکاں کی ہے ماہیت معلوم
کہ ہم جہانِ تخیل کے رہنے والے ہیں

خودی کا نام نہ لو، ماسوا کو رہنے دو،
بہ رب کعبہ یہ بُت سب ہمیں نے ڈھالے ہیں

نگاہ اپنی ہے انجامِ خندۂ گُل پہ
آئین چمن کا تبسم ہمیں سنبھالے ہیں

امین حزیں

غزل ضیا مانک پوری

ہر چند خطرۂ ستمِ باغباں نہیں
لیکن یہ جانتا ہوں قفس آشیاں نہیں

سوا اضطراب کے بھی ہیں مجبورِ خامشی
اللہ کیا ہما سے دہن میں زباں نہیں

اِک دورِ کشمکش تھا جو آخر گزر گیا
اب یاد قصۂ قفس و آشیاں نہیں

کیا عشرؔ ہوگا اِس دلِ حسرت نصیب کا　　　تابِ الم نہیں جسے حکمِ فغاں نہیں
قیمت اُنھی کی تھی جو ہوئے برق کو عزیز　　　ہر تنکے سے مراد خسِ آشیاں نہیں
رہتا ہے ایک جلوۂ رنگیں نگاہ میں　　　مجھکو دماغِ سیرِ گل و گلستاں نہیں

اب لطفِ اضطراب میسر کہاں ضیا
گلشن نہیں۔ بہار نہیں۔ آشیاں نہیں

غزل فرخ بنارسی

اُف رے وہ کیف جو پنہاں نگہِ ناز میں ہے،　　　ایک نغمہ ہے کہ خوابیدہ رگِ ساز میں ہے
ساز ہے سوز میں اور سوز نہاں ساز میں ہے،　　　حسن اور عشق میں جو ربط ہے وہ راز میں ہے
جاذبِ ذوقِ سماعت ہے نوائے فطرت　　　رازِ تسکینِ دل اس نغمۂ بے ساز میں ہے
ہے اسیری میں بھی سرگرمِ خلش بادِ چمن　　　ایک رعشہ سا ابھی تک پرِ پرواز میں ہے
ختم ہونے پہ ہیں دنیائے محبت کی حدیں　　　قدمِ شوق ابھی منزلِ آغاز میں ہے
حیرتِ حسن ذرا دید کی فرصت بھی تو دے　　　کیا بتاؤں ابھی کیا جلوہ گہِ ناز میں ہے
جاذبِ روح ہیں یوں تو مے و نغمہ بھی مگر　　　اور ہی کیف نگاہِ غلط انداز میں ہے
نالہ و نغمہ برابر کا اثر رکھتے ہیں　　　فرق نازک سا مگر دونوں کی آواز میں ہے
خرمنِ ہستیِ عشاق سے اٹھتا ہے دھواں　　　اور ابھی برقِ نظر پردۂ صد ناز میں ہے
محرمِ رازِ حقیقت نہیں کوئی ورنہ　　　نغمۂ حسنِ ازل پردۂ ہر ساز میں ہے
حسن کی کچھ تو جھلک اہلِ نظر نے دیکھی　　　جلوۂ عشق ابھی پردہ گہِ راز میں ہے
ذرہ ذرہ کششِ حسن سے ہے سربسجود　　　جلوہ گر کون حسیں انجمنِ ناز میں ہے

عینِ ایماں ہے مری کفر پرستی فرخ
شانِ حق جلوۂ حسنِ بتِ طناز میں ہے

آخری درج شدہ تاریخ پر یہ کتاب مستعار
لی گئی تھی مقررہ مدت سے زیادہ رکھنے کی
صورت میں ایک آنہ یومیہ دیرانہ لیا جائیگا۔

22 MAY 1951